اُونچی اُڑان

www.pakistanipoint.com
WWW.PAKISTANIPOINT.COM
پاکستانی پوائنٹ
اردو ادب کی بہترین ویب سائٹ
ایک رابطہ اپنوں سے

محی الدین نواب

اُونچی اُڑان

محی الدین نواب

علی میاں پبلی کیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ فون: 37247414

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

بار اشاعت —— اول
مطبع —— یو اینڈ می پرنٹرز، لاہور
کمپوزنگ —— عابد گرافکس، لاہور
قیمت —— [redacted] روپے
Price —— 20 / Pond (U.K)

ISBN 978-969-517-302-2

Stokist:(U.K)

Azhar Enterprises

315, Dickenson Road
Longsight, Manchester, M13 0NR
Tel: 0044 (0) 161 224 6331

اسٹاکسٹ
علی بک سٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال، لاہور

داؤ پیچ

زندگی بھی کیا ہے؟
کبھی روگ بن جاتی ہے کبھی راگ بن جاتی ہے۔ کبھی سوگ اور کبھی سہاگ بن جاتی ہے۔

یہ تو پرانی کہاوت ہے کہ میاں بیوی گاڑی کے دو پہیئے ہوتے ہیں۔ ایک گھومتا ہے تو دوسرا اس کے ساتھ ساتھ گھومتا رہتا ہے۔ صرف گھومتے رہنے سے گاڑی نہیں چلتی، محبت کے انجن کی حرارت قائم رکھنے کے لئے باہمی اعتماد کا پیٹرول ڈالنا پڑتا ہے ورنہ یہ گاڑی جھٹکے کھاتے کھاتے رکنے لگتی ہے۔

ان کی گاڑی بھی رک گئی تھی۔ شاید وہ الگ ہو جاتے لیکن اس گاڑی میں ایک جوان بیٹا اور دو جوان بیٹیاں سوار تھیں۔ انہیں ان کی منزل تک پہنچانا تھا۔ لہٰذا یہ اہم فرض ادا کرنے کے لئے وہ زندگی کی مشترکہ گاڑی کو الجھ الجھ کر کھینچ رہے تھے۔

اس کا نام فریدہ بخت تھا۔ فریدہ ذرا پرانا اور مڈل کلاس نام لگتا ہے۔ اس لئے وہ خود کو فری جیسے مختصر اور خوبصورت نام سے متعارف کراتی تھی۔ مقدر نے اسے ناپ تول میں ایک سیر بنایا تھا، وہ سوا سیر بننے کی فکر میں لگی رہتی تھی۔

اس نے اپنی ایف ایکس کار کا دروازہ اس شان سے کھولا جیسے مرسیڈیز سے باہر آ رہی ہو لیکن وہ دروازہ کھلتے ہی سامنے والی دیوار سے ٹکرا گیا۔ گاڑی اس ایک سو اسّی گز کے گھر میں یوں آ کر کھڑی ہوتی تھی جیسے چھوٹے سے منہ میں بڑا نوالہ رکھ دیا گیا ہو۔ وہ ایک ادا سے اُترنے کے زعم میں یہ بھول جاتی تھی کہ وہ چار دیواری چھوٹی ہے، اوقات سے زیادہ پاؤں پھیلائے گی تو ضرور کسی دیوار سے ٹکرائے گی۔

سیانے کہتے ہیں زندگی میں ہر قدم پھونک پھونک کر رکھنا چاہیے۔ وہ دروازہ بند کر کے گاڑی سے باہر نکلی پھر کار اور دیوار کے درمیانی فاصلے سے یوں گزرنے لگی جیسے پھونک پھونک کر قدم رکھ رہی ہو۔

WWW.PAKISTANIPOINT.COM
PAKISTANIPOINT

مین گیٹ کے کھلنے کی اور گاڑی کے انجن کی آواز سکندر بخت کے بیڈ روم تک گئی تھی، اس نے سر اٹھا کر دیوار گیر گھڑی کی طرف دیکھا۔ رات کے دو بجنے والے تھے۔

منزل اور چلمن ماں کے انتظار میں جاگ رہی تھیں۔ ٹی وی کے سامنے بیٹھی ہوئی تھیں۔

وہ لاؤنج کا دروازہ کھول کر اندر آئی۔ منزل نے اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا۔ ''ہائے ممی! کب سے انتظار کر رہی ہوں بڑی دیر لگا دی آپ نے......؟''

وہ اس کے رخسار کو چومتے ہوئے بولی۔ ''میری جان! آج کل شادی جیسی تقریبات میں دو ڈھائی بجنا کوئی بات نہیں ہے۔ وہاں ایسا ناچ گانا ایسا دھوم دھڑکا تھا کہ وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔''

چلمن کی نظریں ٹی وی اسکرین پر جمی ہوئی تھیں، وہ ریموٹ کنٹرولر کے ذریعے چینل بدلتے ہوئے بولی۔ ''یعنی خوشیوں کے ہجوم میں آپ کو گھر یاد نہیں آیا؟''

ماں نے بڑی بیٹی کو چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا پھر پوچھا۔ ''تم بھی جاگ رہی ہو؟''

وہ بہ دستور اسکرین کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ''ہاں...... مووی دیکھ رہی تھی۔ بڑی دلچسپ تھی، ختم ہوگئی۔''

پھر اس نے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ سمجھ رہی ہوں گی۔ میں آپ کے انتظار میں جاگ رہی ہوں؟''

وہ منہ بنا کر بولی۔ ''میں ایسی خوش فہمیوں میں نہیں رہتی۔''

منزل نے باری باری انہیں دیکھا پھر چلمن سے کہا۔ ''کیوں ممی کا موڈ خراب کر رہی ہو؟''

پھر اس نے ماں سے کہا۔ ''جائیں ممی! آپ چینج کریں اور آرام کریں۔''

وہ بڑی بیٹی کو دیکھتی ہوئی وہاں سے جانے لگی۔ منزل نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''ممی کی خوشیاں تمہیں بری کیوں لگتی ہیں؟''

اس نے سر گھما کر اسے دیکھا، پھر پوچھا۔ ''ڈیڈی کی تنہائیاں تمہیں اچھی کیوں لگتی ہیں؟''

''انہیں تنہا رہنے کی عادت ہے، ممی لائف انجوائے کرنا جانتی ہیں۔ تتلی کی طرح اُڑتی پھرتی ہیں۔ وہ اور ڈیڈی اپنے اپنے مزاج کے مطابق زندگی گزار رہے ہیں۔ تم ان کے معاملات میں مداخلت کیوں کرتی ہو؟''

''وہ ہمارے ماں باپ ہیں، ان کے معاملات ہماری زندگیوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔''

''تمہیں ڈیڈ کی تنہائی کا احساس ہوتا ہے تو یہاں ٹی وی دیکھنے کے بجائے ان کے پاس

''بیٹیاں ایک حد تک باپ کے قریب رہتی ہیں، خدمت کرتی ہیں اور وہ میں کرتی رہتی ہوں۔ ڈیڈی اس عمر میں ممی کی توجہ چاہتے ہیں۔''

وہ ایک رسالہ اٹھاتے ہوئے بولی۔ ''ممی بھی ایسا پارٹنر چاہتی ہیں جوان کے ساتھ ہنستا بولتا رہے، وہ میک اَپ کر کے، لباس پہن کر آئینہ دیکھتی ہیں۔ اس لئے کہ ڈیڈ کی آنکھیں انہیں نہیں دیکھتیں، دیکھتی بھی ہیں تو اس پر تنقید کرتی ہیں۔ ڈیڈ اب اتنے بھی بوڑھے نہیں ہوئے ہیں لیکن وقت سے پہلے بڑھاپا اوڑھ کر انہیں بور کرتے رہتے ہیں۔''

فریدہ اپنے کمرے میں نہیں گئی تھی۔ بیٹیوں کی باتیں سننے کے لئے دوسرے کمرے میں رک گئی تھی۔ منزل کی باتیں سن کر سوچنے لگی۔ ''یہ ہے میری بیٹی...... میرے احساسات کو سمجھتی ہے۔ میری محرومیوں کا حساب رکھتی ہے۔ اور ایک یہ چلمن ہے......''

اس نے ناگواری سے سوچا۔ ''ہمیشہ اپنے باپ کی حمایتی بنی رہتی ہے۔ باپ ہی سب کچھ ہے جیسے میں نے پیدا نہیں کیا ہے۔ میں نے دودھ نہیں پلایا ہے۔ اونہہ...... احسان فراموش کہیں کی...''

وہ سر جھٹک کر اپنے کمرے کی طرف آئی۔ دروازہ بند تھا۔ اس نے ہینڈل پر ہلکا سا دباؤ ڈالا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ اندر تاریکی تھی۔

ایسے ہی وقت اس تاریکی میں ننھا سا شعلہ لپکا۔ اس لمحاتی روشنی میں سکندر بخت ایک جھلک دکھا کر چھپ گیا۔ فریدہ نے ناگواری سے دل ہی دل میں کہا۔ ''ان کی عمر کے ساتھ لائٹر بھی بوڑھا ہو گیا ہے۔ بار بار جھٹکے دو تو سلگتا ہے۔''

دوسری بار وہ لائٹر روشن ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی سگریٹ کے ایک سرے سے ایک ننھا سا انگارا دہکنے لگا۔ فریدہ ہاتھ بڑھا کر یکے بعد دیگرے سوئچ آن کرتی گئی۔ اندھیرے میں ڈوبا ہوا کمرا روشنی میں نہا گیا۔ سکندر بخت کی آنکھیں چندھیانے لگیں۔ اس نے آنکھوں کو سکیڑتے ہوئے کہا۔ ''کیا ایک لائٹ سے روشنی نہیں ہو سکتی؟''

وہ اسے دیکھتی ہوئی ڈریسنگ ٹیبل کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ ''مجھے اندھیرا پسند نہیں ہے۔ آپ آنکھوں پر یوں ہاتھ رکھ لیا کرتے ہیں جیسے روشنی سے شرما رہے ہوں۔ میں زندگی کی چکا چوند میں رہنے کی عادی ہوں۔''

وہ آئینے کے سامنے بیٹھ کر اپنا جائزہ لینے لگی۔ عورتوں کی عادت ہوتی ہے، کسی تقریب میں جانے سے پہلے گھنٹوں آئینہ دیکھتی ہیں اور واپس آنے کے بعد خود پر تنقیدی نظر ضرور ڈالتی ہیں۔ یہ اندیشہ رہتا ہے کہ رنگ و روغن کے اتنی دیر بعد اِدھر اُدھر سے پلاسٹر اکھڑ گیا ہو گا۔

وہ سگریٹ کا ایک کش لیتے ہوئے بولا۔ ’’زندگی کی چکا چوند میں تمہاری نظر گھڑی پر نہیں پڑتی؟‘‘

آئینے میں وال کلاک اس کے پیچھے یوں نظر آرہا تھا جیسے کسی فلمی سین میں ہیروئن کے عقب سے چاند طلوع ہوگیا ہو۔ اس نے بے پروائی سے گھڑی کو دیکھا، پھر جیولری اتارنے لگی۔

وہ بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ’’آدھی رات کے بعد دن بدل جاتا ہے، تاریخ بدل جاتی ہے لیکن تمہاری عادتیں نہیں بدلتیں۔‘‘

اس نے ایک جھٹکے سے سر گھما کر اسے دیکھا پھر چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ’’میں بھی یہی کہا کرتی تھی مائی ڈیئر سکندر......! کہ تمہاری عادتیں کیوں نہیں بدلتیں؟ کیوں آدھی رات کو گھر آتے ہو؟‘‘

پھر وہ پلٹ کر آئینے کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ’’اور کبھی تو آتے ہی نہیں تھے۔‘‘

وہ بڑی حسرت سے اپنے عکس کو دیکھ رہی تھی، ایک ہاتھ سے میک اَپ زدہ چہرے کو یوں ٹٹول رہی تھی جیسے اس عارضی حسن کے پیچھے اپنی حقیقی خوبصورتی تلاش کر رہی ہو۔ وہ بڑے کھوئے ہوئے انداز میں بولی۔ ’’وہ جوانی کے دن تھے، جوانی کی راتیں تھیں۔ تم مجھے ایک کھلونے کی طرح اپنی زندگی میں لائے تھے، جب جی کرتا تھا، دل بہلاتے تھے اور جب جی کرتا تھا، اسے گھر میں ایک شوپیس کی طرح سجا کر بھول جاتے تھے۔‘‘

پھر وہ جیسے ہوش میں آگئی۔ سر گھما کر ناگواری سے بولی۔ ’’یاد ہے ناں......؟‘‘

وہ منہ سے دھوئیں کا مرغولہ چھوڑتے ہوئے بولا۔ ’’میں تمہاری طرح فضول تقریبات میں جا کر وقت برباد نہیں کرتا تھا۔ نیا نیا بزنس تھا، نئے معاملات تھے۔ اگر محنت نہ کرتا تو آج مارکیٹ میں ہمارا نام کیسے ہوتا؟ بزنس پر توجہ دینا ضروری تھا مگر تم......‘‘

’’ہاں میں...... میں اہم نہیں تھی۔‘‘ وہ اس کی بات کاٹ کر طنزیہ لہجے میں بولی۔ ’’کون سا تیر مار لیا بزنس میں؟ آج بھی وہی پرانے ماڈل کی ایف ایکس چلا رہی ہوں۔ یہ کہو کاروبار کے بہانے برسوں مجھے نظرانداز کرتے رہے۔ میری ساری جوانی غارت کردی......!‘‘

وہ آئینے کی طرف پلٹتے ہوئے بولی۔ ’’اونہہ...... مصیبت میں خدا یاد آتا ہے بڑھاپے میں بیوی یاد آتی ہے۔ پہلے میں انتظار میں جاگتی تھی۔ اب تم راتوں کو جاگ کر انتظار کرتے ہو۔ افسوس!‘‘

وہ ناگواری سے بولا۔ ’’میں تمہاری ہمدردی حاصل کرنے کے لئے نہیں جاگ رہا ہوں۔ سوچو کہ جوان اولاد ہمارے بارے میں کیا سوچتی ہوگی؟ دونوں بیٹیاں ہماری وجہ سے

پریشان رہتی ہیں۔ شہریز کینیڈا سے آرہا ہے، وہ پریشان ہو کر چلا جائے گا۔ تم سمجھتی کیوں نہیں ہو؟ ہمارے آئے دن کے جھگڑوں سے بچے متاثر ہوتے ہیں۔''

چلمن اور منزل گھر کے اندرونی حصے کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ وہاں سے فریدہ کا کمرا نظر نہیں آرہا تھا لیکن دونوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ باپ کی بات سن کر چلمن نے کہا۔ ''ڈیڈی ٹھیک کہہ رہے ہیں، ممی کو سمجھنا چاہیے۔''

منزل نے تردید کرتے ہوئے کہا۔ ''نہیں۔ ممی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ ڈیڈ کو سمجھنا چاہیے۔''

''تم تو ممی کی اندھی حمایت کرنے لگتی ہو۔''

''اور تم کیا نہیں کرتیں؟ ڈیڈی کے خلاف کوئی سچ بات ہو تو اس سچائی سے بھی انکار کرتی ہو۔''

ادھر بیٹے کا نام سنتے ہی فریدہ کے اندر ممتا کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ وہ برسوں بعد بیٹے کو دیکھنے والی تھی۔ تصور میں قد آور بیٹا مسکراتا ہوا اپنے بازو پھیلائے اس کی طرف چلا آرہا تھا۔ اس نے بڑی ممتا سے سوچا۔ ''کیسا ننھا منا سا تھا؟ گود میں سما جاتا تھا۔ جوان ہونے کے بعد تو چٹان جیسا مضبوط ہو گیا ہوگا۔

سکندر کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''وہ برسوں بعد آکر بھی ہمارے درمیان اختلافات دیکھے گا۔ سوچو کہ وہ ہمارے بارے میں کیا سوچے گا؟''

وہ ایک ہاتھ نچاتے ہوئے بولی۔ ''میرا شہریز نادان نہیں ہے۔ اپنی ممی سے ہونے والی ناانصافیوں کو خوب سمجھتا ہے۔ بیٹیاں بھی سمجھتی ہیں۔''

''لیکن تم نہیں سمجھتیں...... اس گھر کو ایک عورت کی...... ایک ماں کی ضرورت ہے۔''

''ضرورت کا احساس ضرورت پڑنے پر ہی ہوتا ہے۔ اپنے گریبان میں ذرا جھانک کر سوچو سکندر! جب مجھے تمہاری ضرورت تھی تو کیسے ہواؤں میں اُڑتے پھرتے تھے؟ آج تمہیں میری ضرورت ہے تو انگاروں پر لوٹ رہے ہو؟''

وہ ایک جھٹکے سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ''یہ خوش فہمی دل سے نکال دو فریدہ بیگم! مجھے تمہاری ضرورت نہیں ہے تم ہو کیا......؟''

وہ بھی اٹھ کھڑی ہوگئی۔ پاؤں پٹکتے ہوئے بولی۔ ''میری اہمیت یہ ہے کہ میں تمہارے ایک نہیں تین جوان بچوں کی ماں ہوں۔ اور وہ تینوں تمہیں نہیں...... مجھے اہمیت دیتے ہیں۔ مجھے......''

وہ سگریٹ کو فرش پر پھینک کر پاؤں سے رگڑتے ہوئے بولا۔ ''بیوی کے رشتے کو شوہر کے رشتے پر حاوی کرنے کی کوشش نہ کرو۔ یہ اولادیں ہماری ہیں۔ ہم دونوں کو چاہتی ہیں۔

بچوں کو اپنے معاملے سے دور رکھو۔“

دونوں بیٹیوں نے سوچتی ہوئی نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ جیسے نظروں ہی نظروں میں کہہ رہی ہوں۔ ”ممی ڈیڈی! آپ دونوں ہی نہیں سمجھتے۔ ایک گھر میں ایک ہی چھت کے نیچے ماں باپ کے معاملات بچوں سے الگ کیسے ہو سکتے ہیں؟ آپ دونوں اس ایک گھر میں ندی کے دو کنارے بن گئے۔ کیا بیڈ روم الگ کر لینے سے مسائل حل ہو گئے ہیں نہیں، بڑی بیٹی ماں کی قربت سے اور چھوٹی باپ کی قربت سے دور ہو گئی ہے۔ آپ کی دوریوں نے ہم سب کے درمیان دوریاں پیدا کر دی ہیں۔“

باپ کی آواز سنائی دی۔ وہ ٹہلتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”تمہارا پرابلم یہ ہے کہ تم نے کبھی مجھے سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔“

وہ اونہہ کہنے کے انداز میں منہ پھیر کر آئینہ دیکھنے لگی۔ وینیشنگ کریم کے ذریعے میک اپ واش کرنے لگی۔ وہ اسے دیکھ رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ ”تم مجھے گھنا درخت سمجھتیں تو ٹھنڈی چھاؤں ملتی رہتی۔ جو بیوی اپنے شوہر کو ببول کا پیڑ سمجھتی ہو، اسے ضرور کانٹے چبھتے رہتے ہیں۔“

چلمن نے باپ کی بات سنتے ہی تن کر کہا۔ ”واہ...... کیا بات کہی ہے؟ ڈیڈ ہمیشہ دل میں اُتر جانے والی بات کہتے ہیں۔“

منزل نے رسالہ پٹختے ہوئے ناگواری سے اسے دیکھا پھر کہا۔ ”دل میں اُتر جانے والی نہیں۔ دل اُتر جانے والی بات کرتے ہیں۔ وہ میرے بھی ڈیڈی ہیں لیکن میں کسی کی اندھی حمایت نہیں کرتی۔“

چلمن اٹھ کر جانے لگی پھر دروازے سے پلٹ کر بولی۔ ”سچے اور کھرے لوگوں کو حمایت کی بیساکھی کی ضرورت نہیں ہوتی۔“

وہ پلٹ کر چلی گئی۔ منزل نے ناگواری سے دروازے کی طرف دیکھا۔ پھر وال کلاک کی طرف دیکھتے ہوئے زیر لب کہا۔ ”یہ ڈیڈ کب اپنے کمرے میں جائیں گے؟ پہلے بیٹی نے ممی کے موڈ کا ستیاناس کیا، اب ڈیڈ کر رہے ہیں۔“

فریدہ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے کریم کو چہرے پر پھیلا رہی تھی۔ میک اَپ کی تہیں اُترنے لگی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا، جیسے تصویر کا دوسرا رخ سامنے آ رہا ہو۔ وہ ناک چڑھا کر بولی۔ ”اونہہ...... گھنا درخت......؟ تمہارا سایہ ہی تو ہے، جس نے مجھے جلا ڈالا ہے۔“

”میرے سائے نے نہیں، تمہاری کم عقلی نے جلایا ہے۔ میں نے جو بھی کیا ہے، اس گھر کے لئے، تمہارے لئے اور ان بچوں کے لئے کیا ہے۔ کاش تم میری محنت کو، میری محبت کو سمجھ

سکتیں تو یہ گھر جنت بن جاتا۔"

"بحث میں تم سے کوئی نہیں جیت سکتا۔ ایسی لچھے دار باتیں بنا کر اپنا اصلی چہرہ چھپا لیتے ہو۔"

اس نے ایک نظر اس پر ڈالی ۔ وینشینگ کریم پیاری سی مورت کی صورت بگاڑ رہی تھی۔ وہ بولا۔ "اصلی چہرہ تو تم چھپاتی ہو۔ ابھی ذرا دیر پہلے کیا رنگ روپ تھا؟ بڑی فریش لگ رہی تھیں۔ ذرا آئینہ دیکھو......! تمہیں چمکانے والی پالش اُتر رہی ہے۔"

وہ بولتا ہوا کمرے سے چلا گیا۔ فریدہ نے دروازے کی طرف دیکھا پھر جھک کر آئینے میں اپنی صورت کو دیکھا تو ایک ذرا ٹھٹک گئی۔ بجھا ہوا چہرہ کہہ رہا تھا، وہ دن ہوا ہوئے جب چہرہ گلاب تھا...... وہ خود کو انگلیوں سے چھو کر سوچنے لگی۔ "یہ وقت چیونٹی کی رفتار سے بہت دھیرے دھیرے گزرتا ہے اور یہ گزر گیا ہے تو یوں لگ رہا ہے، جیسے جوانی ابھی آئی تھی، ابھی ہوا ہو گئی۔"

بہار کب آئی اور کب چلی گئی؟ وہ خشک پتے کی طرح بھٹکنے کے انداز میں اُڑتی ہوئی واش روم میں آ گئی۔ نلکے کو کھول کر، واش بیسن پر جھک کر منہ دھونے لگی۔ پھول کا رنگ اُڑ جائے، خوشبو اُڑ جائے تو پانی کے چھینٹے مارنے سے بھی تازگی نہیں آتی۔

اے زندگی! تُو بہت کچھ دیتی ہے، مگر جب چھینتی ہے تو لگتا ہے جیسے کبھی کچھ دیا ہی نہ ہو......

☆======☆======☆

رقبہ کم ہو تو دو بیڈ روم، ایک لاؤنج اور ڈرائنگ روم کے بعد اتنی گنجائش نہیں تھی کہ وہاں مزید کوئی کمرا بنایا جاتا۔ سکندر بخت فریدہ سے فاصلہ رکھنا چاہتا تھا شاید وہ بھی یہی چاہتی تھی۔ اس لئے اوپری منزل پر مزید کمرے بنوائے گئے تھے۔

والدین کے درمیان فاصلے بڑھتے ہیں تو بچے بھی ایک دوسرے سے کھنچنے لگتے ہیں۔ وہ ایک کمرے میں ساتھ ساتھ سونے والی بیٹیاں بھی الگ الگ کمروں میں رہنے لگی تھیں۔

چلمن باپ سے متاثر تھی، لہٰذا اوپر چلی گئی۔ منزل اپنی ماں کے ساتھ نچلی منزل میں رہنے لگی۔ سکندر ہاتھ منہ پونچھتا ہوا واش روم سے باہر آیا۔ اسے کمرے میں دیکھ کر بولا۔ "تم ابھی تک سوئیں نہیں......؟"

وہ گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔ "ڈیڈ! مسئلہ سونے سلانے کا نہیں...... جگانے کا ہے۔ ممی کب جاگیں گی؟ جوان بیٹیاں پہاڑ ہوتی ہیں۔ ایسے پہاڑوں کے بوجھ سے بھی ان

کی نیند نہیں ٹوٹ رہی ہے۔''

''شاید قصور میرا ہی ہے۔ میری مصروفیات نے اسے بور کر دیا ہے۔''

وہ اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ ''نہیں ڈیڈ! آپ نے جو کیا ہے ہمارے بہتر مستقبل کے لئے کیا ہے۔''

''کاش یہ بات تمہاری ماں سمجھ سکتی۔''

''کچھ لوگ دوسروں کے معقول دلائل کو نظر انداز کر کے فخر محسوس کرتے ہیں۔ ممی انہی میں سے ہیں۔ پلیز ڈیڈ! آپ ان سے بحث نہ کیا کریں۔ وہ سمجھانے سے نہیں سمجھیں گی۔''

''میں نے اسے لائف انجوائے کرنے سے کبھی نہیں روکا۔ وہ میری مصروفیات کے دوران بھی تفریح کیا کرتی تھی۔ خواہ مخواہ مجھے الزام دیتی ہے۔ اسے یہ خوش فہمی ہے کہ مجھے اس کی ضرورت ہے۔''

''آپ کو ایک دوسرے کی نہیں...... ہم بچوں کو آپ دونوں کی ضرورت ہے۔''

اس نے سوچتی ہوئی نظروں سے بیٹی کو دیکھا وہ بولی۔ ''میں آپ کی طرف اور منزل ممی کی طرف...... بے چارہ شہریز آپ دونوں کے درمیان لڑھکتا رہتا ہے۔''

وہ کچھ کہنا چاہتا تھا، ایسے ہی وقت موبائل فون کا بزر بولنے لگا۔ اس نے اسے آن کر کے کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''ہیلو؟''

دوسری طرف سے شہریز کی چہکتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''ہیلو ڈیڈ شہریز ہیئر ......''

وہ بے یقینی سے بولا۔ ''بڑی لمبی عمر ہے تمہاری...... ابھی ابھی تمہارا ذکر ہو رہا تھا۔''

چلمن نے خوش ہو کر باپ کی طرف دیکھا پھر قریب ہو کر فون کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔ ''ڈیڈ یہ کہنے سے کترا رہے ہیں کہ شیطان کا نام لیا اور وہ حاضر ہو گیا۔''

شہریز تک اس کی آواز پہنچ گئی تھی۔ وہ بولا۔ ''ڈیڈ! آپ کی طرف سے میاؤں کی آواز آ رہی ہے۔''

وہ بیٹی کو دیکھ کر ہنستے ہوئے بولا۔ ''ہاں۔ یہ شیر کی خالہ میرے قریب بیٹھی ہوئی ہے تم بتاؤ ہمارے قریب کب آ رہے ہو؟ سیٹ کنفرم ہوئی یا نہیں؟''

''یہی انفارم کرنے کے لیے فون کیا ہے کل شام پی کے ٹو زیرو ون سے آ رہا ہوں۔ ڈنر ایک ساتھ کریں گے۔''

''یہ تو بڑی زبردست خبر ہے۔''

اس نے بیٹی سے کہا۔ ''وہ کل آ رہا ہے، رات کا کھانا ہمارے ساتھ ہی کھائے گا۔''

پھراس نے فون پر کہا۔ ''بیٹے !تم نظر تو نہیں آرہے ہو لیکن عید کا چاند دکھا رہے ہو۔''

''اصل عید تو میری ہوگی۔ اتنے عرصے بعد اپنوں کے درمیان بیٹھوں گا، بولوں گا۔ یہاں روٹین لائف گزارتے گزارتے بور ہو گیا ہوں۔''

''مجھے خوشی ہے کہ میرا رائٹ ہینڈ آرہا ہے لیکن میں اس خوشی میں تمہاری ممی کو نہیں بھول سکتا۔''

چلمن نے سوالیہ نظروں سے باپ کو دیکھا۔ وہ فون پر بولا۔ ''پہلے خوشخبری اپنی ممی کو سناؤ ورنہ وہ مائنڈ کریں گی کہ تم نے اس معاملے میں مجھے ترجیح دی ہے۔''

چلمن نے بڑی محبت سے اپنے ڈیڈ کو دیکھا۔ دوسری طرف سے شہریز نے کہا۔ ''میں ابھی بات کرتا ہوں۔ ان سے یہی کہوں گا کہ پہلے انہیں یہ خوشخبری سنا رہا ہوں۔''

وہ فون کو چومتے ہوئے بولا۔ ''آئی لو یو مائی چائلڈ......!''

''آئی لو یو ٹو ڈیڈ......! او کے بائے......''

رابطہ ختم ہو گیا۔ اس نے فون کو آف کر کے ایک طرف رکھا، چلمن بڑی محبت سے اپنے ڈیڈ کو دیکھ رہی تھی۔

دوسری طرف فریدہ واش روم سے باہر آئی تو منزل نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''اوہ ممی! کیا بتاؤں اس بلیک نائٹی میں تو آپ......آپ مادھوری ڈکشٹ لگ رہی ہیں۔''

اس نے بڑے پیار سے بیٹی کو گھورا۔ پھر دیکھنے کے لئے کہ بیٹی کس حد تک سچ بول رہی ہے، وہ آئینے کے رُو برو آ گئی۔ وہ پشت کی طرف سے آکر لپٹتے ہوئے بولی۔ ''ارے یہ آئینہ کیا بتائے گا اِدھر دیکھیں......''

اس نے پلٹ کر دیکھا، وہ ایک خوبصورت سا البم اس کی نظروں کے سامنے لہراتے ہوئے بولی۔ ''آپ نے فوٹو سیشن کرایا تھا۔ رزلٹ آ گیا ہے۔ اوہ ممی! کیا زبردست تصویریں ہیں؟''

وہ بے چین ہو کر بولی۔ ''تصویریں آ گئیں؟ لاؤ دکھاؤ مجھے......''

اس نے ہاتھ بڑھایا۔ وہ پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔ ''پہلے ایک وعدہ کریں۔''

''کیسا وعدہ......؟''

''میری فرینڈز گیٹ ٹو گیدر پارٹی کر رہی ہیں۔ مجھے بھی انوائٹ کیا ہے۔ آپ منع تو نہیں کریں گی؟''

''کیسی بات کر رہی ہو؟ میں تو خود تمہیں پارٹیز اٹینڈ کرنے کے مشورے دیتی رہتی ہوں۔ لوگوں سے میل جول بڑھتا ہے، نئے تعلقات بنتے ہیں۔''

وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ ”وہ...... بات یہ ہے کہ مجھے اس روز کار کی چابی چاہیے۔“
اس سے پہلے کہ ماں کچھ کہتی۔ وہ فوراً ہی آگے بڑھ کر اس سے لپٹ گئی، اس کے چہرے کو جگہ جگہ سے چومتے ہوئے بولی۔ ”پلیز ممی! میں بہت احتیاط سے ڈرائیو کروں گی۔ آپ کے ساتھ ہوتی ہوں تو ذرا شوخی دکھاتی ہوں۔ پرومس بائی گاڈ...... اس دن تنہا ہوں گی تو ایسا کچھ نہیں کروں گی۔“
وہ مسکرا رہی تھی، اس کے رخسار کو چومتے ہوئے بولی۔ ”مجھے یقین ہے اب بتاؤ، پارٹی کب ہے؟“
”ابھی پروگرام بن رہا ہے۔ میں آپ کو بتادوں گی۔“
”اچھا لاؤ...... اب تو البم دکھادو۔“
وہ اسے ساتھ لیتی ہوئی بیڈ پر آگئی۔ پھر البم کھول کر تصویریں دکھانے لگی۔ ایسے ہی وقت فون کی گھنٹی سنائی دی۔ منزل نے چونک کر ٹیلی فون کی طرف دیکھا، دل سینے میں دھماکے کرنے لگا۔ وہ ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھانا چاہتی تھی، فریدہ نے کہا۔ ”ٹھہرو...... میں سنتی ہوں۔ اتنی رات گئے یہ کون ہے؟“
اس نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا۔ منزل نے بے چینی سے اسے دیکھا۔ وہ دوسری طرف کی آواز سنتے ہی خوشی سے چہک کر بولی۔ ”او میری جان! آج صبح سے ہچکیاں آ رہی تھیں، میں سمجھ گئی تھی، کہ تم یاد کر رہے ہو۔ سارا دن اچھا گیا۔ اب سونے سے پہلے تمہاری آواز سن رہی ہوں۔ اچھے خواب آئیں گے۔“
منزل نے ایک ذرا مطمئن ہو کر ماں کو دیکھا، پھر آگے بڑھ کر فون کا وائڈ اسپیکر آن کر دیا۔ شہریز کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”ممی! خواب کیا دیکھیں گی؟ میں ایسی خوشخبری سناؤں گا کہ نیند اُڑ جائے گی۔“
منزل نے چہک کر کہا۔ ”کیا کسی میم سے شادی کر لی ہے؟“
ماں نے اسے گھور کر دیکھا پھر بیٹے سے پوچھا۔ ”کیا سیٹ کنفرم ہوگئی ہے؟“
”یس ممی! کل شام میں آپ کی بانہوں میں آ جاؤں گا۔“
وہ خوش ہو کر بولی۔ ”اب تو واقعی خوشی کے مارے نیند نہیں آئے گی۔“
اچانک ہی اس کا موڈ بدل گیا، اس نے ماتھے پر بل ڈالتے ہوئے پوچھا۔ ”سچ بتاؤ...... پہلے یہ خوشخبری کسے سنائی ہے؟“
اس کی آواز ابھری۔ ”آپ کو ممی...... ! آپ ہی نے تو سمجھایا ہے، پہلے ماں کے حقوق،

پھر باپ کے...... بھلا میں یہ سبق کیسے بھول سکتا ہوں؟''

وہ خوشی سے لہرا کر بولی۔ ''او ڈیئر آئی لو یو۔''

منزل نے منہ بنا کر فون پر کہا۔ ''اس وقت یہ صرف میری ممی ہوتی ہیں، آپ ہم ماں بیٹی کو ڈسٹرب کر رہے ہیں۔''

ماں نے بڑی محبت سے بیٹی کو دیکھا۔ جب بچے اس سے لگاوٹ کا اظہار کرتے تھے تو اسے لگتا تھا جیسے وہ سکندر بخت سے سبقت لے جا رہی ہو۔ ازدواجی زندگی کی کھینچا تانی میں فتح یاب ہو رہی ہو۔ فون پر بیٹے کی آواز سنائی دی۔ ''تم چپ رہو بلی...... ممی! آپ کی اجازت ہو تو ڈیڈ کو بھی یہ خوشخبری سنا دوں؟''

وہ ناک چڑھا کر بولی۔ ''ہاں...... سنا ہی دو۔ آخر کو تمہارے باپ ہیں۔''

''او کے ممی! بائے......''

رابطہ ختم ہو گیا۔ وہ ٹیلی فون سیٹ کو بڑی محبت سے سہلاتے ہوئے بولی۔ ''بائے میری جان!''

منزل نے اسے متوجہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اپنے لاڈلے کی محبت میں اس لاڈلی کو بھول رہی ہیں۔''

وہ اس کے گال کو تھپکتے ہوئے بولی۔ ''ماں اپنے کسی بچے سے غافل نہیں رہتی۔ وہ کینیڈا میں ہے تم یہاں میرے پاس ہو اور چلمن......''

اس کے ماتھے پر ناگواری کی شکنیں ابھرنے لگیں۔ اس نے ایک ذرا توقف سے کہا۔ ''اسے تمہارے باپ نے میرے خلاف کیا ہوا ہے۔ ویسے وہ بھی میرے دل میں رہتی ہے۔''

پھر وہ البم اٹھا کر سائڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولی۔ ''چلو...... اب لیٹ جاؤ اور سونے کی کوشش کرو۔ کل رات کا کھانا چلمن نہیں، میں بناؤں گی۔ شہریز کی پسند کی ڈشیں تیار کروں گی۔''

اس نے لائٹس آف کر دیں۔ بستر پر آ کر لیٹ گئی۔ منزل اس سے لپٹ کر سوتے ہوئے بولی۔ ''او کے ممی! گڈ نائٹ......''

☆======☆======☆

دوسری صبح چلمن اور منزل کچن میں سے ناشتے کا سامان لا کر میز پر رکھ رہی تھیں۔ سکندر بخت نے وہاں آ کر کرسی پر بیٹھتے ہوئے فریدہ کی خالی کرسی کو دیکھا پھر اپنے انداز میں طنزیہ مسکرانے لگا۔ منزل نے باپ کی مسکراہٹ کو سمجھتے ہوئے کہا۔ ''ممی کچھ لیٹ ہو گئی ہیں۔ میں

ابھی جا کر جگاتی ہوں۔''

''بیٹا! تمہاری ممی میرے ساتھ اب ڈائننگ ٹیبل پر بھی بیٹھنا نہیں چاہتیں۔ ایسا پچھلے کئی دنوں سے ہو رہا ہے۔ اقتدار اور کھانے کی کرسی کو کوئی نہیں چھوڑتا، تعجب ہے کہ تمہاری ماں چھوڑ چکی ہے۔''

منزل نے کہا۔ ''ڈیڈ! آپ ممی کو کوئی نہ کوئی طعنہ دینے کا بہانہ ڈھونڈتے ہی رہتے ہیں۔''

چلمن نے بہن سے کہا۔ ''تم اس حقیقت سے انکار کیوں کر رہی ہو کہ ممی نے ہمارے ساتھ بیٹھ کر کھانا چھوڑ دیا ہے؟'' ہمیشہ کی طرح ان کی نوک جھوک شروع ہوگئی۔ موبائل فون کے بزر نے سکندر بخت کو متوجہ کیا۔ اس نے بٹن دبا کر اسے کان سے لگاتے ہوئے کہا۔

''ہیلو!''

دوسری طرف سے منیجر کی آواز سنائی دی۔ ''سر! آپ نے صبح سات بجے سائٹ پر پہنچنے کو کہا تھا۔ یہاں پارٹی آ چکی ہے۔ آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔''

اس نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اوہ گاڈ! واقعی مجھے دیر ہو چکی ہے۔ میں بس ابھی آ رہا ہوں۔ گھر سے نکل رہا ہوں۔''

منزل وہاں سے اپنی ماں کے پاس جانے لگی۔ وہ فون بند کرتے ہوئے چلمن سے بولا۔ ''بیٹی! تم سب ناشتا کرو۔ مجھے فوراً ہی سائٹ پر پہنچنا ہے۔ میں باہر ناشتا کرلوں گا۔''

یہ کہہ کر وہ تیزی سے چلتا ہوا ڈرائنگ روم میں آیا۔ فریدہ اپنے کمرے سے نکل کر منزل سے بات کر رہی تھی۔ اس سے کہہ رہی تھی۔ ''تم چلو۔ میں چائے پینے آ رہی ہوں۔'' پھر وہ سکندر کو دیکھ کر چپ ہوگئی۔ وہ وہاں سے گزر کر باہر جا رہا تھا۔ منزل نے پوچھا۔ ''ڈیڈ! آپ نے ناشتا نہیں کیا، کہیں جا رہے ہیں؟''

وہ فریدہ کو دیکھ کر کچھ کہنا چاہتا تھا، اس سے پہلے ہی وہ بولی۔ ''میں ناشتے کی میز پر آ رہی ہوں۔ جب آندھی آتی ہے تو تنکے نہیں رہتے، اُڑ جاتے ہیں۔''

وہ بولا۔ ''اس گھر میں میرے دو تنکے ہیں، تیسرا تنکا شام کی فلائٹ سے آنے والا ہے، میں اسے سمیٹنے جا رہا ہوں۔''

وہ طنزیہ انداز میں بولی۔ ''بیٹا شام کو آئے گا۔ کیا ابھی سے جا کر رن وے پر بیٹھ جائیں گے؟ آپ اسے اپنی طرف کھینچنے کی کتنی بھی کوشش کرلیں وہ آتے ہی سب سے پہلے میرے گلے لگے گا اور میرے ساتھ کار میں بیٹھ کر یہاں آئے گا۔''

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''اسے یہاں پہنچنے تو دو۔ میں ایسا سرپرائز دوں گا کہ تم حیرانی اور

پریشانی سے منہ تکتی رہ جاؤ گی۔'' وہ ایسے فخر سے پلٹ کر جانے لگا جیسے بیٹے کو اس سے چھین کر لے جا رہا ہو۔ وہ اسے جاتے ہوئے دیکھنے لگی۔ پھر فکر میں مبتلا ہوگئی کہ وہ ایسا کیا سرپرائز دے گا کہ بیٹا باپ کی طرف ہو جائے گا؟

اس کے ذہن میں یہ بات نقش رہتی تھی کہ گھر میں اپنی برتری قائم رکھنے کے لیے بیٹے کا حمایتی ہونا ضروری ہے۔ اسی طرح وہ گھر کی چار دیواری میں اپنی برتری قائم رکھ سکے گی۔ سکندر بخت اپنی باتوں اور اپنے طرزِ عمل سے یہ سمجھانے کی کوشش کرتا رہتا تھا کہ عورت اپنے شوہر کی ہم مزاج رہ کر ہم خیال بن کر ہی اسے اور اس کے بچوں کو جیت سکتی ہے۔ ہم خیال اور ہم مزاج رہنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ شوہر کے زیر اثر رہے اور اس کی ہر بات مانتی رہے۔

وہ یہ ماننے کے لئے تیار نہیں تھی کہ شوہر حضرات آسمان سے اُتر کر آتے ہیں اور ان سے کوئی غلطی نہیں ہوتی۔ بے شک، غلطیاں بھی ہوتی ہیں لیکن وہ روزانہ کوئی نہ کوئی غلطی نکالنے کی عادی تھی۔ کسی نہ کسی بات پر روکتی ٹوکتی رہتی تھی۔ یہ تاثر دیتی رہتی تھی کہ وہ شوہر سے زیادہ سمجھدار ہے، اچھی زندگی گزارنے کے طریقے عورتیں زیادہ بہتر جانتی ہیں۔ مرد تو بس کمانا اور عیش کرنا جانتے ہیں۔

منزل نے کہا۔ ''ممی! چلیں۔ ناشتا کریں۔ ڈیڈی کی تو عادت ہے کسی نہ کسی ٹینشن میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ پھر آپ ہم سے بھی کھچی کھچی رہتی ہیں، وہ کوئی سرپرائز نہیں دیں گے۔ بس آپ چلیں۔ ناشتا کریں۔''

وہ ناشتے کی میز پر آ کر بولی۔ ''میں دوپہر تک کچن میں ہی مصروف رہوں گی۔ بیٹے کے لیے ایسی ایسی ڈشیں بناؤں گی کہ وہ انگلیاں چاٹتا رہ جائے گا۔''

منزل نے کہا۔ ''ممی! بھائی جان کو نہاری روٹی بہت پسند ہے۔''

چلمن نے کہا۔ ''اور وہ حلیم بھی شوق سے کھاتا ہے۔ وہاں کینیڈا میں ایسے کھانے کہاں نصیب ہوتے ہوں گے؟ اس کو ایسی ڈشیں ملیں گی تو خوش ہو جائے گا۔''

فریدہ نے چلمن کو دیکھ کر سوچا۔ ''یہ درست کہہ رہی ہے لیکن حلیم اور نہاری کا گوشت گلانے میں بڑا وقت لگ جاتا ہے۔ شام سے پہلے مجھے کھانا بھی تیار کرنا ہے اور خود اپنی تیاری کے لیے پارلر بھی جانا ہے۔''

بیٹا آ رہا تھا، کوئی محبوب یا شوہر نہیں آ رہا تھا کہ اس کے لیے پارلر جانا ضروری ہوتا، مگر وہ اپنی فطرت سے مجبور تھی۔ ذہن میں ایسی بات تھی کہ ایئر پورٹ پر کتنے ہی جان پہچان والوں سے سامنا ہو سکتا ہے۔ جانے، اَن جانے لوگ اسے اچھے خاصے میک اَپ میں، بہترین لباس

اور جیولری میں دیکھتے رہتے تھے۔ اگر وہ پارلر نہیں جائے گی تو چہرے پر چھائی ہوئی خزاں پر بہار نہیں لا سکے گی۔ اپنی شخصیت سے متاثر کرنے کے لیے بن سنور کر رہنا پڑتا ہے۔

اس نے شہر کے بہترین پکوان والے کو حلیم اور نہاری کا آرڈر دیا۔ بیٹے کے لیے خود کھانا تیار کرنے والی تھی لیکن خود کو تیار کرنے میں شام تک مصروف رہی۔ آدمی کو ایک حد تک بن سنور کر خوش پوش رہنا چاہیے۔ یہ سچ ہے قریب آ کر یا دور دور رہ کر لوگوں کو پہلے اپنی ظاہری شخصیت سے ہی متاثر کیا جاتا ہے لیکن کھاتے پیتے گھرانے کی خواتین اپنی شخصیت کو چمکانے کے لیے کچھ زیادہ ہی اوور ہو جاتی ہیں۔ ان کے ہی دم قدم سے پارلرز کا کاروبار چمکتا رہتا ہے۔

وہ شام کو بیٹیوں کے ساتھ ایئر پورٹ پہنچی۔ بیٹیوں نے بھی اچھا خاصا شوخ لباس پہن رکھا تھا۔ چہرے پر ہلکا سا میک اَپ بھی تھا لیکن فریدہ نے بڑا ہی چیختا ہوا میک اَپ کرایا تھا۔ بیوٹی پارلر کی میڈم نے اسے یقین دلایا تھا کہ وہ اپنی بیٹیوں کی بڑی بہن لگ رہی ہے۔ فلائٹ اپنے وقت پر آنے والی تھی۔ فریدہ کی نظریں سکندر کو تلاش کر رہی تھیں۔ وہ اس بھڑکیلے لباس اور میک اَپ کو دیکھ کر جل جاتا تھا۔ یہ کہا جائے تو درست ہوگا کہ وہ اسے جلانے کے لیے اس کے سامنے ماڈل گرل بن کر رہا کرتی تھی۔

اس وقت تو دل میں یہی تجسس تھا کہ بیٹا، یہاں آتے ہی پہلے ماں کی طرف لپکے گا یا باپ کی طرف جائے گا؟

وہ پہلے کسی کے بھی گلے لگتا تو کوئی فرق نہ پڑتا بیٹا تو دونوں کا ہی تھا لیکن اسے اَنا کا مسئلہ بنا لیا گیا تھا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ وہ ماں کو زیادہ اہمیت دیتا ہے یا باپ کو......؟

پھر سکندر بخت نے صبح ہی یہ چیلنج کیا تھا کہ وہ ایئر پورٹ پہنچ کر بہت بڑا سرپرائز دینے والا ہے۔ یعنی وہ ایسا سرپرائز ہوگا کہ بیٹا باپ کی طرف کھنچا چلا جائے گا۔

اس نے دور تک نظریں دوڑاتے ہوئے بیٹیوں سے کہا۔ ''تمہارے ڈیڈی ابھی تک نہیں آئے؟''

چلمن نے کہا۔ ''آپ دو گھنٹے پہلے چلی آئی ہیں۔ ڈیڈ وقت کے پابند ہیں۔ اپنے وقت پر ہی آئیں گے۔''

وہ ناگواری سے بولی۔ ''میں تم سے زیادہ جانتی ہوں۔ وہ کتنے پابند ہیں؟ اتنی لمبی زندگی بے لگام رہ کر گزار دی۔ اب بھی عقل نہیں آئی۔ کاروبار خسارے میں جا رہا ہے۔ میرا بیٹا وہاں رہ کر کمائی نہ کرتا تو صرف تین وقت کی روٹی ہی ملتی۔ یہ رکھ رکھاؤ اور یہ شان و شوکت دھری کی دھری رہ جاتی۔''

تھوڑی دیر کے بعد سکندر بخت دکھائی دیا۔ وہ بڑی شان سے سینہ تان کر گردن اکڑا کر چلا آرہا تھا۔ فریدہ نے دوسری طرف منہ پھیرلیا۔ وہ قریب آکر بیٹیوں سے بولا۔ ''میں ابھی بیٹے کو ایسا زبردست سرپرائز دینے والا ہوں۔ جس کے متعلق تم میں سے کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔''

فریدہ نے بے اختیار پلٹ کر دیکھا کیا وہ بیٹے کے لئے گفٹ لایا ہے؟

اس کے دونوں ہاتھ خالی تھے۔ منزل نے پوچھا۔ ''ڈیڈ! کچھ تو بتائیں، وہ سرپرائز کیا ہے؟ کہاں ہے؟''

''میرے ساتھ باہر چلو پھر دکھاؤں گا۔''

وہ پلٹ کر جانے لگا۔ دونوں بیٹیاں اس کے ساتھ جانے لگیں۔ فریدہ اس کے پیچھے کبھی نہ جاتی، لیکن دل میں تجسس پیدا ہو رہا تھا۔ وہ بھی دیکھنا چاہتی تھی کہ بیٹے کو اپنی طرف کھینچنے کے لیے باپ آخر کر کیا رہا ہے؟

وہ سب ایئرپورٹ کی عمارت سے باہر آئے اور ایک چمکتی دمکتی کار کے پاس آکر رک گئے۔ اس وقت اناؤنس منٹ ہو رہی تھی کہ جس فلائٹ کے وہ منتظر تھے۔ وہ وہاں پہنچ چکی ہے۔

چلمن نے پوچھا۔ ''ڈیڈ! آپ کیا دکھانا چاہتے ہیں؟''

اس نے پوچھا۔ ''یہ کار کیسی ہے؟''

منزل نے کہا۔ ''یہ......؟ بہت خوبصورت ہے، بہت قیمتی ہے۔ مگر ہم یہ کار نہیں، آپ کا سرپرائز گفٹ دیکھنا چاہتے ہیں۔''

''اس کار کی قیمت ہے بائیس لاکھ روپے......اور یہ اس کار کی چابی ہے۔''

اس نے اپنی چٹکی میں چابی کو ہلا کر دکھایا۔ وہ سب دم بخود رہ گئیں۔ اس نے کن انکھیوں سے فریدہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں نہیں چاہتا تھا کہ بیٹا کینیڈا سے واپس آکر کسی پرانی کھٹارا گاڑی میں بیٹھے۔ یہاں اسے میرا بزنس سنبھالنے اور اپنا اسٹیٹس قائم رکھنے کے لیے ایسی گاڑی کی بہت ضرورت تھی۔''

فریدہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ بیٹے کو اتنا مہنگا تحفہ دے گا۔ وہ تو ہمیشہ یہی کہتا رہا تھا کہ بزنس خسارے میں جا رہا ہے۔ خسارہ اٹھانے والا باپ اتنا نادان تو نہیں ہے کہ بیٹے کو اتنا مہنگا تحفہ دے گا؟

دونوں بیٹیاں اس سے چابی لے کر کار کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی تھیں اور خوشی سے وہاں کی ہر چیز کو دیکھ رہی تھیں۔ فریدہ ان سے دور کھڑی ہوئی تھی۔ اپنی پرانے ماڈل کی ایف ایکس کار کو دیکھ کر بالکل ہی بجھ گئی تھی۔ سکندر نے اس کی کار کے پاس ہی اپنی کار لا کر کھڑی کی

تھی۔ وہ یہ بتا رہا تھا کہ وہ مہنگی چمکتی دمکتی کار کی طرح تر و تازہ اور جوان ہے اور وہ اپنی کار کی طرح بوڑھی اور پرانی ہو چکی ہے۔

سکندر بخت نے مسکرا کر کہا۔ ''تم بیٹے کی ہر چیز کو بڑے جتن سے رکھتی ہو۔ یہ کار بھی اسی کی ہے۔ کیا بیٹے کے ساتھ اس میں بیٹھ کر گھر نہیں جاؤ گی؟''

وہ ایک قدم پیچھے ہٹ کر بولی۔ ''تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ بیٹا میرے ساتھ میری کار میں بیٹھ کر نہیں جائے گا؟ اونہہ! بیٹے کو بڑے مہنگے داموں خرید رہے ہو۔ میں دعوے سے کہتی ہوں کہ نئی کار تو کیا بیٹے کے لیے نئی ماں بھی خرید کر لے آؤ تو وہ اپنی ماں کی طرف ہی کھنچا چلا آئے گا۔''

وہ موبائل فون نکال کر نمبر پنچ کرتے ہوئے بولا۔ ''شہریز جہاز سے اُتر چکا ہوگا۔ لگیج ہال میں ہوگا۔ اب اس سے رابطہ ہو سکتا ہے۔''

اس نے فون کو کان سے لگایا پھر چند لمحوں کے بعد ہی مسکرا کر بولا۔ ''ہائے شہریز! ہم یہاں تمہارے منتظر ہیں۔ میں تمہارے لیے ایک زبردست تحفہ لے کر آیا ہوں۔ تم سامنے آتے ہی پہلے مجھ سے گلے ملو گے۔''

شہریز نے کہا۔ ''اوہ ڈیڈ! آپ میرے لئے مسئلہ پیدا کریں گے۔ ادھر ممی بھی مجھ سے پہلے گلے ملنا چاہیں گی۔''

''میں کچھ سننا نہیں چاہتا۔ تم ایک عرصے بعد آرہے ہو۔ فار یور انفارمیشن۔ میں تمہارے لیے بائیس لاکھ روپے کی کار خرید کر لایا ہوں۔ ابھی تم اسی میں بیٹھ کر جاؤ گے۔''

وہ خوش ہو کر بولا۔ ''اوہ ڈیڈ! یو آر گریٹ۔ میں کینیڈا سے یہی سوچتا آرہا ہوں کہ یہاں ہمارے پاس کوئی نئی کار نہیں ہے۔ میں بہت سبکی محسوس کروں گا لیکن آپ نے تو یہاں پہنچنے سے پہلے ہی میرا مسئلہ حل کر دیا۔ تھینک یو ڈیڈ!''

''کتنی دیر میں آرہے ہو؟''

''بس کسٹم چیکنگ سے گزر رہا ہوں۔ پھر باہر آتا ہوں۔''

''او کے۔ ہم انتظار کر رہے ہیں۔''

سکندر نے فون بند کر دیا۔ فریدہ اسے گھور کر دیکھ رہی تھی۔ اپنا موبائل نکال کر نمبر پنچ کرنے لگی۔ پھر اسے کان سے لگا کر رابطہ قائم ہونے کا انتظار کرنے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد بیٹے کی آواز سنائی دی۔ ''ہیلو مام! میں نے آپ کے نمبر پڑھے ہیں۔ جانتا ہوں کہ آپ مجھے گلے لگانے آئی ہیں۔ بس تھوڑی ہی دیر میں آنے والا ہوں۔''

وہ فون کو کان سے لگائے سکندر سے دور جاتے ہوئے بولی۔ ''ایک بات یاد رکھو۔

یہاں آتے ہی پہلے میرے گلے لگو گے۔ مجھے پیار کرو گے۔''

وہ پریشان ہو کر بولا۔''اوہ مام! میں تو ہمیشہ آپ سے ہی زیادہ محبت کرتا ہوں۔ یہ تو آپ بھی اچھی طرح جانتی ہیں لیکن ابھی میں پرابلم میں پڑ جاؤں گا۔''

''کیا نئی کار کے لالچ میں آ گئے ہو۔ ماں کو گلے لگانے سے کترا رہے ہو؟''

'' یہ بات نہیں ہے میں آپ کی خاطر دنیا کی تمام دولت ٹھکرا سکتا ہوں۔ وہ کار کیا چیز ہے؟ لیکن آپ دونوں ایک چھوٹی سی بات کو اپنی اپنی انا کا مسئلہ بنا لیتے ہیں۔''

''آگے کچھ نہ بولو۔ میں اور کچھ سننا نہیں چاہوں گی۔ جو کہہ رہی ہوں وہی کرو گے۔''

''آپ یہ چاہتی ہیں کہ آپ کا بیٹا نئی کار قبول نہ کرے اور اسے استعمال نہ کرے؟''

''میں دشمن نہیں ہوں۔ تمہاری خوشیاں چاہتی ہوں۔ وہ کار ضرور حاصل کرو اور اسی میں بیٹھ کر اپنے باپ کے ساتھ گھر جاؤ۔ میں برا نہیں مانوں گی لیکن یہاں آتے ہی پہلے میرے گلے لگو گے۔ یہ ایک ماں کا مطالبہ ہے۔ اسے پورا کرنا ہے۔ دیٹس آل......''

یہ کہہ کر اس نے جواب سنے بغیر فون بند کر دیا، شہریز نے اپنے فون کو دیکھا۔ پھر پریشانی سے زیر لب بڑبڑایا۔''یہ مام اور ڈیڈ اپنے بڑھاپے کی طرف نہیں، اپنے بچپن کی طرف جا رہے ہیں۔ کسی نہ کسی بات پر بچوں کی طرح ضد کرتے رہتے ہیں اور اولاد کے لئے مسئلہ بنتے جاتے ہیں۔''

وہ کسٹم چیکنگ سے گزر کر دوبارہ سامان پیک کر کے وہاں کھڑا رہا۔ سوچتا رہا کہ دونوں طرف نہ ماں کی ممتا نہ باپ کی شفقت ہے۔ صرف ضد ہی ضد ہے۔ اپنی اپنی انا کا مسئلہ ہے۔

تمام مسافر اپنا اپنا سامان ٹرالی میں رکھ کر باہر جا رہے تھے۔ باہر وزیٹرز لابی میں چلمن اور منزل اپنے والدین کے ساتھ آ گئی تھیں اور یہ دیکھنے کے لیے بے چین تھیں کہ بھائی پہلے کس کی طرف جائے گا؟ ماں کی طرف یا باپ کی طرف......؟

یہ تجسس سب ہی کے دلوں میں تھا۔ اُدھر جاتا ہے دیکھو یا اِدھر پروانہ آتا ہے......؟

وہ سب سے آخر میں دکھائی دیا۔ ایک ٹرالی میں سامان لدا ہوا تھا اور وہ اسے آہستہ آہستہ دھکیلتا ہوا ان کی طرف آ رہا تھا۔ اس نے انہیں دور ہی سے دیکھ کر ایک ہاتھ لہرایا۔ دور سے نظریں دھوکا کھاتی ہیں۔ باپ نے سمجھا کہ بیٹا مجھے دیکھ کر وِش کر رہا ہے۔

ماں نے فخر سے سوچا کہ بیٹا ہاتھ کے اشارے سے کہہ رہا ہے۔''ممی! میں پہلے آپ سے ہی گلے ملنے آ رہا ہوں۔''

بیٹا کسی بازی گر کی طرح ایک تنی ہوئی رسی پر چل رہا تھا۔ اسے رسی کے آخری سرے

تک خیریت سے پہنچنا تھا لیکن اس منزل سے پہلے ہی ایک طرف ماں تھی اور دوسری طرف باپ......

اسے آگے نہیں جانا تھا کسی ایک طرف گرنا تھا۔ مسئلہ یہی تھا کہ وہ کس کی طرف گرے؟

وہ ابھی ان سے کچھ فاصلے پر ہی تھا۔ ماں، باپ میں سے کسی کے قریب چل کر جانا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے اچانک ہی لڑکھڑا کر اوندھے منہ گر پڑا۔ جب سامان کی ٹرالی کے سہارے چل رہا تھا تو پھر گرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مگر کیا کیا جائے۔ ان پیدا کرنے والوں نے ہی اسے گرنے پر مجبور کیا تھا۔

دونوں کے دل دھک سے رہ گئے۔ آخر وہ ماں تھی...... آخر وہ باپ تھا۔ وہ دونوں ہی تیزی سے دوڑتے ہوئے اس کے پاس آئے ایک طرف ماں نے دوسری طرف باپ نے اسے سنبھالا۔ وہ آہستہ آہستہ ان کا سہارا لیتا ہوا اٹھ کر کھڑا ہوا۔ وہ بیٹے کو اپنی اپنی طرف بلانے کی ضد کر رہے تھے۔ بیٹے نے ان دونوں کو اپنی طرف بلا لیا تھا۔ اس نے مسکرا کر انہیں دیکھا۔ پھر اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر گلے سے لگا لیا۔

چلمن اور منزل بھائی کو دیکھ کر مسکرا رہی تھیں۔ ماں اور باپ دونوں بہ یک وقت اسے چوم رہے تھے۔ ندی کے دو کنارے کبھی ایک دوسرے سے نہیں ملتے مگر وہ انہیں ملا رہا تھا۔ ان کی بھرپور محبتیں حاصل کرنے کے بعد بہنوں کے پاس آیا پھر ان کی پیشانیوں کو چوم کر دھیمی سرگوشی میں بولا۔ ''کیسی رہی......؟

منزل نے بھی سرگوشی میں کہا۔ ''بھائی جان! آپ کا بھی جواب نہیں ہے۔''

چلمن نے کہا۔ ''تم نے بڑی دانائی کا ثبوت دیا ہے۔ اپنی اپنی طرف بلانے والے ماں باپ کو اپنی طرف آنے پر مجبور کر دیا۔ وی لو یو شہریز!''

سب ایئرپورٹ کی عمارت سے باہر آئے۔ سکندر نے اسے نئی کار کی چابی دی۔ اس نے ماں کی طرف دیکھا۔ وہ شانے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ''میرے بیٹے کو نئی کار مبارک ہو۔ تم اس میں بیٹھ کر جاؤ گے۔ میں اپنی کار میں تمہارے پیچھے آ رہی ہوں۔''

منزل نے کہا۔ ''ممی! میں بھی اس کار میں بیٹھ کر جاؤں؟''

ہاں بیٹی! ضرور جاؤ۔ نئی کار کی خوشی ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ میں تم سب کی خوشیاں دیکھنا چاہتی ہوں۔''

چلمن وہاں سے پلٹ کر پرانی کار کی طرف جا رہی تھی۔ فریدہ نے اس کے پیچھے آتے ہوئے پوچھا۔ ''تم یہاں کیوں آ رہی ہو؟ کیا نئی کار میں نہیں جاؤ گی؟''

''میں آپ کے ساتھ جاؤں گی۔''

''تم تو باپ کی حمایتی ہو؟ خواہ مخواہ مجھ سے ہمدردی کرنے آرہی ہو۔''

اس نے ماں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔''میں کسی کی حمایتی نہیں ہوں۔ ڈیڈ کی طرف داری اس لیے کرتی ہوں کہ وہ تنہا نہ رہ جائیں۔ ابھی آپ کے پاس بھی اس لیے آئی ہوں کہ آپ کو بھی تنہا نہیں دیکھ سکتی۔ آپ کو میری ضرورت ہو یا نہ ہو۔ مجھے آپ کی ضرورت ہے۔''

یہ کہتے ہوئے وہ اگلی سیٹ کا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔ فریدہ نے سوچتی ہوئی نظروں سے بیٹی کو دیکھا پھر دوسری طرف سے گھوم کر اسٹیئرنگ سیٹ پر آ گئی۔ کار کو اسٹارٹ کرنے لگی۔ وہ نئی کار آگے جا رہی تھی۔ وہ اس کے پیچھے چلنے لگی۔ ان حالات میں بھی عورت یہ نہیں سوچتی کہ جتنا بھی زور لگا لے...... جتنی تیزی سے بھی آگے بڑھنا چاہے...... بالآخر مرد سے پیچھے رہ جاتی ہے۔

☆======☆======☆

گھر میں سب خوش تھے۔ ماں باپ کی وجہ سے گھر میں جو کشیدگی پیدا ہوتی رہتی تھی وہ عارضی طور پر ختم ہو گئی تھی۔ فریدہ اور سکندر ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا گوارا نہیں کرتے تھے۔ بیٹے نے آ کر شیر اور بکری کو ایک ہی گھاٹ پر کھلایا پلایا تھا۔ بہنیں بھی خوش تھیں۔ بھائی نے انہیں قیمتی تحفے لا کر دیئے تھے۔

کھانے کے بعد سکندر بیٹے کے ساتھ اس کے بیڈروم میں آیا پھر بولا۔''تم آ گئے ہو۔ ابھی دو چار روز تفریح کرو۔ پھر کاروبار سنبھالو اور مجھے ریٹائر کرو۔ اب میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔''

اس نے پوچھا۔''آپ نے ممی کو بتایا ہے کہ میں آپ کو کتنی رقم بھیجتا رہتا ہوں۔''

''نہیں۔ اگر تمہاری ماں کو یہ معلوم ہو جائے کہ تم پچھلے چھ برس سے ہر ماہ پچاس ہزار روپے بھیجا کرتے تھے تو وہ بیٹے کی آدھی کمائی مجھ سے چھین لینے کے لیے لڑتی رہتی۔''

''مجھے معلوم ہونا چاہیے کہ آپ ممی کو کس طرح ہینڈل کرتے رہتے ہیں؟''

''میں نے انہیں بتایا کہ وہاں کینیڈا میں تمہارے اخراجات بہت زیادہ ہیں۔ اس لیے تم صرف پندرہ ہزار روپے ماہانہ بھیجتے ہو۔''

وہ ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔''یہ اچھی بات ہے کہ تمہاری ماں کو میرے کاروبار سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں یہی ظاہر کرتا رہتا ہوں کہ بزنس خسارے میں جا رہا ہے۔ برائے نام آمدنی ہو رہی ہے۔ جس سے گھر کے اخراجات پورے ہوتے رہتے ہیں۔''

شہریز نے مسکرا کر کہا۔''جب کہ منافع کی شرح بہت بڑھ گئی ہے۔ پچھلے برس آپ نے

دو کروڑ کی نئی مشینیں خریدی ہیں۔ آج میرے لیے بائیس لاکھ کی کار بھی خرید لی۔ آپ اتنی آمدنی ممی سے کیسے چھپا لیتے ہیں؟''

''سیدھی سی بات ہے، وہ میری ذات میں کوئی دلچسپی نہیں لیتی ہے تو میرے معاملات میں کیا دلچسپی لے گی؟ یہی میرے حق میں بہتر ہے۔ بیٹے ایک بات گرہ میں باندھ لو...... بیوی کو کبھی اپنی اصل کمائی نہیں بتانی چاہیے۔ ہمیشہ یہی تاثر دینا چاہیے کہ پریشان ہو، کاروبار ٹھیک نہیں ہے۔ اس طرح بیویاں مشکل حالات میں بھی گزارہ کرنے لگتی ہیں۔ تمہاری ممی کو نمائش کی بہت عادت ہے۔ اس لیے میں نے پرانے ماڈل کی ایف ایکس کار دلائی ہے۔ ایک موبائل فون ان کے پاس رہتا ہے۔ وہ ان چیزوں سے بہل جاتی ہیں اور خوش رہتی ہیں۔''

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔'' آپ ممی کو دھوکا دیتے رہتے ہیں۔''

''کیا یہ دھوکا تمہارے لیے فائدہ مند نہیں ہے؟ یہ کاروبار اب تم ہی سنبھالو گے۔ سب کچھ تمہارے نام ہوگا۔ ایک اہم بات سن لو اب سے برسوں پہلے ڈیفنس میں تمہاری ممی کے نام سے صرف پانچ لاکھ میں زمین خریدی تھی۔ آج اس کی قیمت کروڑ تک پہنچ گئی ہے۔''

''اوہ گاڈ! اس کا مطلب ہے ممی کروڑ پتی بن گئی ہیں۔''

''اگر ہم اپنا بزنس وہاں اسٹیبلش کریں تو منافع کی شرح بھی بڑھے گی اور اسٹیٹس بھی بڑھے گا۔ کاروبار کو آگے بڑھانے کے لئے بینک سے قرضہ بھی آسانی سے مل سکے گا۔''

''یہ تو زبردست آئیڈیا ہے۔''

''اس پلاننگ پر عمل کرنے کے لیے اپنی ماں کو راضی کرو کہ وہ زمین میرے نام کر دیں۔''

''یہ تو آپ ناممکن کو ممکن بنانے والی بات کر رہے ہیں۔ آپ زمین کی بات کرتے ہیں ممی اپنا ایک ناخن بھی کاٹ کر نہیں دیں گی۔''

''تم کوشش تو کرو۔ میں چاہتا ہوں۔ وہ زمین تمہاری ممی کے نام نہ رہے۔ میرے نام نہ ہو تو تمہارے نام ہو جائے۔''

''میں سمجھ گیا آپ کا یہ اصول ہے کہ کسی بھی معاملے میں عورت پر بھروسا نہ کیا جائے۔''

''بے شک، ہم باپ بیٹے کے درمیان جو کاروباری کھچڑی پکتی رہتی ہے اس کی مہک تمہاری ممی تک نہ پہنچے۔ جو گھر کی عورتوں سے کاروباری راز چھپا کر نہیں رکھتے وہ بہت پچھتاتے ہیں۔ ابھی تمہاری ممی کو معلوم ہو جائے کہ ہم لکھ پتی سے کروڑ پتی بن گئے ہیں اور عروج حاصل کر رہے ہیں تو وہ فوراً ہی پچیس تیس لاکھ کی کار خریدنے کی ضد کریں گی اور مجھ

سے لڑنا جھگڑنا شروع کر دیں گی۔''

''یہ تو ہے۔''

''اسی لیے سمجھتا ہوں کہ عورت کو اس کی محدود عقل کے مطابق محدود رکھنا چاہیے۔ وہ خوش رہے گی۔ یہاں تمہیں صرف کاروبار ہی نہیں سنبھالنا ہے شادی بھی کرنی ہے۔ میں اب اس گھر میں جلد سے جلد بہو لانا چاہتا ہوں۔''

''میں آپ کی کسی بات سے بھی انکار نہیں کرتا، لیکن شادی کے معاملے میں ابھی جلدی نہ کریں۔ میں ایک آئیڈیل کی تلاش میں ہوں۔''

''میری کوشش ہوگی کہ میں جو بہو پسند کروں وہ تمہاری آئیڈیل ثابت ہو۔''

وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔''اب تمہیں سونا چاہیے۔ میرا یہ نسخہ اچھی طرح یاد رکھنا۔ کبھی بھول سے بھی اپنی ماں کو کاروباری راز نہ بتانا۔''

''آپ ممی کی بات کر رہے ہیں، میری شادی ہو جائے گی تو میں اپنی گھر والی کو بھی کاروباری راز نہیں بتاؤں گا۔ آپ کے نقشِ قدم پر چلوں گا۔''

''شاباش۔ آخر میرے بیٹے ہو، میرے ہی نقشِ قدم پر چلو گے۔''

وہ مسکراتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ شہریز نے دروازے کو اندر سے بند کیا۔ پھر پلٹ کر میز پر رکھی ہوئی اٹیچی کو دیکھا۔ آہستہ آہستہ آگے بڑھتا ہوا اس کے پاس آیا۔ پھر اسے کھول کر اس میں سے ایک چھوٹی سی ڈبیا نکالی۔

اس مخملی ڈبیا میں ہیرے کی ایک نازک سی انگوٹھی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرانے لگا۔ ایک گنگناتی ہوئی سریلی سی آواز اس کے کانوں میں گونجنے لگی۔ نگاہوں کے سامنے ریشمی پردے لہرانے لگے۔ ایک نہیں کتنے ہی پردے مختلف زاویوں سے لہرا رہے تھے۔ ان کے پیچھے ایک لہراتی ہوئی، بل کھاتی ہوئی حسینہ کبھی جھلک دکھا رہی تھی، کبھی چھپا رہی تھی۔ اگرچہ وہ سر سے پاؤں تک نظر آ رہی تھی لیکن چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ریشمی پردے اسے چھپا رہے تھے۔

ایسے لمحات میں زندگی بہت خوبصورت ہو جاتی ہے۔ زندگی اے زندگی! تُو ادھوری مسرتیں دیتی ہے۔ اس کے پائل چھنکاتے ہوئے پاؤں دکھاتی ہے، چہرہ نہیں دکھاتی۔

ہائے! زندگی ایسے مقام پر لے آئی ہے، جہاں محبت آنکھ مچولی کھیل رہی ہے۔ نہ جانے یہ کھیل کب تک جاری رہے گا؟

اس حسینہ کے ہاتھ نے ریشمی پردے کو تھام لیا۔ ایسے وقت اس کی ہتھیلی کی پشت پر ایک سیاہ تل دکھائی دیا۔ شہریز کو یاد آیا۔ ایک بڑے سے چرچ کے سامنے ایک بوڑھا شخص بیٹھا رہتا

تھا۔ وہ چند سکے لے کر لوگوں کے ہاتھ دیکھتا تھا اور مستقبل کے بارے میں پیش گوئی کرتا تھا۔

اس نے شہریز کے ہاتھ کو دیکھ کر کہا تھا۔ ''محبت کی یہ لکیر کہہ رہی ہے، تم کسی کو بہت ٹوٹ کر چاہو گے۔ میں صرف ان لکیروں کے مطابق نہیں بولتا، پیش گوئی بھی کرتا ہوں۔ میری پیش گوئی ہمیشہ درست ہوا کرتی ہے۔''

شہریز نے پوچھا۔ ''وہ لڑکی میری زندگی میں کب آئے گی؟''

''میں صحیح وقت تو نہیں بتا سکتا لیکن وہ ضرور آئے گی۔ اس کی بائیں ہتھیلی کی پشت پر ایک سیاہ تل ہوگا۔ وہ لڑکی تمہاری بہترین لائف پارٹنر ثابت ہوگی۔''

اس نجومی کی یہ پیش گوئی شہریز کے اندر گونجتی رہتی تھی اور وہ حسینہ جو اس کے خوابوں اور خیالوں میں آتی رہتی تھی، اپنا چہرہ نہیں دکھاتی تھی۔ آنکھ مچولی کھیلتی رہتی تھی۔ وہ اپنی بائیں ہتھیلی کی پشت ضرور دکھاتی تھی اور اس پشت پر ایک سیاہ تل نظر آتا تھا۔

اس وقت وہ خیال نگر میں پہنچا ہوا تھا۔ اس حسینہ کو دیکھ رہا تھا۔ وہ ریشمی پردے کو بائیں ہاتھ سے تھامے کھڑی تھی۔ ہتھیلی کی پشت پر وہی سیاہ تل دکھائی دے رہا تھا۔ وہ سحر زدہ سا ہو کر اس پر جھک گیا۔ اس ننھے سے تل کو چومنے لگا۔ وہ کچھ دیر تک جذب کے عالم میں رہا پھر چونک گیا۔ نہ اس کا ہاتھ تھا نہ وہ تل تھا۔ وہ ہیرے کی انگوٹھی کو چوم رہا تھا۔

☆======☆======☆

فریدہ آئینے کے سامنے بیٹھی خود کو دیکھ رہی تھی۔ بیٹا اس کے لئے ایک قیمتی نیکلس لے کر آیا تھا۔ اس نیکلس کے لاکٹ میں ایک ہیرا جڑا ہوا تھا۔ وہ اسے پہن کر دیکھ رہی تھی اور بڑے فخر سے مسکرا رہی تھی۔ بیٹا اپنے باپ اور بہنوں کے لیے بھی تحفے لایا تھا لیکن سب سے زیادہ قیمتی تحفہ ماں کے لیے تھا۔

یہ سوچ کر وہ خوش ہو رہی تھی کہ بیٹا باپ سے زیادہ ماں کو چاہتا ہے۔ کینیڈا میں برسوں رہ کر محنت مزدوری کرتا رہا۔ گھر کے ماہانہ اخراجات کے لیے رقم بھیجتا رہا اور اپنے پاس جو رقم بچاتا رہا، اس سے ماں کے لیے یہ قیمتی تحفہ لے آیا۔

اس نے سکندر کے بارے میں ناگواری سے سوچا۔ ''یہ حضرت برسوں سے کاروبار کر رہے ہیں اور ہمیشہ نقصان ہی اٹھاتے آ رہے ہیں۔ بیٹے کو مجبور کر دیا کہ باہر جا کر ایم بی اے کا کورس بھی کرے اور محنت مزدوری بھی کرے۔ ایک پہلو سے یہ بہتر ہوا، اس نے وہاں رہ کر تجارت کے سلسلے میں اچھے خاصے تجربات حاصل کر لیے ہیں۔ ابھی میرے بچے کی عمر ہی کیا ہے۔ اس پر اچھا خاصا بوجھ پڑ رہا ہے۔''

وہ گھوم پھر کر مخالفانہ انداز میں سکندر کے متعلق سوچنے لگتی تھی۔ یہ بات اچانک ہی دماغ میں آئی کہ جب کاروبار بالکل مندا ہے اور منافع نہیں ہو رہا ہے تو اس نے آج اچانک بائیس لاکھ روپے کی کار کہاں سے خرید لی؟

''ہوں......'' اس نے گہری سنجیدگی سے سوچا۔ ''یہ سکندر ہمیشہ سے جھوٹ بولتا اور مجھے دھوکا دیتا آرہا ہے۔ میں کاروباری معاملات کو سمجھ نہیں پاتی، وہ مجھ سے اصل آمدنی چھپاتا رہا ہے۔''

دروازے پر دستک سنائی دی۔ اس نے سر گھما کر اس طرف دیکھا پھر کہا۔ ''کم اِن......''

شہریز دروازہ کھول کر اندر آیا پھر ماں کے گلے میں نیکلس کو دیکھ کر بولا۔ ''کیسا ہے ممی......!''

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر مسکراتے ہوئے بولی۔ ''ونڈر فل۔ یہ تو بہت قیمتی معلوم ہوتا ہے۔ تحفہ دینے والے سے اس کی قیمت نہیں پوچھی جاتی۔ پھر بھی پوچھ رہی ہوں۔ تم نے ماں کے لیے کتنے خرچ کر دیئے؟''

''کچھ زیادہ نہیں ممی! پاکستانی کرنسی کے مطابق صرف ایک لاکھ دس ہزار کا ہے۔''

وہ اندر سے خوش ہوئی اور اوپر سے گھورتے ہوئے بولی۔ ''اوہ گاڈ! تم نے جو کمایا وہ ماں پر لٹا دیا۔''

وہ قریب آ کر بولا۔ ''آپ تو جانتی ہیں، میں آپ سے زیادہ کسی کو نہیں چاہتا اور زیادہ کماتا تو وہ بھی آپ پر لٹا دیتا۔''

اس نے دونوں ہاتھوں سے بیٹے کے چہرے کو تھام کر اپنی طرف جھکایا پھر پیشانی کو چوم کر کہا۔ ''ہائے میری جان! تمہارے منہ سے میرے دودھ کی مہک آرہی ہے۔ بولو۔ میں تمہارے لیے کیا کر سکتی ہوں؟''

''میں آپ سے ایک راز کی بات کہنے آیا ہوں۔ یہ بات ڈیڈ کے کانوں تک تو نہیں پہنچے گی ناں؟''

''کیسی بات کرتے ہو بیٹا! تم سے بڑھ کر میرے لیے دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ تمہارے ڈیڈ بھی نہیں ہیں۔ تمہارا کوئی راز ہے تو وہ ماں کے سینے میں دفن رہے گا۔''

وہ ماں کا ہاتھ پکڑ کر بیڈ کے سرے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''ڈیڈ چاہتے ہیں کہ میں ان کا تمام کاروبار سنبھالوں، لیکن وہ ڈوبتا ہوا کاروبار میرے حوالے کر رہے ہیں۔ اگر میں اسے ڈوبنے سے بچا لوں گا تو پھر اس کاروبار پر میرا حق ہو گا ناں......؟''

’’ہاں بیٹے! اس کاروبار کے سیاہ سفید کا مالک صرف تمہیں ہی ہونا چاہیے۔‘‘

’’اگر میں ڈیڈ سے کہوں گا کہ وہ سب کچھ میرے نام کر دیں تو وہ کبھی ایسا نہیں کریں گے لیکن میں آپ کے تعاون سے ایسا کھیل کھیلوں گا کہ ان کا سب کچھ میرے نام ہو جائے گا۔ یعنی آپ کے بیٹے کے نام......‘‘

’’تم مجھ سے کیا تعاون چاہتے ہو؟ میری جان مانگو، میں دے دوں گی۔ بولو تمہاری پلاننگ کیا ہے؟‘‘

’’آج سے بیس سال پہلے ڈیفنس فیز ٹو میں آپ کے نام سے جو زمین خریدی گئی تھی۔ آج اس کی قیمت ایک کروڑ روپے سے زیادہ ہوگئی ہے۔ میں وہاں کئی منزلہ عالی شان دفتر قائم کروں گا۔ ڈیڈ کے کاروباری معاملات کو اپنے دفتر میں منتقل کروں گا۔‘‘

’’میں کاروباری معاملات کو نہیں سمجھتی۔ بس اتنا چاہتی ہوں کہ تم باپ کے محتاج نہ رہو۔ وہ تمہارا محتاج ہو جائے۔ جس دن ایسا ہوگا، میں محتاجوں کے لیے سو دیگیں پکواؤں گی۔‘‘

وہ ذرا ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ’’لیکن ممی! ایسا کرنے کے لیے آپ کو وہ زمین میرے نام لکھنی ہوگی۔‘‘

’’اس میں لکھنے پڑھنے والی کیا بات ہے؟ ماں کی زمین ہے بیٹا اسے استعمال کر سکتا ہے۔‘‘

’’لیکن بینک والے ماں بیٹے کا رشتہ نہیں سمجھتے۔ جب تک وہ زمین میرے نام نہیں ہوگی۔ مجھے قرض نہیں ملے گا اور قرض نہیں ملے گا تو میں وہاں دفتر کی عمارت قائم نہیں کر سکوں گا۔‘‘

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ اس نے وہ زمین اپنے برے وقت کے لیے رکھی تھی لیکن بیٹے پر اچھا وقت آنے والا تھا اور وہ اپنے باپ سے سبقت لے جانے والا تھا۔ ایسی صورت میں آنکھ بند کر کے بیٹے کے کام آنا لازمی ہو گیا تھا۔

شہریز اسے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ پھر بولا۔ ’’مجھے بھی یہ اچھا نہیں لگتا کہ ڈیڈ برتری حاصل کرتے رہیں اور میری ماں کو کمتر بناتے رہیں۔ اگر آپ وہ زمین میرے نام نہیں کرنا چاہتیں تو کوئی بات نہیں۔ میں کوئی دوسری تدبیر کروں گا۔‘‘

وہ جلدی سے بولی۔ ’’نہیں بیٹے! ایسی بات نہیں ہے۔ تمہارے سوا میرا اور ہے ہی کون......؟ جو کچھ میرا ہے وہ سب تمہارا ہی ہے۔‘‘

وہ اس نیکلس کو ہاتھ میں لے کر بیٹے کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ’’تمہارے پاس کچھ نہیں

ہے پھر بھی تم نے جتنا کمایا اس کا زیادہ حصہ ماں کو دیا۔ جب کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی تم ایک لاکھ دس ہزار روپے کا نیکلس دے سکتے ہو تو کیا ماں اپنے بیٹے کو زمین لکھ کر نہیں دے سکتی؟ ہم کل صبح ہی اسٹیٹ ایجنٹ کے پاس جائیں گے۔''

پھر وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''تمہارے باپ نے بھی کئی بار اس زمین کا مطالبہ کیا، مگر میں نے ہمیشہ یہی جواب دیا کہ میرا جو کچھ ہے میرے بیٹے کے لیے ہے اور اب میں وہ زمین تمہارے نام کروں گی تو تمہارے ڈیڈ اپنا سا منہ لے کر رہ جائیں گے۔''

اس نے خوش ہو کر اسے دونوں بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ ''اوہ مائی گریٹ ممی! آئی لو یو.....''

وہ ماں بیٹا تھوڑی دور تک ایک دوسرے کو پیار کرتے رہے۔ پیار بھری باتیں کرتے رہے۔ پھر وہ اٹھتے ہوئے بولا'' بہت رات ہو رہی ہے اب آپ کو سونا چاہیے۔ میں بھی سونے جا رہا ہوں۔''

وہ شب بخیر کہہ کر وہاں سے چلا گیا۔ فریدہ نے دروازے کو اندر سے بند کیا۔ پھر آئینے کے سامنے آ کر اس ہار کو دیکھنے لگی۔ دیکھ دیکھ کر جی نہیں بھر رہا تھا۔ یہ بات نہیں تھی کہ وہ ہار قیمتی تھا۔ ہر چیز کی قدر و قیمت ہوتی ہے۔ وہ اس ہار کی قیمت کو نہیں اس کی قدر کو سمجھ رہی تھی۔ بیٹے کا پیار گلے میں جگمگا رہا تھا۔

لیلیٰ مجنوں کی محبت ہو یا ماں بیٹے کا پیار ہو۔ محبت بعد میں ہوتی ہے پہلے لین دین ہوتا ہے۔ یہ بات ماں کی سمجھ میں نہیں آئی کہ بیٹے نے ایک لاکھ دس ہزار روپے کا پھندا گلے میں ڈال کر ایک کروڑ کی زمین ہتھیا لی ہے۔

موبائل فون کا بزر سنائی دیا۔ اس نے فون کو اٹھا کر نمبر پڑھے پھر اسے آن کر کے کان سے لگا کر کہا۔ ''ہائے مسز خان! کیسی ہو؟''

دوسری طرف سے مسز خان نے پوچھا۔ ''آج کلب کیوں نہیں آئیں؟ تمہارے بغیر تو رمی کھیلنے کا مزہ ہی نہیں آتا۔''

''اوہ سوری۔ کیا بتاؤں؟ میرا بیٹا کینیڈا سے آیا ہوا ہے۔ اسے چھوڑ کر کہیں جانے کا جی ہی نہیں چاہتا۔''

''مجھے پتا ہے، میں ساری معلومات رکھتی ہوں۔ دراصل میں نے تمہارے بیٹے کو وِش کرنے کے لیے ہی فون کیا ہے۔''

''کیا فون پر ہی وِش کرو گی؟ وہ ابھی سونے کے لیے گیا ہے۔ ویسے تمہیں آ کر دیکھنا

چاہیے میرا بیٹا کیسا گبرو جوان ہو گیا ہے؟‘‘

مسز خان نے کہا۔’’میں تو سر کے بل آؤں گی لیکن تمہیں اپنا وعدہ تو یاد ہے ناں......؟‘‘

فریدہ نے کہا۔’’میں زبان دے کر بھولتی نہیں ہوں۔تمہاری بیٹی کو اپنی بہو ضرور بناؤں گی۔جو کہہ دیا......سو کہہ دیا۔‘‘

’’کیا تم نے بیٹے سے اس سلسلے میں کوئی بات کی ہے؟‘‘

’’آج ہی تو آیا ہے کل کسی وقت اس سے بات کروں گی۔‘‘

’’مجھے تو نہیں لگتا کہ سات سمندر پار سے آنے والا جوان کسی دیسی لڑکی کو پسند کرے گا۔‘‘

’’ایسا نہ کہو۔ وہ میرا بیٹا ہے۔ میں جو کہوں گی وہ وہی کرے گا۔ جسے بہو بنا کر لانا چاہوں گی۔وہ اسے اپنی لائف پارٹنر ضرور تسلیم کرے گا۔‘‘

’’اتنا اعتماد ہے تو کل تک اپنے بیٹے کی رضا مندی بتاؤ پھر میں بیٹی کے ساتھ ہی ملنے آؤں گی۔‘‘

’’اوکے میں کل فون کروں گی۔‘‘

فون کا رابطہ ختم ہو گیا۔ بیٹے کے آنے سے پہلے ہی فریدہ نے یہ سوچ لیا تھا کہ اپنی پسند کی بہو لائے گی۔مسز خان کی بیٹی اس کی ہر بات مانتی تھی۔اسے بہو بنا کر وہ بیٹے کو باپ سے دور رکھ سکتی تھی۔

☆======☆======☆

سکندر بخت نے بھی یہی سوچا تھا کہ اپنی پسند کی بہو لائے گا تو بیٹا ہمیشہ مسائل پیدا کرنے والی ماں سے دور رہے گا۔آفس میں، فیکٹری میں اور بزنس فیلڈ میں باپ کے ساتھ رہے گا اور گھر کی چار دیواری میں بیوی کے ساتھ وقت گزارے گا۔اس طرح ماں کے لیے ایک ذرا وقت نہیں نکال سکے گا۔

زندگی گزارنے والے سہولت سے سیدھے سادے انداز میں زندگی گزار لیتے ہیں لیکن اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو خود ہی معاملات کو الجھا کر اسے پیچیدہ بناتے رہتے ہیں۔اپنا کام بڑھاتے رہتے ہیں۔ان کے لئے ہی کہا جاتا ہے۔

کبھی یہ کام، کبھی وہ کام ہوتا ہے
بس یوں ہی جینا حرام ہوتا ہے

انسان یہ سمجھ نہیں پاتا کہ وہ اپنے ہی کرتوتوں سے اپنے ہی اعمال سے بدنصیبی اور خوش نصیبی کی راہیں ہموار کرتا رہتا ہے۔سکندر بخت اپنے ایک دوست احمد جمال سے ملنے آیا۔

احمد جمال فوڈ پراڈکٹس کی ایک بہت بڑی فیکٹری کا مالک تھا۔

اس نے سکندر سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ''آج کیسے راستہ بھٹک گئے؟ تمہیں تو کبھی یہاں آنے کی فرصت ہی نہیں ملتی؟''

وہ ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''اور تمہیں کون سی فرصت مل جاتی ہے؟ میرا بیٹا کینیڈا سے آیا ہے۔تم اس سے ملنے کے بہانے ہی آسکتے تھے۔''

''یار! میں مصروفیات کے باعث نہ آسکا۔تم شہریز کو یہاں تو لا سکتے تھے؟''

سکندر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''پتا ہے وہ ایم بی اے کر چکا ہے اور وہاں کی ایک فوڈ انڈسٹری میں چھ برس تک کام کرتا رہا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے،تمہارا بیٹا تجربات کی بھٹی میں کندن بن کر آیا ہے!''

''اپنے بیٹے کے بارے میں کچھ بتاؤ؟''

وہ بڑی مایوسی سے بولا۔ ''کیا بتاؤں؟ اسے تو گٹار پلے کرنے سے فرصت نہیں ملتی۔ میوزیکل گروپ بنا رکھا ہے۔میرا بزنس کیا سنبھالے گا۔''

''سعدیہ بیٹی تو سنبھال رہی ہے؟ تمھاری رائٹ ہینڈ بنی ہوئی ہے۔''

''خدا میری سعدیہ کو لمبی عمر دے۔وہ بیٹی ہو کر بیٹے کی طرح تمام کاروبار سنبھال رہی ہے۔''

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ''یہ جو بیٹے ہوتے ہیں ناں۔ جوان ہوتے ہی بے لگام ہو جاتے ہیں۔میرا مشورہ ہے شہریز کو ابھی سے زنجیریں پہنا دو۔''

سکندر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اسے تو تم ہی زنجیریں پہنا سکتے ہو۔''

احمد جمال نے حیرانی سے پوچھا۔ ''میں......؟ میں کچھ سمجھا نہیں۔''

اس نے کہا۔ ''یار! ہم بچپن کے دوست ہیں۔ہم چاہیں تو یہ دوستی رشتے داری میں بدل سکتی ہے۔''

احمد جمال سر جھکا کر سوچنے لگا۔سکندر نے کہا۔ ''سعدیہ اور شہریز بچپن سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔اس روز سعدیہ کو بخار تھا۔ایک سو تین ٹمپریچر تھا۔پھر بھی وہ شہریز کو سی آف کرنے ایئرپورٹ آئی تھی۔''

احمد جمال نے ہاں کے انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''مگر یہ تو کوئی سات برس پہلے کی بات ہے۔سعدیہ اب بہت چینج ہو گئی ہے۔میرے بزنس کو سنبھالنے کے لیے اتنی سنجیدگی سے مصروف رہتی ہے کہ اسے دیکھ کر لگتا ہے وہ بیٹی سے بیٹا بنتی جا رہی ہے۔''

''وہ بیٹی ہے بیٹی ہی رہے گی۔تم رشتے کی بات کرو۔''

احمد جمال نے کہا۔''دوست کے گھر میری بیٹی جائے گی۔ بھلا مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے؟ لیکن......''

''یہ لیکن کہاں سے آ گیا؟ کوئی پرابلم ہے؟''

''پرابلم تو کوئی نہیں ہے۔ بس میں سعد یہ کا رجحان دیکھنا چاہتا ہوں۔ اپنے مستقبل کے بارے میں آخر اسے ہی فیصلہ کرنا ہے۔''

''کوئی بات نہیں۔تم اس کی رضا مندی ضرور حاصل کرو۔ وہ بہت اچھی بچی ہے۔ میں اسے بچپن سے جانتا ہوں۔ وہ میرے گھر آنے سے انکار نہیں کرے گی۔''

موبائل فون کے بزر نے سکندر کو مخاطب کیا۔ اس نے نمبر پڑھے پھر اسے کان سے لگا کر کہا۔''ہیلو شہریز! میں اس وقت تمہارے انکل جمال کے پاس بیٹھا ہوں۔لو پہلے ان سے بات کرو۔''

احمد جمال نے فون لے کر کان سے لگاتے ہوئے کہا۔''ہیلو بیٹے! کیا کینیڈا جا کر اپنے انکل کو بھول گئے؟''

''نہیں انکل! میں بھلا آپ کو کیسے بھول سکتا ہوں؟ ڈیڈ نے تو مجھے آزاد چھوڑ دیا ہے لیکن ممی ساتھ ساتھ لیے پھر رہی ہیں۔ اس لیے آپ کے پاس نہ آسکا۔کل ضرور آؤں گا۔''

''یو آر ویل کم مائی سن! لو اپنے ڈیڈ سے بات کرو۔''

اس نے فون سکندر کی طرف بڑھایا۔ وہ اسے کان سے لگا کر بولا۔''ہاں۔ اب بتاؤ۔ وہاں کیا ہو رہا ہے؟''

''ڈیڈ! آپ کی پلاننگ پر عمل کر رہا ہوں۔ ممی کے ساتھ اسٹیٹ ایجنٹ کے پاس گیا تھا۔ وہ ایجنٹ زمین کے کاغذات تیار کرے گا۔ ایک ہفتے کے اندر وہ زمین میرے نام ہو جائے گی۔''

''یہ کیا کہہ رہے ہو؟ میں نے کہا تھا، اپنی ممی کو سمجھاؤ گے تو وہ زمین میرے نام کر دیں گی۔''

''میں نے بہت سمجھایا، بہت منایا۔ وہ ایک ہی بات کہتی ہیں کہ ان کا جو کچھ بھی ہے صرف میرے لیے ہے۔ وہ زمین میرے نام کریں گی اور وہ ایسا کر رہی ہیں۔''

''لیکن بیٹے! بزنس تو میرے نام سے ہے۔ زمین تمہارے نام ہوگی تو اس پر تعمیر ہونے والی عمارت بھی تمہارے نام سے ہوگی اور بزنس میرے نام سے ہوگا......نہیں ایسا

نہیں ہونا چاہیے۔''

''ہاں۔ میں اسی مسئلے پر آپ سے بات کرنے والا تھا۔ آپ کا بزنس بہت پائیداری سے قائم نہیں ہے، بینک آپ کو قرض نہیں دے گا لیکن میرے پاس ایک کروڑ کی زمین ہے۔ اس پر جو عمارت تعمیر ہوگی، اس کی مالیت دو کروڑ کے قریب ہو جائے گی۔ بینک سے مجھے با آسانی قرضہ مل سکے گا لیکن قرض اسی صورت میں ملے گا کہ وہ بزنس میرے نام سے ہو۔''

''بیٹے! مائنڈ نہ کرنا۔ میں چاہتا ہوں، جب تک میری سانس چل رہی ہے تب تک بزنس میرے ہی نام سے رہے۔ اس کے بعد تو سب کچھ تمہارا ہی ہوگا۔''

احمد جمال اس کی باتیں توجہ سے سن رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ''مسئلہ کیا ہے؟ اگر مجھ سے شیئر کرنا چاہو تو میں بھی کچھ مشورہ دے سکوں گا۔''

اس نے فون پر کہا۔ ''شہریز! میں فون بند کر رہا ہوں۔ ابھی تھوڑی دیر میں کال بیک کرتا ہوں۔''

اس نے فون بند کرتے ہوئے کہا۔ ''بات اصل میں یہ ہے کہ فریدہ اپنی ڈیفنس والی زمین شہریز کے نام کر رہی ہے۔ ہمیں بینک سے لون مل جائے گا۔ وہاں دو تین منزلہ عمارت تعمیر ہو جائے گی۔ ہم اپنا آفس وہیں منتقل کریں گے۔''

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ وہ تو مہنگی اور کمرشل جگہ ہے۔ تمہارے بزنس کے لیے پلس پوائنٹ ہے۔''

''لیکن بیٹا چاہتا ہے، جس طرح ماں نے اپنی زمین اس کے نام کر دی، اسی طرح میں بزنس اس کے نام کر دوں۔ کیونکہ بینک والے اس زمین کی وجہ سے ہی ہمیں قرض دے سکیں گے۔''

احمد جمال نے کہا۔ ''تم اچھے خاصے تجربے کار بزنس مین ہو۔ یہ سمجھتے ہو کہ جب زمین بیٹے کے نام پر ہے تو بینک والے بیٹے کو ہی قرض دیں گے۔ تمہیں نہیں دیں گے۔ اگر اپنا کاروبار پھیلانا چاہتے ہو تو تمہیں بزنس بیٹے کے نام کرنا ہوگا۔ آخر وہ ایک ہی بیٹا ہے۔ آگے جا کر بھی تو سب کچھ اسی کا ہوگا۔''

''ہاں آگے جا کر ہوگا۔ ابھی نہیں ہونا چاہیے۔ ورنہ میں بیٹے کا محتاج ہو جاؤں گا۔''

''یہ کیا کہہ رہے ہو؟ کیا تمہیں اپنے بیٹے پر بھروسا نہیں ہے؟''

اس نے جواب نہیں دیا۔ سر جھکا کر سوچنے لگا۔ احمد جمال نے کہا۔ ''دیکھو! ابھی تم سے رشتے کی بات بھی کی ہے میری بیٹی مجھ سے مانگ رہے ہو۔ تمہیں اپنے بیٹے پر بھروسا نہیں

ہوگا تو میں کس بھروسے پر اپنی بیٹی تمہارے بیٹے کے حوالے کروں گا؟''

سکندر نے چونک کر سر اُٹھایا۔ پھر اپنے دوست کو سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ بولا۔ ''میں اپنے اندر کی ایک بات بتاتا ہوں۔ اپنے بیٹے سے مایوس ہو گیا ہوں۔ یہ اچھی طرح سمجھ گیا ہوں کہ صرف سعدیہ ہی میرے بزنس کو سنبھال سکے گی۔ اس لیے میں نے سب کچھ اس کے نام لکھ دیا ہے۔ اب ذرا غور کرو وہ تمہاری بہو بن کر تمہارے پاس جائے گی تو اپنے ساتھ میرا بزنس بھی لے جائے گی تو کیا میں اس کا محتاج بن جاؤں گا؟''

وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ ''نہیں میں نے اپنی کوٹھی اور ایک معقول بینک بیلنس اپنے نام رکھا ہے تاکہ میں بیٹے یا بیٹی کسی کا محتاج نہ رہوں۔ تم بھی یہی کر سکتے ہو۔''

اس نے کچھ سوچ کر موبائل فون اُٹھایا نمبر پنچ کیے پھر اسے کان سے لگا کر رابطہ ہونے پر کہا۔ ''ہیلو بیٹے! ابھی تمہارے جمال انکل سے باتیں کر رہا تھا۔ وہ بھی مجھے یہی مشورہ دے رہے ہیں۔''

''ڈیڈ میں سمجھا نہیں۔ وہ کیا مشورہ دے رہے ہیں؟''

''یہی کہ بزنس تمہارے نام ہونا چاہیے۔''

''آپ انکل سے کہیں میں ان کا شکریہ ادا کر رہا ہوں۔''

سکندر بخت نے مسکرا کر احمد جمال سے کہا۔ ''یہ تمہارا شکریہ ادا کر رہا ہے۔''

احمد جمال ہنسنے لگا۔ سکندر نے کہا۔ ''میں فون بند کر رہا ہوں۔ باقی باتیں گھر آ کر ہوں گی۔''

ان کا رابطہ ختم ہو گیا۔ اس نے اپنی بیوی کی زمین ہتھیانے کے لیے بیٹے کو آگے کیا تھا تاکہ اس کی ممتا سے کھیل کر وہ زمین حاصل کر لی جائے۔

وہ زمین حاصل ہو گئی تو پتا چلا کہ اپنی بیوی فریدہ کے ساتھ وہ بھی دلدل میں دھنس گیا ہے۔ اس زمین پر کاروبار کرنے کے لیے، منافع کی شرح میں اضافہ کرنے کے لیے بزنس کو بیٹے کے نام سے کرنا ہوگا۔ نہیں کرے گا تو جہاں ہے، ساری زندگی وہیں رہے گا۔

میاں بیوی کے درمیان جو جنگ جاری رہتی تھی۔ اس کے منفی نتائج ابھی سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ وہ فریدہ سے بیٹے کو دور کرنے کے لیے گھر میں بھولا نا چاہتا تھا۔ اس کے لیے احمد جمال کے پاس آیا تو بات بن گئی۔ سعدیہ اس کی بہو بن سکتی تھی لیکن احمد جمال نے باتوں ہی باتوں میں سمجھا دیا کہ جس طرح وہ اپنا کاروبار بیٹی کے نام کر چکا ہے اسی طرح اسے بھی اپنا کاروبار اپنے بیٹے کے نام کر دینا چاہیے۔

وہ فریدہ کو کمتر بنانا چاہتا تھا، اسے الجھا رہا تھا لیکن خود بھی الجھتا جا رہا تھا۔ وہ اپنے

نقصان کا دکھ کم کرنے کے لیے سوچنے لگا۔ ''کوئی بات نہیں۔ آج میں نے فریدہ سے اس کی کروڑوں کی زمین چھین لی ہے۔ وہ میرے نام نہ سہی بیٹے کے نام ہوگئی۔ مگر فریدہ تو اس زمین سے محروم ہوگئی۔ اب ایک سواسّی گز والے پلاٹ کا مکان اس کے نام رہ گیا ہے اور اس مکان کی اتنی اہمیت نہیں ہے۔''

شہریز نے فون بند کیا پھر اسے سہلاتے ہوئے زیرلب کہا۔ ''دو بلیاں ایک روٹی کے لیے لڑ رہی تھیں۔ وہ بٹوارے اور انصاف کے لیے ایک بندر کے پاس آئیں۔ بندر نے روٹی کے دو ٹکڑے کیے پھر دونوں ٹکڑوں کو ترازو کے پلڑوں پر رکھا۔ ایک ٹکڑا کچھ زیادہ تھا۔ وہ پلڑا جھکنے لگا۔ بندر نے اس ٹکڑے کو تھوڑا سا چپا کر اپنے حلق سے اتارا پھر اسے پلڑے پر رکھا۔ اب دوسرا زیادہ ہوگیا۔ وہ پلڑا جھکنے لگا۔ بندر نے وہاں سے بھی روٹی کو اٹھایا پھر اسے دانت سے توڑ کر واپس پلڑے میں رکھا تو پہلے والا پلڑا پھر بھاری پڑ کر جھکنے لگا۔

دونوں بلیاں پریشان ہوکر اسے دیکھ رہی تھیں۔ وہ انصاف کے لیے آئی تھیں اور بندر انصاف کرنے کے لیے دونوں ٹکڑوں کو برابر کرتا جارہا تھا۔ کبھی اِدھر کی کبھی اُدھر کی روٹی چبا چبا کر کھاتا جارہا تھا۔ آخر میں ترازو کے دونوں پلڑے خالی رہ گئے۔ ساری روٹی پیٹ میں اُتر گئی۔''

شہریز نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''بلیوں کو لڑنا نہیں چاہیے تھا۔ یہ بات ممی ڈیڈی کی سمجھ میں نہ آئی ہے اور نہ آئے گی۔''

یکبارگی فون کا بزر چیخنے لگا۔ وہ ایک دم سے چونک گیا۔ جیسے ماں باپ نے اس کی چوری پکڑلی ہو۔ اس نے ننھی سی اسکرین پر نمبر پڑھے اس کا ایک دوست کاشف اسے کال کر رہا تھا۔ وہ بھی کینیڈا جاکر زیادہ سے زیادہ کمانا اور اپنا مستقبل بہترین بنانا چاہتا تھا۔ اس مقصد کے لیے شہریز سے فون پر برابر رابطہ رکھتا تھا۔

اس نے فون کو کان پر لگاتے ہوئے کہا۔ ''ہیلو کاشف! اب تم شکایت کروگے کہ میں نے یہاں آتے ہی تم سے ملاقات نہیں کی۔''

کاشف نے کہا۔ ''کیا مجھے شکایت نہیں کرنی چاہیے؟ اگر ملنے نہیں آئے تو کم از کم ایک فون ہی کردیتے کہ یہاں آچکے ہو۔''

''بھئی یہاں آتے ہی میں بہت مصروف ہوگیا ہوں۔ ویسے آج شام کو ملوں گا۔ بولو۔ کہاں ملاقات ہوسکتی ہے؟''

''اگر اپنے آئیڈیل سے ملنا چاہتے ہو تو ابھی چلے آؤ۔''

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ''آئیڈیل......؟''

''ہاں۔تم کینیڈا سے اکثر فون پر اس کا ذکر کیا کرتے تھے کہ وہ ایسی ہے وہ ویسی ہے۔ سیدھی آسمان سے اُتر کر تمہارے دل میں آئی ہے۔''

''ہاں۔وہ جیسی ہے ویسی کوئی دوسری نہیں ہو سکتی۔''

''تم نے یہ بھی کہا تھا کہ اسے خوابوں میں، خیالوں میں سر سے پاؤں تک دیکھتے ہو، لیکن کبھی اس کا چہرہ نہیں دیکھ پائے۔''

''ہاں۔میں نے یہ کہا تھا۔''

''تو بس چلے آؤ۔آج میں اس کا چہرہ تمہیں دکھاؤں گا۔ میں ہوٹل پرل کے سوئمنگ پول کے پاس ہوں۔وہ بھی یہیں آنے والی ہے۔بس فوراً چلے آؤ۔''

اس نے رابطہ ختم کیا۔فریدہ اسٹیٹ ایجنٹ کے پاس بیٹھی کاغذات تیار کروا رہی تھی۔وہ آفس میں آ کر بولا۔''ممی مجھے ابھی ایک ضروری کام سے جانا ہے۔آپ میری کار کی چابی لیں۔میں ٹیکسی میں چلا جاؤں گا۔''

اس نے چابی ماں کی طرف بڑھائی۔وہ بولی۔''نہیں بیٹے! تمہیں کسی سے ملنے کے لیے اپنی کار میں ہی جانا چاہیے۔میں ٹیکسی میں چلی جاؤں گی۔میری فکر نہ کرو۔تم جاؤ۔''

وہ باہر آیا اور اپنی کار میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔وہ ایک ٹھوس عملی زندگی گزارنے والا نوجوان تھا۔عشق و محبت اور شعر شاعری سے لگاؤ نہیں رکھتا تھا۔یہ سوچ کر حیران ہوتا تھا کہ پتا نہیں وہ حسینہ کس طرح اس کے خواب و خیال میں آنے لگی ہے؟

پہلی بار وہ اس کے خواب میں آئی تو بیدار ہونے کے بعد اس نے اس خواب کو بھلا دیا۔اس کی جیتی جاگتی زندگی میں کتنی ہی حسینائیں آتی جاتی رہتی تھیں۔پھر بھلا وہ خواب میں آنے والی کو کیا اہمیت دیتا؟

لیکن وہ اہمیت جتا رہی تھی۔وہ ایک روز نیاگرا آبشار کے قریب بیٹھا ہوا تھا تو وہ اسے دور سے نظر آئی۔آبشار کے چھینٹے دور دور تک پھیلتے تھے۔وہ ان چھینٹوں میں بھیگ رہی تھی۔لباس تر ہو کر بدن سے چپک رہا تھا۔بھیگنے کی ادا کچھ ایسی تھی کہ دل اس کی طرف کھنچا جا رہا تھا۔

وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہی خواب میں آنے والی حسینہ ہے۔کیونکہ اس نے اس کا سراپا دیکھا تھا، چہرہ نہیں دیکھا تھا۔وہ سحر زدہ سا ہو کر اس کی طرف جانے لگا۔حیرانی سے سوچنے لگا کہ یہ کیا طلسم ہے؟ جیسے جیسے قریب پہنچ رہا تھا، ویسے ہی ویسے وہ فضا میں تحلیل ہوتی جا رہی تھی۔قریب پہنچنے سے پہلے ہی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔

وہ حیرانی سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔اسے تسلیم کرنا پڑا کہ وہ حقیقت نہیں تھی، اس کا

خیال تھا۔ وہ اس کے تصور میں آئی تھی۔

پھر کبھی خوابوں میں اور کبھی خیالوں میں آنے کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ وہ کبھی کسی حسین دوشیزہ سے متاثر نہیں ہوتا تھا لیکن خیالوں میں آنے والی سے متاثر ہونے لگا۔ پھر نجومی نے اس کا ہاتھ دیکھ کر تصدیق کی۔ اس سے کہا کہ وہ کسی لڑکی سے ٹوٹ کر محبت کرے گا اور جس کی بائیں ہتھیلی کی پشت پر ایک سیاہ تل ہوگا، وہ اس کی بہترین لائف پارٹنر ثابت ہوگی۔

وہ نجومی کی اس پیش گوئی پر اس لیے یقین کرنے لگا کہ خوابوں اور خیالوں میں آنے والی اس دوشیزہ کی بائیں ہتھیلی کی پشت پر وہ سیاہ تل نظر آتا تھا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے سے گزرتا تھا۔ وہ تل اس کی پہچان بن گیا تھا۔ کبھی وہ سامنے آئی تو وہ اس کے چہرے سے نہیں اس سیاہ تل سے اسے پہچان سکتا تھا۔

انسان آدھی زندگی سونے میں گزار دیتا ہے اگر سو نہ رہا ہو، تب بھی جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھتے ہوئے زندگی گزارتا چلا جاتا ہے۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ وہ اپنی آدھی عمر نیند میں گزار دیتا ہے۔

اس نے وہاں ایک ماہرِ نفسیات سے ملاقات کی۔ اسے بتایا۔ ''مجھے شعر وشاعری سے دلچسپی نہیں ہے۔ میں خیالی دنیا میں نہیں رہتا ہوں۔ پریکٹیکل ہوں، ٹھوس زندگی گزارنا چاہتا ہوں لیکن پچھلے دو ماہ سے ایک ایسی لڑکی خوابوں اور خیالوں میں آنے لگی ہے، جس کا چہرہ دکھائی نہیں دیتا۔ میں اسے سر سے پاؤں تک دیکھتا ہوں اور خاص طور پر اس کی بائیں ہتھیلی کی پشت پر ایک سیاہ تل ضرور دکھائی دیتا ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے، جبکہ میں کسی لڑکی میں دلچسپی نہیں لیتا اور نہ ہی کبھی کسی کو اپنا آئیڈیل بنانا چاہتا ہوں۔''

اس ماہرِ نفسیات نے اس سے طرح طرح کے سوالات کیے پھر کہا۔ ''میں اس نتیجے پر پہنچ رہا ہوں کہ تم نے کبھی کسی لڑکی کی ہتھیلی کی پشت پر سیاہ تل دیکھا ہے اور اسے بھول گئے ہو۔ چونکہ تم ایک ٹھوس زندگی گزارنے والے جوان ہو۔ اس لیے تم نے اس لڑکی کے متعلق عشقیہ انداز میں نہیں سوچا۔ رفتہ رفتہ اسے بھولتے چلے گئے لیکن لاشعوری طور پر اس سے متاثر ہوتے رہے۔ وہ تمہارے لاشعور میں کہیں چھپی ہوئی ہے۔ تم عاشق مزاج نہ ہوتے ہوئے بھی اس سے متاثر ہو۔''

اس نے کہا۔ ''ڈاکٹر! میں نے کبھی ایسی لڑکی سے ملاقات نہیں کی۔ جس کی بائیں ہتھیلی کی پشت پر سیاہ تل ہو۔ کسی لڑکی کا ہاتھ پکڑنا تو دور کی بات ہے، میں نے کبھی کسی کو قریب آنے کی اجازت بھی نہیں دی۔''

''انسان نہ چاہتے ہوئے بھی چند اہم باتیں بھول جاتا ہے۔ وہ باتیں کسی خاص موقع پر اسے یاد آتی ہیں۔ ہوسکتا ہے، کبھی اس لڑکی سے ملو تو تمہیں یاد آ جائے کہ اس سے پہلے بھی مل چکے ہو۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکوں گا۔ اس بات سے مطمئن رہو کہ تم کوئی ذہنی مریض نہیں ہو۔''

شہریز کو خود پر اعتماد تھا۔ نہ وہ ذہنی مریض تھا اور نہ ہی کسی کے عشق میں اس طرح پاگل ہونے والا تھا کہ مجنوں کی طرح کپڑے پھاڑ کر صحرا میں نکل جاتا۔ وہ ایسی حماقت کبھی نہ کرتا لیکن دل ہی دل میں یہ تسلیم کر رہا تھا کہ وہ خیالوں میں آنے والی اسے بری طرح متاثر کر رہی ہے اور اپنی جستجو میں اسے بھٹکا رہی ہے۔

وہ بھٹکتا ہوا پرل کے سوئمنگ پول تک پہنچ گیا۔ کاشف اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی بولا۔ ''انگریزوں کے ملک میں رہ کر آئے ہو۔ اس لیے وقت کے پابند ہو گئے ہو۔ ٹھیک آدھے گھنٹے میں یہاں پہنچے ہو۔ وہ بھی بس آنے ہی والی ہے۔''

''آخر وہ ہے کون؟ تم نے کیسے سمجھ لیا کہ وہی میری آئیڈل ہو سکتی ہے؟''

''تم نے اپنے آئیڈیل کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا کہ جیسی وہ ہے ویسی کوئی دوسری نہیں ہو سکتی۔ روزینہ بھی ایسی ہی ہے۔ اس جیسی اور کوئی دوسری پیدا نہیں ہوگی۔''

شہریز نے کہا۔ ''دنیا کے ہر ملک ہر علاقے میں حسن بکھرا پڑا ہے۔ اس کی یوں تعریف کرنے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ میں اس کے حسن اور اس کے سراپے سے متاثر ہو گیا ہوں۔''

''تعجب ہے...... تو پھر تم اس کی کس بات سے متاثر ہوئے ہو؟''

''یہ بتاؤ روزینہ کی بائیں ہتھیلی کی پشت پر سیاہ تل ہے؟''

وہ سر جھکا کر سوچتے ہوئے بولا۔ ''ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی...... میں نے اس کے ہاتھوں کو کبھی توجہ سے نہیں دیکھا۔ ویسے یہ کیا ضروری ہے کہ اس کے کسی ہاتھ پر تل ہو؟ نہ ہو تو کیا فرق پڑے گا؟ محبوبہ کو ہر پہلو سے حسین اور پُرکشش ہونا چاہیے۔''

''تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ میں حسن پرست نہیں ہوں۔ جس کی ہتھیلی کی پشت پر سیاہ تل ہوگا وہی میری لائف پارٹنر بنے گی۔ خواہ وہ حسین ہو یا نہ ہو۔ پتا نہیں لوگ حسن پر کیوں مرتے ہیں؟ کیا یہ مرنے والے حسینوں کو چبا کر کھاتے ہیں؟''

''تمہاری بات سمجھ میں آ رہی ہے۔ پوجنے والے سورج کو بھی پوجتے ہیں اور ایک ذرّے کو بھی بڑی عقیدت سے اٹھا کر سر پر رکھتے ہیں۔ تم کسی لڑکی کے نہیں بلکہ ایک نقطہ برابر تل کے دیوانے ہو۔''

پھر وہ ایک طرف دیکھ کر بولا۔ ’’آ گئی ...... وہ دیکھو! وہ آ رہی ہے ہوش اُڑانے والی......‘‘

سوئمنگ پول کے دوسرے سرے سے ایک دراز قد حسینہ بڑے ناز و انداز سے چلتی ہوئی آ رہی تھی۔ دور سے ہی پتا چل رہا تھا کہ حسین بھی ہے اور دلنشین بھی......اس کی زلفیں ٹھہر ٹھہر کر ہوا میں لہرا رہی تھیں۔ چال بتا رہی تھی کہ وہ کیٹ واک کرنے والی فیشن شوز کی ماڈل گرل ہے۔

کاشف نے کہا ۔ ’’کلیجہ تھام لو۔ وہ آ رہی ہے دل کی دھڑکنوں پر قدم رکھتے ہوئے......‘‘

شہریز اسے نہیں دیکھ رہا تھا اس کی نظریں اس کے بائیں ہاتھ کی طرف بھٹک رہی تھیں۔ وہ ہاتھ ہر قدم پر آگے پیچھے ہو رہا تھا۔ ایک ننھا سا تل دور سے نظر نہیں آ سکتا تھا۔ وہ قریب آ گئی۔قریب آنے پر بھی ہاتھ کا زاویہ ایسا تھا کہ ہتھیلی کی پشت نظر نہیں آ رہی تھی۔ کاشف نے کہا ۔’’نیچے کیوں دیکھ رہے ہو؟ اوپر دیکھو۔ چاند اوپر ہوتا ہے۔ اس وقت یہ ٹاپ کی ماڈل ہے۔ ماڈلنگ کی دنیا میں پرنسس کہلاتی ہے۔ہم اسے لاجواب کہتے ہیں۔ بولو۔تم کیا کہتے ہو؟‘‘

شہریز نے اس حسینہ کو دیکھا۔ وہ بھی اسے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ کاشف نے کہا۔’’پہلے نگاہوں کا جادو چلتا ہے پھر دل پر قابو نہیں رہتا۔‘‘

کاشف نے شہریز کے شانے کو تھپکتے ہوئے کہا۔’’تمہارا کیا حال ہے میرے بھائی......!‘‘

روزینہ نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔’’ہائے۔آئی ایم روزینہ...... پلیز ٹو میٹ یو۔‘‘

شہریز مصافحے کے لئے بڑھے ہوئے دائیں ہاتھ کو نہیں اس کے بائیں ہاتھ کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنا بایاں ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔’’پلیز ٹو میٹ یو۔ میرا نام شہریز ہے۔‘‘

روزینہ نے حیرانی سے اس کے بائیں ہاتھ کو دیکھا۔ کاشف نے بھی حیرانی سے کہا۔ ’’ساری دنیا سیدھے ہاتھ سے مصافحہ کرتی ہے اور تم الٹا ہاتھ بڑھا رہے ہو؟‘‘

شہریز نے کہا۔’’سوری ایک نجومی نے کہا ہے کہ میں الٹا چلوں گا تو مجھے سیدھی منزل ملے گی۔‘‘

روزینہ نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا پھر اپنے بائیں ہاتھ کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔’’ویل۔اس طرح منزل ملتی ہے تو اسی طرح سہی......‘‘

اس نے مصافحے کے لیے اپنا بایاں ہاتھ بڑھایا۔ شہریز نے اسے تھام لیا۔ زندگی بھی

خوب ہے۔ کبھی ہاتھ سے ہاتھ ملاتی ہے، کبھی آس دلاتی ہے۔ دل میں امنگیں جگاتی ہے اور پھر......

اس نے ہاتھ ملاتے ہوئے اس کے ہاتھ کو ذرا سا ترچھا کیا۔ ہتھیلی کی پشت نظروں کے سامنے آ گئی۔ وہاں کوئی سیاہ تل نہیں تھا۔

یہی زندگی ہے ایک پل میں ہاتھ ملاتی ہے۔ دوسرے پل میں ہاتھ چھڑا دیتی ہے۔ شہریز کو مایوسی ہوئی اس نے بڑی آہستگی سے اس ہاتھ کو چھوڑ دیا۔ وہ کسی کے ہاتھ کو نہیں ایک ننھے سے تل کو اپنی گرفت میں لینا چاہتا تھا اور وہ تل اس کی پہنچ سے کہیں دور تھا۔ پتا نہیں کہاں ہوگا؟

وہ چپ چاپ پلٹ کر جانے لگا۔ کاشف نے اس کے پیچھے آتے ہوئے کہا۔ ''ارے کیا ہوا؟ کہاں جا رہے ہو؟''

وہ اس کی طرف دیکھے بغیر آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ ''تم نے میرا وقت ضائع کیا ہے۔ آئندہ میرے جذبات سے کبھی اس طرح نہ کھیلنا۔''

''یار تھوڑی دیر تو رک جاؤ۔ روزینہ سے باتیں کرو۔ یہ بڑی مہنگی ماڈل ہے۔ ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتی۔ میں نے تمہاری تعریف کی تو تم سے ملنے چلی آئی۔''

وہ سوئمنگ پول کے احاطے سے نکلتے ہوئے بولا۔ ''اپنے تعریفی الفاظ واپس لے لو۔ مکھی اُڑ جائے گی۔''

وہ تیزی سے آگے بڑھتا چلا گیا۔ کاشف پیچھے رہ گیا۔ ناگواری سے بولا۔ ''یہ تم اچھا نہیں کر رہے ہو۔ روزینہ کے سامنے میری انسلٹ کر رہے ہو۔''

وہ دور جا چکا تھا۔ جواب دینا مناسب نہیں سمجھتا تھا۔ اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ وہ پلٹ کر روزینہ کے پاس آیا۔ وہ بولی۔ ''کیا ہوا تم تو بڑی ڈینگیں مار رہے تھے۔ اس کی فوڈ پراڈکٹس میں مجھے ماڈلنگ کا چانس دلانے والے تھے؟''

''تم ماڈلنگ کی بات کر رہی ہو۔ میں تو تمہیں اس کی آئیڈیل محبوبہ بنا دیتا لیکن اس گدھے کے بچے کو کسی بھی سالم لڑکی سے دلچسپی نہیں ہے۔ بس ایک چھوٹے سے تل پر مر رہا ہے۔ کیا تم اپنے ہاتھ پر ایک تل لے کر پیدا نہیں ہو سکتی تھیں؟''

''کیا بکواس کر رہے ہو؟''

''جب میں ناکام ہوتا ہوں تو اسی طرح الٹی سیدھی ہانکنے لگتا ہوں۔ سوچا تھا، موٹی اسامی ہے۔ تم اسے شیشے میں اتار لو گی۔''

''کیسے اتار لیتی؟ اس نے بات تک نہیں کی۔ مجھے نظر بھر کر بھی نہیں دیکھا۔ بہت ہی

مغرور ہے۔''

''یہ بے لگام گھوڑا ہے میں بھی بہت ضدی ہوں۔اسے لگام ڈال کر ہی رہوں گا۔''

وہ بولی۔ جو دولت مند...... عیاش زندہ دل اور ہوس پرست نہ ہو۔ وہ ہمارے کسی کام کا نہیں ہوتا۔''

پھر اس نے پوچھا۔''کیا چنے کی دال کھاتے ہو؟''

''یہ کیا سوال ہوا؟ کبھی کبھی کھاتا ہوں۔ کیونکہ یہ دیر سے گلتی ہے۔''

وہ ناگواری سے بولی۔''اونہہ۔یہ کم بخت تو دیر سے بھی نہیں گلے گا۔لوہے کا چنا ہے......''

یہ کہہ کر وہ پلٹ گئی۔ وہاں سے جانے لگی۔ وہ اسے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا اور شہریز کے بارے میں سوچ رہا تھا۔''اس کا مطلوبہ تل چنے یا مسور کی دال کے برابر ہوگا۔ میں یہ دال ضرور گلاؤں گا۔''

☆======☆======☆

فریدہ اور سکندر بخت نے ایک ہی چھت کے نیچے رہ کر زندگی گزارنے کے الگ الگ اصول بنا لیے تھے۔ دونوں ہی ضدی اور اَنا پرست تھے۔ اپنی اپنی بات منوا کر دلی سکون حاصل کرتے تھے۔

جب وہ ایک دوسرے سے اپنی بات منوانے میں ناکام رہتے تو وہی بات اپنی اولاد سے منوانے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ دوسرے الفاظ میں اولاد کے لیے مسئلہ بن جاتے تھے۔ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ انہیں باپ کی حمایت میں بولنا چاہیے یا ماں کی حمایت میں؟

جب ماں باپ کے جھگڑوں کے باعث اولاد دوراہے پر آجاتی ہے تو پھر وہ جھوٹ اور فریب کا سہارا لیتی ہے۔ والدین سے جھوٹ بولتی ہے اور انہیں جھوٹی حمایت کا یقین دلا کر دھوکا دیتی رہتی ہے۔

چلمن جب بھی باپ کی حمایت کرتی تھی تو وہ خوش ہو کر اسے شاپنگ کے لیے بڑی رقمیں دیتا تھا۔فریدہ اپنی چھوٹی بیٹی منزل کی حمایت سے خوش رہتی تھی۔ اسے شاپنگ بھی کراتی تھی اور کبھی گھومنے پھرنے کے لیے اپنی کار کی چابی بھی دے دیتی تھی۔

ماں باپ کے اختلافات سے صرف بیٹیاں ہی نہیں، بیٹا بھی فائدہ اٹھانے آگیا تھا۔ اس نے آتے ہی ماں سے ایک کروڑ کی زمین اپنے نام کروالی تھی اور اب باپ کا کاروبار بھی اپنے نام کرانے والا تھا۔ جو والدین ذرا سی بھی عقل اور تجربہ رکھتے ہیں وہ زندگی میں کبھی اپنے

بیٹوں کے نام کاروبار یا زمین جائیداد نہیں لکھتے۔ جب تک کاروبار اور جائیداد اپنے نام رہتی ہے، تب تک اولاد بھی فرمانبردار رہتی ہے۔ ان کی زندگی کی آخری سانس تک ان کی خدمت کرتی رہتی ہے۔ ایسے میں بیٹے، اپنی بیوی اور بچوں کو لے کر ماں باپ سے الگ نہیں ہوتے۔ اپنا الگ گھر نہیں بساتے۔ انہیں یہ اندیشہ رہتا ہے کہ وہ والدین کو چھوڑیں گے تو دوسرے بھائی تمام کاروبار اور جائیداد پر قبضہ جمالیں گے۔

سکندر بخت نے اپنی زندگی میں بڑے نشیب وفراز دیکھے تھے۔ چھوٹے بڑے معاملے میں وہ کبھی کسی پر بھروسا نہیں کرتا تھا۔ اپنے بیٹے شہریز پر بھی بھروسا نہ کرتا لیکن یہ دیکھتا آرہا تھا کہ بیٹا بچپن سے ہی باپ کی شخصیت سے متاثر ہے اور اس کی ہر بات مانتا آرہا ہے۔ وہ پچھلے چھ برسوں سے اس کے بینک اکاؤنٹ میں ہر ماہ پچاس ہزار کا اضافہ کرتا آرہا تھا۔ اس نے یہ بات ماں کو نہیں بتائی تھی اور یہی اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ ماں سے زیادہ باپ کو چاہتا ہے اور وہ آئندہ بھی اسی کا وفادار رہے گا۔

سکندر چاہتا تھا، ڈیفنس کی قیمتی زمین فریدہ کے پاس نہ رہے، کسی طرح اس کے قبضے میں آجائے۔ بیٹے نے آتے ہی اس کی یہ خواہش پوری کردی تھی۔ ماں کی ممتا سے کھیل کر وہ زمین اپنے نام کروالی تھی۔ اگرچہ اس پر سکندر کا قبضہ نہیں ہوا مگر وہ مطمئن ہو گیا کہ اس نے اس مغرور عورت کو ایک قیمتی زمین سے محروم کردیا ہے۔

انسان کچھ ایسا ہی ہے، جب ایک زمین یا ایک بڑی رقم یا روٹی کا ایک ٹکڑا اسے نہیں ملتا تو وہ چاہتا ہے کہ دوسرا بھی اس سے محروم رہے۔ اب وہ چاہتا تھا کہ اپنے دوست احمد جمال کے کاروبار پر بھی چھا جائے۔ اس مقصد کے لیے یہ پلاننگ کی تھی کہ اس کی بیٹی سعدیہ کو اپنی بہو بنائے گا۔ اس طرح شہریز داماد بن کر اس کے کاروبار میں سیاہ اور سفید کا مالک بنتا رہے گا۔

پھر پتا چلا کہ احمد جمال نے اپنا کاروبار اور اپنی تمام جائیداد اپنی بیٹی سعدیہ کے نام لکھی ہے۔ یہ معلوم ہونے کے بعد یقین ہو گیا کہ وہ سعدیہ کو بہو بنا کر بہت بڑی بازی جیت لے گا۔ مگر کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا بھی پڑتا ہے۔ احمد جمال نے واضح الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ میں نے اپنا کاروبار بیٹی کے نام کیا ہے، تم بھی اپنا کاروبار بیٹے کے نام کردو۔ اگر ہم اپنے کاروبار اور جائیداد میں اپنا تھوڑا سا بھی حصہ رکھیں گے تو بڑھاپے میں اپنی اولاد کے محتاج نہیں رہیں گے۔

سکندر ذرا الجھ سا گیا تھا کہ کاروبار کے معاملے میں اپنے بیٹے پر بھروسا کرنا چاہیے یا نہیں؟ جبکہ وہ بچپن سے ہی اس کا فرمانبردار رہا ہے۔ سامنے ایک بہت بڑی بازی جیتنے کا

یقین بھی تھا۔ وہ بیٹے کو احمد جمال کا داماد بنا کر چند برسوں میں اس کے تمام کاروبار پر قبضہ جما سکتا تھا۔

یہاں بھی اس کے اندر وہی احمقانہ خود غرضی تھی کہ زمین اپنے نام نہ ہوئی کوئی بات نہیں۔ اس نے فریدہ کو تو اس زمین سے محروم کر دیا تھا۔ اسی طرح وہ اپنا کاروبار بیٹے کے نام لکھ دے گا تو کوئی بات نہیں لیکن احمد جمال کے کاروبار پر تو قبضہ جمالے گا۔ اگرچہ شہریز قبضہ جمائے گا لیکن نام تو باپ کا ہی ہوگا۔ اور آمدنی کا بڑا حصہ اپنے ہی گھر میں آئے گا۔

رات کو کھانے کی میز پر سب ہی موجود تھے۔ سکندر نے کہا۔ ''بیٹے! میں نے تمہاری شادی کا فیصلہ کیا ہے۔''

فریدہ نے چونک کر اسے دیکھا پھر کہا۔ ''یہ تو میرے دل کی بات ہے۔ ابھی میں یہی کہنے والی تھی۔''

پھر اس نے دونوں بیٹیوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں نے ایک لڑکی پسند کی ہے، تم دونوں اسے جانتی ہو۔ وہ مسز خان کی بیٹی ہے۔ کتنی کیوٹ اور سمارٹ لگتی ہے۔ لگتی ہے نا......؟''

سکندر نے بیٹیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''تم دونوں نے جمال انکل کی بیٹی سعدیہ کو دیکھا ہے؟ اسے بچپن سے جانتی ہو۔''

چلمن نے کہا۔ ''اوہ ڈیڈ! سعدیہ کی کیا بات ہے۔ وہ تو کالج سے نکلتے ہی انکل جمال کی کرسی پر جا بیٹھی ہے۔ ان کا پورا کاروبار سنبھال رہی ہے۔''

منزل نے اپنی ممی کو محبت سے دیکھا۔ پھر کہا۔ ''ڈیڈ سعدیہ باجی بہت اچھی ہیں لیکن آپ ممی کے پروپوزل کو نظر انداز کر رہے ہیں۔''

فریدہ نے شکایت بھرے انداز میں کہا۔ ''یہ تو تمہارے باپ کی پرانی عادت ہے۔ جب بھی کوئی اچھی بات کرتی ہوں تو یہ اس کی مخالفت ضرور کرتے ہیں۔''

سکندر نے شہریز سے کہا۔ ''تم بھی بچپن سے سعدیہ کو جانتے ہو۔ اب تو وہ اپنے باپ کا پورا بزنس ہینڈل کر رہی ہے۔ سب سے اہم بات یہ کہ احمد جمال نے اپنا بزنس اس کے نام لکھ دیا ہے۔ اگر وہ بہو بن کر آئے گی تو سمجھو کہ اس کا سارا کاروبار ہمارے گھر آجائے گا۔''

شادی کی بات شروع ہوتے ہی شہریز خیالوں کی دنیا میں پہنچ گیا تھا۔ وہاں اسے وہی پردوں کے پیچھے لہرانے والی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی ہتھیلی کی پشت پر وہ سیاہ تل بھی دکھائی دے رہا تھا۔ ایسے وقت وہ اپنے باپ کی باتیں بھی سن رہا تھا۔ پھر یہ سن کر چونک گیا کہ سعدیہ اپنے باپ کے پورے کاروبار کی مالک و مختار بن چکی ہے۔ وہ کاروباری ذہنیت رکھتا

تھا۔ فوراً ہی خیالی حسینہ کو ذہن سے جھٹک کر بولا۔ ''ڈیڈ! جمال انکل کا ایک بیٹا بھی تو ہے؟ کیا بیٹے کا حصہ کاروبار میں نہیں ہوگا؟''

''اس بیٹے کو کاروبار سے ایک ذرا دلچسپی نہیں ہے۔ اس نے کوئی میوزیکل گروپ بنایا ہوا ہے، اور ناچ گانے کے سلسلے میں کتنے ہی ممالک کا دورہ کرتا رہتا ہے۔ احمد جمال نے کاروبار میں اپنے اور بیٹے کے نام تیس فی صد حصہ رکھا ہے۔ باقی ستر فی صد شیئر سعدیہ کا ہے۔ اب تم ہی غور کرو کہ سعدیہ شریکِ حیات بن کر تمہارے زیر اثر آئے گی تو تم اس پر اور اس کے کاروبار پر کس طرح حاوی ہوتے رہا کرو گے۔''

فریدہ نے ناگواری سے کہا۔ ''آپ تو کبھی مجھ پر حاوی نہیں رہے پھر بیٹا سعدیہ پر کیا حاوی رہے گا؟ وہ اپنے باپ کی لاڈلی بیٹی ہے۔ کاروبار کی مالک ہے۔ مجھ سے بھی زیادہ آزاد خیال ہوگی۔ وہ کبھی شہریز کے زیر اثر نہیں رہے گی۔''

سکندر نے اس کی طرف گھور کر دیکھا پھر بیٹے سے کہا۔ ''میں زیادہ بحث نہیں کروں گا۔ یہ شادی تمہیں بہت سے فائدے پہنچائے گی، اگر تم میری بات مان لو گے تو میں اپنا تمام کاروبار تمہارے نام لکھ دوں گا۔''

شہریز نے خوش ہو کر پوچھا۔ ''کیا سچ کہہ رہے ہیں ڈیڈ......؟''

''میں نے کبھی تم سے جھوٹ کہا ہے؟ میرا جو کچھ بھی ہے وہ تمہارا ہی تو ہے۔ جب تمہاری ماں ایک کروڑ کی زمین تمہارے نام کر سکتی ہے تو کیا یہ باپ اپنا کاروبار تمہارے نام نہیں کرے گا۔''

شہریز نے سوالیہ نظروں سے ماں کی طرف دیکھا۔ وہ بولی۔ ''یہ مجھ سے سبقت لے جانے کے لیے تم سے جھوٹ بول رہے ہیں۔ مجھے یقین نہیں آ رہا ہے۔''

''ڈیڈ نے مجھ سے کبھی کوئی جھوٹا وعدہ نہیں کیا۔ ڈیڈ اگر آپ کاروبار میرے نام کریں گے، تب ہی ممی کو یقین آئے گا۔''

وہ کرسی پر ذرا سیدھی ہو کر بولی۔ ''ہاں۔ میں اپنی پسند کی بہو لانا چاہتی تھی لیکن یہ کاروبار تمہارے نام لکھ دیں گے تو میں دستبردار ہو جاؤں گی۔ میں نے تمہارے باپ سے کبھی شکست تسلیم نہیں کی، تمہاری خاطر یہ بھی کر لوں گی۔''

منزل نے اپنے سر کو ایک ہاتھ سے تھام کر کہا۔ ''ممی! میرے سر میں درد ہو رہا ہے مجھ سے اور کھایا نہیں جائے گا۔''

وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ فریدہ نے کہا۔ ''میری ڈریسنگ ٹیبل کی دراز میں سر درد کی گولیاں

ہیں۔ایک لے کر کھالو۔ابھی آرام آجائے گا۔"

"میں ایک گولی کھا کر تھوڑی دیر آرام کروں گی۔"

وہ کھانا چھوڑ کر وہاں سے ڈرائنگ روم میں آئی۔ پھر تیزی سے چلتے ہوئے اپنے بیڈ روم میں پہنچ گئی۔ دروازے کو اندر سے بند کرلیا۔اپنے ہینڈ بیگ میں سے موبائل فون کو نکال کر اسے مسکراتے ہوئے سینے سے لگالیا۔دو بجے کال آنے والی تھی۔

اس نے وال کلاک کو دیکھا دو بجنے والے ہی تھے۔ پھر اس نے فون کو دیکھ کر کہا۔"اب بولو بھی۔ کیا ضروری ہے کہ ٹھیک دو بجے ہی اپنی آواز سناؤ؟ شہر کی تمام گھڑیاں پانچ، دس یا پندرہ منٹ آگے پیچھے چلتی ہیں۔اپنی گھڑی کا کانٹا ذرا آگے بڑھادو......"

وہ گونگا بہرہ فون جیسے اس کی آواز سن رہا تھا اور سمجھ رہا تھا۔ایک دم سے بول پڑا۔اس نے خوش ہو کر ننھی سی اسکرین پر نمبر پڑھے پھر اسے آن کر کے کان سے لگاتے ہوئے کہا۔

"ہیلو۔میں بول رہی ہوں۔"

دوسری طرف سے ایک گہری سانس سنائی دی۔وہ ایک ہائے کے ساتھ بولا۔"ہائے۔ میں بھی بول رہا ہوں۔ اب تک خاموش اور بے زبان تھا۔تمہاری آواز سنتے ہی بولنا آگیا ہے۔"

منزل نے مسکرا کر پوچھا۔"کہاں رہ گئے تھے؟ کب سے انتظار کر رہی ہوں۔ایسا لگ رہا تھا مجھے بھلا کر کہیں بھٹک گئے ہو۔"

"سامنے ایک کے بعد دوسرا راستہ ہو تو آدمی بھٹکتا ہے۔"

وہ خوش ہو کر بولی۔"کیا کر رہے تھے؟"

"کیا کروں گا؟ دوپہر کھانے کے بعد سونے کی عادت تھی۔مگر تم نے تو راتوں کی نیند اُڑادی ہے۔دن کو کیا سو پاؤں گا؟"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔"نیند تو میری بھی اُڑگئی ہے۔"

"میری نیند تو ایسی اُڑی ہے کہ ممی کی لوری سن کر بھی نہیں سوسکوں گا۔ جانتی ہو میں آج بھی کالج کے گیٹ پر دیر تک کھڑا رہا۔"

وہ ہنستے ہوئے بولی۔"تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ آج سنڈے تھا۔کیا میں تمہارے لیے اتوار کو بھی کالج آیا کروں؟"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔"میں کیا کروں؟ سنڈے منڈے میں تو سب کو بھول گیا ہوں۔یہ دل صرف تمہیں یاد رکھتا ہے۔یہ آنکھیں صرف تمہارا دیدار چاہتی ہیں۔"

وہ خوشی سے لہرا کر بولی۔ ''مجھ میں ایسی کیا بات ہے؟''

وہ ایک ہائے کے ساتھ بولا۔ ''ہائے تم سنگِ مرمر کا تاج محل ہو۔ مرمر کر تمہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''ہائے اتنی تعریفیں نہ کرو۔ مغرور ہو جاؤں گی۔''

''میں مغرور ہی تو بنانا چاہتا ہوں۔ تم خوبصورت ہو۔ حسن کی دولت سے مالا مال ہو۔ غرور نہیں کرو گی تو اور کیا کرو گی؟ یہ بتاؤ کب ملاقات ہو گی؟''

وہ سوچتے ہوئے بولی۔ ''وہ...... کل شاید کالج نہ آسکوں۔''

''کیا پاؤں میں مہندی لگاؤ گی؟''

وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ پھر بولی۔ ''کل نائلہ کی منگنی ہے۔''

''منگنی کی رسم عموماً شام کے بعد ہوتی ہے۔''

میں شام سے پہلے نکل آؤں گی۔ اس بہانے ملاقات ہو سکے گی۔''

''اوہ تھینک یو۔ تمہارا نام منزل ہے یہ میری خوش نصیبی ہے کہ منزل میرے پاس آئے گی۔''

''باتیں تو خوب بناتے ہو۔ اب فون بند کر رہی ہوں۔ میں نے سر درد کا بہانہ کیا تھا۔ کوئی بھی طبیعت پوچھنے آسکتا ہے۔''

''او کے منزل! آئی لو یو۔''

منزل نے آئی لو یو کہہ کر رابطہ ختم کر دیا۔ وہ اس فون کو دھڑکن سے لگا کر خیالوں کی اُڑان بھرتی ہوئی اس کے پاس پہنچ گئی۔ ایسے وقت دستک کی آواز نے چونکا دیا۔ اس نے دروازے کی طرف دیکھا پھر فون کو اپنے ہینڈ بیگ میں رکھ کر تیزی سے آگے بڑھ کر دروازے کو کھولا۔ سامنے ماں کھڑی ہوئی تھی۔ اسے تیز نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ دیکھنے کا انداز ایسا تھا کہ دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔

وہ سخت لہجے میں بولی۔ ''سامنے سے ہٹو۔''

وہ ایک طرف ہو گئی۔ فریدہ کمرے کے اندر آ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ اس نے بیڈ کے پاس آ کر تکیے کو اُٹھایا۔ وہاں کچھ نہیں تھا۔ پھر پلٹ کر ڈرائنگ ٹیبل کی طرف دیکھا۔ منزل کا دل سینے میں دھماکے کر رہا تھا۔ فریدہ تیزی سے چلتی ہوئی ٹیبل کے پاس گئی۔ وہاں ہینڈ بیگ رکھا ہوا تھا۔ اس نے اسے کھولا پھر اس میں ہاتھ ڈال کر موبائل فون نکال لیا۔

وہ چور بنی ہوئی تھی۔ فریدہ نے اس فون کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''یہ تمہارے پاس کہاں

سے آیا؟''

وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ ''وہ ممی! آپ مجھے اخراجات کے لیے بہت کچھ دیتی رہتی ہیں۔ میں اس میں سے بچاتی رہتی ہوں۔ اس بچائی ہوئی رقم سے اسے خریدا ہے۔''

فریدہ فون کو آپریٹ کرتے ہوئے بولی۔ ''بہت خوبصورت ہے۔ کون ہے وہ......؟''

منزل نے چونک کر ماں کو دیکھا۔ پھر انجان بن کر پوچھا۔ ''آپ۔ آپ کیا پوچھ رہی ہیں۔''

''دودھ پیتی بچی نہ بنو۔ یہاں اس کا فون نمبر پڑھ رہی ہوں۔ کہو تو ابھی کال کرتی ہوں۔''

وہ تیزی سے چلتی ہوئی قریب آئی پھر خوشامدانہ انداز میں ماں کے ہاتھ کو تھام کر بولی۔ ''نہیں ممی! وہ۔ وہ بے چارا اَپ سیٹ ہو جائے گا۔''

پھر اس سے فون لیتے ہوئے بولی۔ ''میں بتاتی ہوں۔ وہ......اس کا نام شاہ زیب ہے۔''

یہ کہہ کر اس نے منہ پھیر لیا۔ فریدہ نے پوچھا۔ ''آگے بولو......''

''کوئی خاص بات نہیں ہے ممی! ایک تقریب میں ملاقات ہوئی تھی۔ اس سے کچھ خاص جان پہچان نہیں ہے۔''

''اچھا......کوئی خاص جان پہچان نہیں ہے اور تم اسے فون پر آئی لَو یو کہتی ہو؟''

منزل نے ایک دم پلٹ کر اسے دیکھا۔ وہ بولی۔ ''تم نے دروازہ بند کیا تھا، لیکن میں کھڑکی کے پاس کھڑی سب سن رہی تھی۔ سچ سچ بولو۔ اسے کب سے جانتی ہو؟''

وہ سر جھکا کر بولی۔ ''ایک ہفتے پہلے ایک پارٹی میں ملاقات ہوئی تھی۔''

وہ بے یقینی سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''تعجب ہے ایک ہفتے میں ملاقات بھی ہوئی اور محبت بھی ہوگئی؟''

وہ ماں کے گلے میں بانہیں ڈال کر بولی۔ ''ممی! میں آپ کی لاڈلی بیٹی ہوں۔ آپ سے سچ بولتی ہوں۔ وہ ایسا ہی ہے۔ اس نے ایک ہفتے میں مجھے بہت ہی متاثر کیا ہے۔ میں اسے آپ سے ملوانا چاہتی ہوں۔''

وہ ماں کو چوم کر بولی۔ ''پلیز ممی ایک بار ملاقات کرلیں۔ اگر وہ آپ کو اچھا نہیں لگا اور آپ نے مجھے اس سے ملنے سے منع کیا تو پرامس بائی گاڈ......میں اس سے کبھی نہیں ملوں گی۔

''آپ تو جانتی ہیں ناں، میں آپ کی کتنی فرمانبردار ہوں!''

ماں نے مسکرا کر بیٹی کو دیکھا پھر اسے گلے لگا لیا۔

☆======☆======☆

چلمن بھی جوان تھی۔ اس کے دل میں بھی جذبات تھے۔ کسی کو چاہنے اور کسی سے چاہے جانے کے ارمان ہر لڑکی کے دل میں ہوتے ہیں اور ہر ایک کی زندگی میں ایسا کوئی دل دینے والا اور دل لینے والا ضرور آتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض دل والے کھوٹے سکے ثابت ہوتے ہیں۔ یہ تو اپنے اپنے نصیب کی بات ہوتی ہے۔

ہمایوں ایک بینک میں ملازم تھا۔ اسی بینک میں چلمن کا اکاؤنٹ تھا۔ وہ کبھی کبھی رقم جمع کرانے یا نکالنے کے لیے جایا کرتی تھی۔ وہیں اس سے جان پہچان ہوئی تو ہر دوسرے تیسرے روز جانے لگی۔ پھر یہ جان پہچان دوستی میں، بدل گئی۔ اس کو پتا نہ چلا کہ دوستی کس طرح محبت میں بدلتی جارہی ہے۔

وہ ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ چلمن نے کہا۔ ''تم خواہ مخواہ مجھے امیر زادی سمجھ رہے ہو۔ ہم ایک سو اسّی گز کے گھر میں رہتے ہیں۔''

''اور میں صرف اسّی گز کے گھر میں رہتا ہوں۔ تمہارے پاس ایک ایف ایکس اور ایک مہنگی مرسڈیز کار ہے۔ میرے پاس ایک موٹر سائیکل ہے۔ گھر میں ایک ماں ہے۔ ایک جوان بہن ہے۔ ماہانہ تنخواہ آٹھ ہزار روپے ہے۔ میری عمر تیس برس ہے۔ یہی سوچ کر اب تک شادی نہیں کی کہ بیوی اور بچوں کا اضافہ ہوگا تو آٹھ ہزار روپے ماہانہ میں گزارہ کیسے ہوگا؟''

چلمن نے کہا۔ ''اگر چہ ہم ایک سو اسّی گز کے گھر میں رہتے ہیں لیکن ڈیڈی اپنی جائیداد اور بینک بیلنس بڑھانے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ انہوں نے میرے اور میری چھوٹی بہن کے نام سے ایک سو بیس گز کے پلاٹ خرید رکھے ہیں۔ پھر پانچ پانچ لاکھ روپے ہماری شادیوں کے لیے بینک میں فکس ڈپازٹ ہیں۔''

وہ بولا۔ ''جب میرے ابو نے شادی کی تو انہوں نے امی کے گھر سے کوئی جہیز نہیں لیا تھا۔ میں نے بھی عہد کیا ہے جہیز کی لعنت سے پاک رہ کر شادی کروں گا۔''

''میں ڈیڈ سے کہوں گی کہ میرے جو پانچ لاکھ روپے ہیں ان سے جہیز نہ خریدیں۔ دھوم دھام سے شادی نہ کریں۔ تم اسی رقم سے کوئی اچھا سا کاروبار کر سکو گے۔''

''ناک اِدھر سے پکڑو یا اُدھر سے بات تو ایک ہی ہے کہ پانچ لاکھ روپے کا جہیز نہیں ملے گا، وہی رقم نقد مل جائے گی۔ سوری۔ تم کہتی ہو کہ میں رشتہ مانگنے آؤں تو اچھی طرح سن لو، شادی ہوگی تو اپنے گھر سے صرف دو چار جوڑے لاؤ گی اور تمہاری اپنی ضرورت کی کچھ چیزیں

ہوں گی جو تم لاسکو گی۔اس کے علاوہ نہ تو میں تمہارا ایک سو گز کا پلاٹ قبول کروں گا اور نہ ہی کوئی نقد رقم میرے لیے قابلِ قبول ہوگی۔"

"کیسی باتیں کر رہے ہو؟ وہ پانچ لاکھ روپے میرے ہیں۔ وہ زمین میری ہے۔ کیا میں انہیں استعمال کرنے کا حق نہیں رکھتی؟"

"بیشک۔ یہ ساری چیزیں لے کر تم کسی کے بھی گھر جا سکتی ہو لیکن میرے گھر نہیں آ سکتیں۔"

"تم کیسے شخص ہو؟ ترقی کرنے اور آگے بڑھنے کے راستے پر نہیں چلو گے تو جہاں ہو ہمیشہ وہیں رہو گے۔"

"میں جہاں ہوں، وہاں بہت خوش ہوں۔ صبر و استقلال سے گزارا کر رہا ہوں۔ مجھے اپنی صلاحیتوں پر یقین ہے۔ ڈیپارٹمنٹل امتحان دیتا رہوں گا تو ترقی بھی ہوتی رہے گی۔ تنخواہ بھی بڑھتی رہے گی۔ آٹھ ہزار سے دس ہزار پھر بارہ پھر پندرہ ہزار۔ اللہ نے چاہا تو میں کسی اعلیٰ عہدے تک ضرور پہنچوں گا۔"

ایسے وقت منزل اپنے بوائے فرینڈ شاہ زیب کے ساتھ ریسٹورنٹ میں آئی۔ دونوں بہنوں نے ایک دوسرے کو نہیں دیکھا۔ وہ شاہ زیب کے ساتھ دوسری کارنر ٹیبل کے پاس آ گئی۔ انہوں نے وہاں بیٹھ کر اسنیکس اور کولڈ ڈرنک کا آرڈر دیا۔

شاہ زیب نے کہا۔ "تم چھپ چھپ کر ملنا نہیں چاہتیں۔ پیار بھی کرتی ہو اور ڈرتی بھی ہو۔ اس طرح ڈرو گی تو میرا کیا بنے گا؟"

"میں کیا کہوں؟ بس اسی طرح کبھی کبھی موقع ملے گا تو ملنے آ جایا کروں گی۔"

"لیکن میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ روز ملنا چاہتا ہوں۔ صبح ہو یا شام...... دن ہو یا رات...... میں ہر وقت تمہیں اپنی نگاہوں کے سامنے اپنے قریب دیکھنا چاہتا ہوں۔"

وہ سر جھکا کر بولی۔ "ایسی باتیں نہ کرو۔ مجھے کچھ ہونے لگتا ہے۔ پتا ہے ڈرتے ڈرتے بھی چوری پکڑی گئی ہے۔ ممی کو ہمارے افیئر کے بارے میں معلوم ہو چکا ہے۔"

وہ ذرا پریشان ہو کر بولا۔ "یہ کیا کہہ رہی ہو؟ انہیں کیسے معلوم ہو گیا؟"

"کل تم سے فون پر بات کر رہی تھی تو ممی نے چھپ کر سن لیا تھا۔"

"اوہ گاڈ! ان کا ری ایکشن کیا تھا؟"

"ایسے وقت ماں باپ کا ردِ عمل کیا ہوتا ہے، تم سمجھ سکتے ہو۔ پہلے تو وہ بہت ناراض ہوئیں لیکن میں نے انہیں سمجھا منا لیا ہے۔ اب وہ تم سے ملنا چاہتی ہیں۔"

وہ دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام کر بولا۔ ''اوہ مائی گاڈ! کیا میری پٹائی کرانا چاہتی ہو؟''

وہ ہنسنے لگی۔ وہ بولا۔ ''تم ہنس رہی ہو؟ تمہارے ارادے کیا ہیں؟ اپنی ممی کے موڈ اور مزاج کے متعلق تو کچھ بتاؤ؟''

''وہ میری پیاری سی ممی ہیں۔ میں ان کی لاڈلی بیٹی ہوں۔ ویسے ہیں تو بہت غصے والی...... ڈیڈی سے ان کی کبھی نہیں بنتی لیکن مجھ سے بہت بنتی ہے۔ میں ڈیڈی کے خلاف ان کی حمایت میں بولتی رہتی ہوں تو وہ مجھ سے خوش رہتی ہیں۔ میری ہر ضرورت ہر خواہش کو پورا کرتی ہیں۔ اس طرح میں اپنا اُلو سیدھا کرتی رہتی ہوں۔''

''پھر تو تم بہت چالاک ہو۔ مجھے بھی کچھ سکھاؤ۔ میری رہنمائی کرو کہ میں کس طرح تمہارے ڈیڈی اور ممی کا دل جیت سکوں گا؟''

''تم بہ یک وقت دونوں کے دل نہیں جیت سکتے۔ ممی کا دل جیتنے کے لیے لازمی ہے کہ تم مردوں کے خلاف ایک مظلوم بیوی کی حمایت میں جتنا بول سکتے ہو بولتے رہنا۔ وہ تم سے خوش ہو جائیں گی۔''

''بولنے میں تو میں گفتار کا غازی ہوں۔ پہلی ہی ملاقات میں تمہاری ممی کو ایسا متاثر کروں گا کہ وہ میرے ہی گن گاتی رہیں گی۔''

''یہ تو میں جانتی ہوں۔ تم باتوں سے انہیں جیت لو گے۔ ویسے وہ یہ بھی معلوم کرنا چاہیں گی کہ تم کرتے کیا ہو؟ سوسائٹی میں تمہاری حیثیت کیا ہے؟''

وہ سیدھا ہو کر کرسی کی پشت سے ٹک گیا۔ پھر بولا۔ ''ہمارے ملک میں لاکھوں بے روزگار نوجوان ملازمت کی تلاش میں بھٹکتے رہتے ہیں لیکن میں ملازمت نہیں کرنا چاہتا۔ اپنا بزنس کرنا چاہتا ہوں۔''

ویٹر نے اسنیکس اور کولڈ ڈرنکس لا کر رکھیں۔ پھر وہاں سے چلا گیا۔ منزل نے پوچھا۔

''تو پھر کاروبار کیوں نہیں کرتے؟''

''اس کے لیے اچھی خاصی رقم کی ضرورت ہوتی ہے۔ میرے ماں باپ نہیں ہیں۔ دوسرے رشتے دار ہیں لیکن وہ ایسی حیثیت کے لوگ نہیں ہیں کہ مجھے کاروبار کے لیے لاکھوں روپے دے سکیں۔''

''میرے بینک اکاؤنٹ میں پانچ لاکھ روپے رکھے ہیں۔ پھر میرے نام سے ایک سو بیس گز کا پلاٹ بھی ہے۔ اس کی موجودہ قیمت دس لاکھ روپے ہوگی۔''

شاہ زیب کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں۔ وہ بڑی لگن سے اور بڑی چاہت سے منزل کو دیکھ رہا تھا۔ وہ بول رہی تھی۔ ''شادی کے بعد یہ سب کچھ ہمارا ہوگا لیکن اس سے پہلے ممی اور ڈیڈی چاہیں گے کہ تم اپنے پیروں پر کھڑے ہو جاؤ۔''

''میں ابھی تم سے کہہ چکا ہوں، پیروں پر کھڑے ہونے کے لیے مجھے کہیں سے رقم نہیں مل رہی ہے۔ اگر تم اپنی ممی کو سمجھاؤ کہ شادی کے بعد ہم ایک سو بیس گز کے پلاٹ پر مکان تعمیر کریں گے۔ وہاں رہیں گے لیکن جو پانچ لاکھ روپے تمہارے نام سے جمع کیے گئے ہیں۔ ان سے میں اتنا زبردست کاروبار کروں گا کہ تمہارے ممی اور ڈیڈی حیران رہ جائیں گے۔ میرے ذہن میں بڑی زبردست پلاننگ ہے۔''

وہ بولی۔ ''مجھے امید ہے تم ممی کو اپنی پلاننگ سمجھاؤ گے تو تمہیں ضرورت۔ کے مطابق رقم مل جائے گی۔''

''مجھ سے پہلے تم ممی کو سمجھاؤ کہ میں جو بزنس شروع کروں گا۔ وہ دراصل تمہارا ہی ہوگا۔ میں پکے کاغذ پر لکھ کر دوں گا۔ اس نئے بزنس کے سیاہ اور سفید کی مالک و مختار تم ہی ہوگی۔''

دوسری طرف سے چلمن وہاں سے جانے کے لیے ہمایوں کے ساتھ اُٹھ رہی تھی۔ ایسے ہی وقت اس کی نظر دور تک گئی تو چھوٹی بہن نظر آ گئی۔ وہ اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے جوان کو سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگی۔

ہمایوں نے پوچھا۔ ''رک کیوں گئیں؟ چلو......''

وہ بولی۔ ''وہاں میری بہن بیٹھی ہوئی ہے۔ میں اس سے ملنا چاہتی ہوں۔''

یہ کہہ کر وہ اُدھر جانے لگی۔ ہمایوں بھی اس کے ساتھ چلنے لگا۔ اس نے قریب پہنچ کر اسے مخاطب کیا۔ ''منزل......!''

منزل نے سر گھما کر ادھر دیکھا۔ پھر بہن کو دیکھتے ہی اچھل کر کھڑی ہوگئی۔ ذرا گھبرا کر اسے اور ہمایوں کو دیکھنے لگی۔ پھر خود کو سنبھالتے ہوئے بولی۔ ''چلمن! تم۔ تم بھی یہاں انجوائے کرنے آئی ہو؟''

''یہ مسٹر شاہ زیب ہیں۔''

وہ بھی اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ چلمن نے اسے چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا پھر ذرا تیز لہجے میں بہن سے کہا۔ ''گھر چلو۔ میں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔''

وہ بولی۔ ''کیا تم مجھے حکم دے رہی ہو؟ تم بھی اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ آئی ہو۔ میں تو تمہیں کوئی حکم نہیں دے رہی ہوں۔''

چلمن نے کہا۔ ''میں نے مسٹر ہمایوں کو دیکھا ہے پرکھا ہے سمجھا ہے۔ تب یہاں ان کے ساتھ آئی ہوں۔ مگر تم جس کے ساتھ ہو۔ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ تمہیں یاد ہے، میری سہیلی صباحت نے زہر کھایا تھا۔ اسے اسپتال پہنچایا گیا تھا۔ بڑی مشکل سے اس کی جان بچائی گئی تھی۔ جانتی ہو، اس بے چاری کو اسی لڑکے کی بے وفائی اور خودغرضی نے خودکشی پر مجبور کیا تھا۔''

شاہ زیب اپنی کرسی کو ایک طرف کھسکاتے ہوئے ذرا پیچھے ہٹ کر بولا۔ ''یہ۔ یہ کیا الزام تراشی کر رہی ہیں؟ میں کسی صباحت نامی لڑکی کو نہیں جانتا۔ منزل! یہ محترمہ ہیں کون؟ کیوں مجھ پر کیچڑ اچھالنے یہاں آئی ہیں؟''

منزل نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''یہ بدقسمتی سے میری بڑی بہن کہلاتی ہیں۔ دیکھو چلمن! میں تمہارے کسی معاملے میں نہیں بولتی۔ تم بھی میرے معاملے میں نہ بولو۔ چپ چاپ یہاں سے چلی جاؤ۔''

چلمن نے کہا۔ ''میں ایسے جانے والی نہیں ہوں۔ تمہیں ساتھ لے کر جاؤں گی۔ تمہارا اس کم ظرف کے ساتھ رہنا برداشت نہیں کروں گی۔ اگر تم نہیں چلوگی تو میں ابھی ڈیڈی کو فون کرکے یہاں بلاؤں گی۔''

وہ اس دھمکی سے نرم پڑ گئی۔ عاجزی سے بولی۔ ''تم کیوں میرے پیچھے پڑ گئی ہو؟ شاہ زیب کے بارے میں یقیناً تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔''

شاہ زیب نے کہا۔ ''پلیز منزل! میرا مشورہ ہے، تم فوراً اپنی بہن کے ساتھ چلی جاؤ ان کا مزاج بہت گرم ہے۔ یہ ہماری تمہاری عزت کا خیال نہیں کریں گی۔ ہمیں تماشا بنادیں گی۔ میں تمہاری بہت عزت کرتا ہوں۔ تمہیں تماشا نہیں بننے دوں گا۔''

یہ کہہ کر وہ خود ہی وہاں سے جانے لگا۔ منزل نے اسے آواز دی۔ وہ پلٹ کر بولا۔ ''میں ہمیشہ کے لیے نہیں جا رہا ہوں تم سے ملوں گا۔ ضرور ملوں گا۔ پہلے تم اپنی بہن سے نمٹ لو۔''

یہ کہہ کر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ چلمن نے حقارت سے کہا۔ ''اونہہ! بہت بڑا بہروپیا ہے۔ گھر چلو۔ میں اس کی اصلیت تمہیں سمجھاؤں گی۔''

منزل نے ناگواری سے بہن کو دیکھا۔ کچھ کہے بغیر کاؤنٹر پر آئی۔ وہاں بل ادا کیا۔ پھر کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر آکر بیٹھ گئی۔ چلمن نے ہمایوں سے کہا۔ ''مجھے اس کے ساتھ جانا چاہیے۔ تم اپنی بائیک پر چلے جاؤ۔''

وہ اس کی برابر والی سیٹ پر آکر بیٹھ گئی۔ منزل نے کار اسٹارٹ کی پھر ایک جھٹکے سے

آگے بڑھا کر ڈرائیو کرتی ہوئی وہاں سے جانے لگی۔

چلمن نے کہا۔ ”تمہیں غصہ آرہا ہوگا لیکن جب اس کی حقیقت معلوم ہوگی تو یہ مان لوگی کہ میں تمہاری بہن ہوں، کوئی دشمن نہیں ہوں۔ میں نے صباحت کے ساتھ اس کی کئی تصویریں دیکھی ہیں۔اس کے ساتھ گھومتے پھرتے بھی دیکھا ہے۔ وہ مجھے اپنی رازدار سہیلی سمجھتی تھی۔اپنے اور اس کے رومانس کے بارے میں بہت کچھ بتاتی رہتی تھی۔“

منزل جیسے کچھ سن نہیں رہی تھی۔ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے تیز رفتاری سے ڈرائیو کر رہی تھی۔ چلمن کہہ رہی تھی۔ ”اب میں تم سے کیا کہوں؟ تمہاری بڑی بہن ہوں۔ کھل کر بول نہیں سکتی۔ شاہ زیب نے اسے منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا ہے۔ صباحت نے اسی کی خاطر اپنے باپ کے سیف سے دو لاکھ روپے چوری کیے تھے۔ وہ اس کے پیار میں پاگل ہوگئی تھی۔ شاہ زیب نے کہا تھا کہ اسے کاروبار کے لیے رقم کی ضرورت ہے۔ جب اسے دو لاکھ روپے مل گئے تو وہ اس کی زندگی سے دور چلا گیا۔ وہ بے چاری چھ ماہ تک اس کا انتظار کرتی رہی۔ جلتی کڑھتی رہی۔ صدمے سے دوچار ہوتی رہی۔ پھر اس نے خودکشی کرلی۔“

وہ بولتے بولتے چپ ہوگئی۔ یہ سمجھ گئی کہ بہن ایک کان سے سن رہی ہے اور دوسرے کان سے نکال رہی ہے۔ محبت میں انسان اندھا ہو جاتا ہے۔ وہ سچ مچ اندھی ہوگئی تھی۔

گھر کے سامنے پہنچ کر اس نے گاڑی روک دی۔ جب سے شہریز کے لیے مرسیڈیز آئی تھی۔تب سے وہ مہنگی کار اندر گیرج میں رہتی تھی اور اس سستی کھٹارا گاڑی کو باہر ہی رکھا جاتا تھا۔

سکندر بخت بہت خوش تھا کہ اس نے فریدہ کو نہ سہی اس کی گاڑی کو گھر سے باہر نکال دیا ہے۔

منزل پاؤں پٹکتی ہوئی گھر کے اندر آئی۔ چلمن بھی اس کے پیچھے پیچھے وہاں چلی آئی۔ فریدہ ڈرائنگ روم میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے دونوں بیٹیوں کو دیکھا پھر منزل سے پوچھا۔ ”تمہارا موڈ کیوں خراب ہے؟“

وہ پیر پٹک کر بولی۔ ”ممی! چلمن نے آج میری بہت انسلٹ کی ہے۔اس نے بھرے ریسٹورنٹ میں شاہ زیب کو فراڈ کہا ہے۔ ہمیں تماشا بنایا ہے۔“

فریدہ نے صوفے سے اٹھتے ہوئے چلمن کو گھور کر دیکھا۔ پھر سخت لہجے میں پوچھا۔ ”کیا یہ سچ کہہ رہی ہے؟“

وہ بولی۔ ”ہاں میں نے فراڈ کو ہی فراڈ کہا ہے۔ یہ شاہ زیب کی اصلیت نہیں جانتی۔

اس سے دھوکا کھا رہی ہے۔"

وہ ماں کو اس کے بارے میں بتانے لگی۔ اس نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیا ایک لڑکی نے شاہ زیب کی وجہ سے خودکشی کرلی؟"

منزل نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "ممی! یہ جھوٹ بول رہی ہے۔ ادھر ریسٹورنٹ میں کہہ رہی تھی کہ صباحت نے خودکشی کرنے کی کوشش کی تھی۔ اسے اسپتال پہنچایا گیا تھا۔ بڑی مشکل سے جان بچائی گئی تھی اور یہاں آکر کہہ رہی ہے کہ شاہ زیب کی بے وفائی اور خود غرضی کے باعث وہ لڑکی جان دے چکی ہے۔ یہ صرف باتیں بنا رہی ہے۔ میرے ساتھ ایک خوبرو اسمارٹ نوجوان کو دیکھ کر جل بھن گئی ہے۔ میں نے بھی اس کے ساتھ اس کے بوائے فرینڈ کو دیکھا ہے۔ بہت ہی معمولی سے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ غریب غریب سا لگ رہا تھا۔ یہ شاہ زیب کو دیکھ کر احساس کمتری میں مبتلا ہوگئی ہے۔"

فریدہ نے چلمن سے پوچھا۔ "تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ شاہ زیب نے کسی صباحت نامی لڑکی سے فراڈ کیا ہے؟"

"ممی! اس نے مجھے راز دار بنایا تھا۔ اپنے اور شاہ زیب کے بارے میں بہت کچھ بتاتی رہتی تھی۔ میں نے ان کی تصویریں بھی دیکھی ہیں۔ انہیں ایک ساتھ گھومتے پھرتے بھی دیکھا ہے۔"

"کیا تم ان دونوں کی کوئی تصویر دکھا سکتی ہو؟"

"تصویر تو کوئی نہیں ہے جب وہ اس کے دو لاکھ لے کر فرار ہوگیا اور وہ چھ ماہ تک انتظار کرتی رہی تو اس نے ان تصویروں کو جلا ڈالا تھا۔"

منزل نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "بہت خوب...... کسی ثبوت کے بغیر ہی اسے فراڈ کہہ رہی ہو۔"

وہ تیز لہجے میں بولی۔ "وہ فراڈ ہے۔"

ماں نے انہیں گھور کر دیکھا پھر منزل سے کہا۔ "تم خاموش رہو مجھے اپنے طور پر معلومات حاصل کرنے دو۔"

پھر اس نے چلمن سے پوچھا۔ "تصویری ثبوت نہ رہے لیکن اس کے گھر والوں کو تو معلوم ہوگا کہ وہ شاہ زیب سے محبت کرتی تھی اور اس سے دھوکا کھا چکی تھی؟"

چلمن نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔ "نہیں صباحت نے یہ بات سب سے چھپائی تھی۔ صرف مجھے بتایا کرتی تھی۔"

منزل نے ناگواری سے بہن کو دیکھا وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ ماں نے ایک ہاتھ سے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا پھر بڑی بیٹی سے کہا۔ ’’گھر کے لوگ نہ سہی، باہر کسی دوسری سہیلی کو یا کسی فرد کو ان کے میل جول کے بارے میں کچھ تو معلوم ہوگا؟‘‘

’’نہیں ممی! وہ بے چاری بدنامی سے بہت ڈرتی تھی۔ اس کو چھپ چھپ کر ملتی تھی۔‘‘

فریدہ نے ناگواری سے کہا۔ ’’کیا بکواس کر رہی ہو؟ اگر وہ چھپ چھپ کر ملتی تھی تو اس کے ساتھ تصویریں کیسے اتر واتی تھی؟‘‘

منزل نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ’’ممی! یہ سراسر کہانی گھڑ رہی ہے۔ کبھی کہتی ہے خودکشی کرنے والی تھی۔ اسے بچایا گیا۔ کبھی کہتی ہے کہ خودکشی کر کے جان دے دی۔ پتا نہیں وہ کتنے عرصے تک عشق کرتی رہی اور اس بات کا علم نہ اس کے گھر والوں کو ہوا، نہ ہی کسی سہیلی کو ہوا۔ اگر ہوا تو صرف ہماری ان بہن صاحبہ کو ہی ہوا۔‘‘

فریدہ نے غصے سے چلمن کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ’’صاف پتا چل رہا ہے کہ تم من گھڑت باتیں سنا رہی ہو۔ یہ بھی کوئی یقین کرنے والی بات ہے کہ صباحت نے شاہ زیب کو دو لاکھ روپے دینے کے لیے اتنی بڑی رقم چرائی اور کسی کو پتا ہی نہ چلا؟ کسی نے ان کی تصویریں بھی نہیں دیکھیں؟ انہیں کبھی کہیں ملتے جلتے نہیں دیکھا؟ تمہیں شاہ زیب پر کیچڑ اچھال کر کیا ملا؟ بھرے ریسٹورنٹ میں تم نے اپنی ہی بہن کی انسلٹ کی، تمہیں ذرا بھی شرم نہیں آئی؟‘‘

چلمن نے ناگواری سے بہن کو دیکھا۔ وہ بولی۔ ’’ممی! آپ اس کی اندھی حمایت کر رہی ہیں۔ کیا میں اس کی دشمن ہوں؟ سگی بہن نہیں ہوں؟‘‘

’’بعض سگی بہنیں دشمنوں سے بدتر ہوتی ہیں۔ یہ میری حمایت کرتی رہتی ہے۔ تمہارے باپ کی غلطیوں کی اور زیادتیوں کی نشان دہی کرتی رہتی ہے، میری ہاں میں ہاں ملاتی ہے تو تم اپنے باپ کی اندھی حمایت میں اس سے دشمنی کرنے لگی ہو۔ ایک ہی چھت کے نیچے باپ سے مل کر ایسی محاذ آرائی کر رہی ہو، جیسے یہ گھر نہ ہو...... میدانِ جنگ ہو۔‘‘

سکندر بخت دروازے پر کھڑا ان کی باتیں سن رہا تھا۔ اندر آتے ہوئے بولا۔ ’’ہماری بیٹیاں محاذ آرائی نہیں کر رہی ہیں۔ اس گھر کو انہوں نے نہیں...... ہم نے میدانِ جنگ بنا رکھا ہے۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں، ہماری آپس کی لڑائی کے نتیجے میں بچوں کے درمیان اختلافات پیدا ہو رہے ہیں۔ اپنے جھگڑوں سے اتنی فرصت نہیں ملتی کہ ہم بچوں پر توجہ دے سکیں۔ یہ کیا پڑھتے لکھتے ہیں؟ کہاں جاتے ہیں؟ کس سے ملتے ہیں؟ کیسی غلطیاں کر رہے ہیں؟ ہم

والدین ہوکر اپنے بچوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔''

فریدہ نے کہا۔''اب آپ چلمن کی حمایت میں یہ کہنے آئے ہیں کہ منزل چھوٹی ہے، اس سے غلطیاں ہوتی رہتی ہیں۔آپ کی بیٹی بہت پارسا ہے اور اگر ہے تو اس سے پوچھیں، آج یہ کس کے ساتھ ریسٹورنٹ گئی تھی؟''

وہ بولا۔''فریدہ بیگم! اس بات پر ہم دونوں کے سر کو جھکنا چاہیے کہ ہماری بیٹیاں اپنے اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ ریسٹورنٹ گئی تھیں لیکن جہاں تک چلمن کا تعلق ہے، یہ مجھ سے پوچھ کر گئی تھی۔اس نے بتایا ہے کہ یہ ہمایوں نامی ایک جوان کو اپنا لائف پارٹنر بنانا چاہتی ہے۔اس سلسلے میں آج ضروری باتیں کرنے کے بعد وہ چلمن بیٹی کا رشتہ مانگنے یہاں آئے گا۔''

فریدہ نے ایک طرف سے دوسری طرف جاتے ہوئے کہا۔''آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میری بیٹی بھی مجھ سے پوچھ کر گئی تھی۔ میں نے اسے کہا تھا، شاہ زیب سے ملے اور اسے یہ پیغام دے کہ میں اس سے ملنا چاہتی ہوں۔''

چلمن نے کہا۔''ڈیڈ! میں سچ کہتی ہوں وہ ایک دھوکے باز بہروپیا ہے۔ یہ میری بدقسمتی ہے کہ میرے پاس اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے لیکن میں نے اپنی آنکھوں سے اسے صباحت کے ساتھ دیکھا ہے۔ اپنی ان آنکھوں سے ان کی تصویریں دیکھی ہیں۔ وہ میری بہت اچھی سہیلی تھی۔ مجھے ساری باتیں بتایا کرتی تھی۔''

وہ اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولا۔''میں تم پر بھروسا کرتا ہوں۔تم نے کبھی مجھ سے جھوٹ نہیں بولا۔اس کے خلاف کوئی ثبوت، کوئی گواہ نہیں ہے، تب بھی تمہاری ماں اور بہن کو اس بات کا یقین کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ ہم سب سگے ہیں نہ کہ سوتیلے اور نہ ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے والے دشمن ہیں۔اس سلسلے میں مزید بحث کرنا فضول ہے۔ میں اپنے طور پر اس لڑکے کے بارے میں معلومات حاصل کروں گا۔مجرم اپنا چہرہ ضرور چھپاتے ہیں لیکن مجھے بے نقاب کرنا آتا ہے......چلمن! تم اپنے کمرے میں جاؤ۔''

وہ وہاں سے جانے لگی۔ سکندر بخت کا کمرا اوپری منزل پر تھا۔ وہ بھی اُدھر جانے لگا۔ منزل نے پریشان ہوکر کہا۔''ممی! ڈیڈ چلمن کی حمایت کرتے رہتے ہیں۔ وہ اپنی بیٹی کی بکواس کے مطابق تحقیقات کریں گے اور شاہ زیب کو خواہ مخواہ جھوٹا اور فریبی ثابت کریں گے۔''

ماں نے اسے تھپکتے ہوئے کہا۔''تمہیں پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ میں ابھی زندہ ہوں۔ اپنے طور پر معلومات حاصل کروں گی اور شاہ زیب سے بھی ملاقات کروں گی۔ تمہارے ڈیڈی تو ساری زندگی سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ کرتے آئے ہیں۔ میں ان کی ایک

نہیں چلنے دوں گی۔''

وہ ''اونہہ'' کہہ کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

☆======☆======☆

شہریز دو پاٹوں کے بیچ آ گیا تھا۔ ایک طرف وہ خیالوں میں آنے والی البیلی دوشیزہ جو صاف دِکھتی بھی نہیں تھی سامنے آتی بھی نہیں تھی۔

دوسری طرف سعدیہ تھی۔ جو کروڑوں کا بزنس لیے بیٹھی تھی اور اس کی توجہ کو پکار رہی تھی۔ ''چلے بھی آؤ کہ کروڑوں کا کاروبار چلے......''

زندگی دولت اور شان و شوکت چاہتی ہے۔ یہ نہ ہو تو پھر وہ ایک بھکاری کی طرح ہاتھ پھیلائے قبر تک پہنچ جاتی ہے۔ وہ بھکاری نہیں تھا، لیکن سعدیہ کو شریکِ حیات بنا کر مزید دولت اور شان و شوکت حاصل کر سکتا تھا۔

دوسری طرف نجومی کی یہ بات ذہن میں نقش ہو گئی تھی کہ جس کی ہتھیلی کی پشت پر سیاہ تل ہو گا وہی بہترین لائف پارٹنر ثابت ہو گی۔

اس کے خیالات دونوں طرف بھٹک رہے تھے۔ سعدیہ کو شریکِ حیات بنائے یا اس سیاہ تل والی کا انتظار کرے جو بہترین لائف پارٹنر ثابت ہونے والی تھی؟

سعدیہ ایک روشن راستے کی طرح اس کے سامنے بچھی ہوئی تھی۔ اس راستے پر کامیابی اور ترقی یقینی تھی۔ دوسرا راستہ دُھند میں لپٹا ہوا تھا۔ خیالی دنیا میں رہنے والے عاشقوں کے لیے بڑا ہی پُرکشش تھا۔ ایک جواری کی طرح زندگی کو داؤ پر لگانے والی بات تھی کہ وہ کبھی زندگی میں آئے گی تو اس کی قسمت چمک جائے گی۔

لیکن یہ بات بھی واضح نہیں تھی کہ وہ سیاہ تل والی دولت مند ہو گی اور دولت کے ذریعے قسمت چمکائے گی۔ ہو سکتا ہے، صرف محبت کے ذریعے خوشحالی دینے آئے۔ ایسی خالی محبت سے ملنے والی خوش حالی کبھی پائیدار نہیں ہوتی۔

وہ خیالوں میں آنے والی کو ذہن سے جھٹکنے لگا۔ دوسرے دن اس نے احمد جمال سے ملاقات کی۔ اس نے گرمجوشی سے اس کا استقبال کیا۔ گلے لگاتے ہوئے کہا۔ ''سنا ہے تم نے آتے ہی باپ کا کاروبار سنبھال لیا ہے؟''

''صرف سنبھالا نہیں بلکہ وہ کاروبار اب میرے نام ہو رہا ہے۔ سارے کاغذات تیار ہو چکے ہیں۔''

''بھئی۔ یہ تو کمال ہی ہو گیا۔ تم بڑی تیزی سے میدان مار رہے ہو۔''

''انکل! جب آپ اپنا کاروبار بیٹی کے نام لکھ سکتے ہیں تو کیا ڈیڈ اپنے بیٹے کے نام نہیں لکھ سکتے ؟''

''بے شک، لیکن تمہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ میں نے ہی سکندر بخت کو اکسایا تھا۔ وہ تمہارے لے سعدیہ کا رشتہ مانگ رہا تھا۔ میں نے کہا کہ شرط یہی ہے، کاروبار پہلے بیٹے کے نام ہونا چاہیے۔''

''شکریہ انکل! آئندہ بھی آپ کی حمایت سے بہت کچھ حاصل کرتا رہوں گا۔ بائی داوے۔ سعدیہ کہاں ہے؟''

''وہ بھی تم سے ملنا چاہتی تھی۔ مگر اچانک ہی آج صبح کی فلائٹ سے اسلام آباد جانا پڑا۔ ایک بہت بڑی بزنس ڈیل ہو رہی ہے۔ تین یا چار دنوں میں واپس آسکے گی۔''

اسے سعدیہ سے کم اور اس کے کاروبار سے زیادہ دلچسپی تھی۔ وہ احمد جمال سے کاروباری سلسلے میں باتیں کرنے لگا۔ باتوں باتوں میں یہ کریدنے لگا کہ ان کے کاروبار کی پوزیشن کیا ہے اور سعدیہ کس طرح اسے ہینڈل کر رہی ہے؟

وہ کئی گھنٹوں تک باتیں کرتا رہا پھر احمد جمال کے ساتھ لنچ کرنے کے بعد اپنے ہیڈ آفس واپس آیا تو سکندر بخت نے مسکرا کر پوچھا۔ ''ملاقات کیسی رہی؟''

وہ ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے بولا۔ ''ادھوری رہی۔ کیونکہ سعدیہ نہیں تھی۔ اسلام آباد گئی ہوئی ہے۔''

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''اسلام آباد جائے یا دنیا کے آخری سرے پر جائے۔ اسے تم زنجیریں پہنانے والے ہو۔ یہ طے ہو چکا ہے۔''

''ہاں۔ میں نے جمال انکل کی باتوں سے اندازہ لگایا ہے، وہ اس ہونے والے رشتے سے خوش بھی ہیں اور مطمئن بھی......''

جیسا کہ میں نے تم سے کہا تھا، ہمیں ایک لیڈی سیکرٹری اور ایک اکاؤنٹینٹ کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں کل کے اخبار ہمارا اشتہار شائع کریں گے۔ پرسوں سے درخواستیں موصول ہوں گی۔ تم ضرورت مند امیدواروں کے انٹرویو لو گے اور ان میں سے سلیکٹ کرو گے۔''

وہ اپنے بزنس کے سلسلے میں باتیں کرنے لگے۔ سکندر اسے کاروبار کے اندرونی اور اہم راز بتانے لگا۔ وہ توجہ سے سن رہا تھا اور اہم باتوں کو ذہن میں نقش کر رہا تھا۔ ایسے وقت یہ بات ذہن میں تھی کہ سعدیہ کے بھی کاروباری اہم راز ہوں گے۔ جنہیں وہ ابتدا میں چھپانے

کی کوشش کرتی رہے گی۔ ویسے جب وہ اسے سر سے پیر تک جیت لے گا، تب اس کا کوئی راز راز نہیں رہے گا۔ وہ کھلی کتاب کی طرح ایک ایک ورق سامنے لے آئے گی۔

تیسرے دن سعدیہ کی واپسی کی توقع تھی لیکن مصروفیات کے باعث، وہ نہ آسکی۔ اس نے فون پر مخاطب کیا۔ ''ہیلو شہریز! میں سعدیہ بول رہی ہوں۔''

وہ مسکرا کر بولا۔ ''میں اتنا خوف ناک ہوں کہ میرے یہاں آتے ہی تم اسلام آباد بھاگ گئی ہو؟''

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ''تقریباً سات برس پہلے تمہیں دیکھا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد نہیں ہے کہ تم خوفناک ہو یا نہیں؟ یہ تو ملاقات ہونے پر ہی معلوم ہوگا۔ بابا نے بتایا ہے تم ہمارے دفتر آئے تھے۔ یہ سن کر خوشی ہوئی کہ تم خاص طور پر مجھ سے ملنے آئے تھے۔''

''تمہیں سن کر خوشی ہوئی اور مجھے تمہارے دروازے پر جا کر مایوسی ہوئی۔''

''کوئی بات نہیں۔ بس میں دو دنوں میں واپس آرہی ہوں۔''

وہ دونوں بڑی اپنائیت سے باتیں کرتے رہے۔ اس کے خیالوں میں آنے والا وہ سیاہ تل بالکل ہی مٹ گیا۔ سعدیہ سے باتیں کرنے کے بعد اس کی عقل نے یہی سمجھایا کہ اسے ٹھوس عملی زندگی گزارنا چاہیے۔ خیالوں کی دنیا میں جینے والے احمق ہوتے ہیں۔

نجومی نے دعویٰ کیا تھا کہ اس کی پیش گوئی سو فی صد درست ہوتی ہے۔ شہریز کی زندگی میں ایسی لڑکی آئے گی۔ جس کی ہتھیلی کی پشت پر سیاہ تل ہوگا۔

دوسری صبح انٹرویو کے لیے بہت سے امیدوار آئے تھے۔ ان میں لڑکیاں بھی تھیں اور لڑکے بھی۔ انہیں باری باری انٹرویو کے لیے آفس بلایا جا رہا تھا۔ شہریز اپنی بڑی سی میز کے پیچھے ریوالونگ چیئر پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے آس پاس جنرل منیجر، آفس انچارج اور فیکٹری انچارج وغیرہ بیٹھے ہوئے تھے اور امیدواروں سے طرح طرح کے سوالات کر رہے تھے۔

جنرل منیجر نے ایک درخواست پڑھتے ہوئے کہا۔ ''یہ ایک لڑکی سمیرا چوہدری کا بائیوڈیٹا ہے اس نے انگلش لٹریچر میں ایم اے کیا ہے اور ایک بہت بڑے انسٹیٹیوٹ سے کمپوٹر کا کورس مکمل کیا ہے۔''

شہریز نے کہا۔ ''اسے بلایا جائے۔''

مس سمیرا چوہدری کو کال کی گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک نوجوان لڑکی دروازہ کھول کر اندر آئی۔ ہر امیدوار اپنے ساتھ ایک فائل ضرور لاتا تھا۔ اس فائل میں اس کی تعلیمی اسناد اور

دیگر ضروری کاغذات ہوتے تھے لیکن وہ لڑکی خالی ہاتھ تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ لباس پر کہیں کہیں گرد جمی ہوئی تھی۔

وہ شہریز کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ ''سر! میں سمیرا چوہدری ہوں۔ ابھی انٹرویو کے لیے آ رہی تھی تو ایک گاڑی سے ٹکرا کر گر پڑی۔ مجھے کچھ ہوش نہ رہا کہ میرے ساتھ کیا ہوا ہے اور میں کہاں پہنچائی گئی ہوں؟ آنکھ کھلی تو خود کو اسپتال میں پایا۔ ڈاکٹر نے کہا کہ گھبرانے کی بات نہیں ہے اتنا بڑا حادثہ نہیں جتنی میں دہشت زدہ ہوگئی تھی۔''

وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ ''لیکن اس حادثے میں بڑا نقصان یہ ہوا کہ میری تعلیمی اسناد کی فائل نہ جانے کہاں گم ہوگئی؟

اس نے بایاں ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ دیکھیں! ڈاکٹر نے اس ہاتھ کی مرہم پٹی کی ہے۔''

اس کی کلائی سے کہنی تک پٹی بندھی ہوئی تھی لیکن ہتھیلی کی پشت پر نظر پڑتے ہی شہریز ایک دم سے چونک گیا۔ بے اختیار اٹھ کھڑا ہوگیا۔ وہ ننھا سا سیاہ تل اسے پکار رہا تھا۔ ''لو۔ یہ آگئی۔ جسے خیالوں سے نکال رہے تھے۔ وہ جیتی جاگتی زندگی میں آگئی......''

جنرل منیجر اور وہاں بیٹھے ہوئے دوسرے افراد نے شہریز کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اس کے اچانک اٹھنے کا انداز ایسا تھا کہ سمیرا چوہدری سہم کر ذرا پیچھے ہوگئی۔ پھر بولی۔ ''سوری سر! مجھے آپ کے اتنے قریب نہیں آنا چاہیے تھا۔''

وہ بولا۔ ''نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ تم حادثے سے دوچار ہوئی ہو۔ تمہیں بیٹھنا چاہیے۔ بیٹھ جاؤ۔''

وہ ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ شہریز نے اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے ...... جنرل منیجر اور دوسرے افراد کو دیکھا پھر کہا۔ ''سیکرٹری کے لیے مس سمیرا چوہدری کو ڈن کیا جائے۔ باقی اکاؤنٹینٹ کے لیے جتنے بھی امیدوار ہیں۔ آپ انہیں کانفرنس روم میں بلائیں۔ ان کے انٹرویو کریں اور کسی بہت ہی قابل امیدوار کا انتخاب کرلیں۔''

سمیرا نے کہا۔ ''جسٹ اے منٹ سر! آپ نے میرا انٹرویو نہیں کیا؟ کوئی سوال نہیں کیا؟ میرے کاغذات نہیں دیکھے؟ میرے حادثے سے اتنے متاثر ہوئے کہ مجھے فوراً یہ ملازمت دے دی۔ آپ کی مہربانی کا بہت بہت شکریہ لیکن میں یہاں جاب نہیں کروں گی۔''

شہریز نے کہا۔ ''تم ملازمت کے لیے آئی ہو اور اب یہاں کام کرنے سے انکار کر رہی ہو۔ کوئی پرابلم ہے؟''

وہ سر جھکا کر بولی۔ ''میں نیک اور بدشگون کو مانتی ہوں۔ یہاں ملازمت کے لیے آنے سے پہلے حادثے سے دوچار ہوگئی۔ یہ بدشگونی ہے۔ آپ کسی دوسرے ضرورت مند کو یہ ملازمت دیں۔ میں کام نہیں کروں گی۔''

شہریز نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر جنرل منیجر کو دیکھا۔ پھر کہا۔ ''آپ حضرات جائیں اور لیڈی سیکرٹری کے لیے انٹرویوز کریں۔''

وہ سب اٹھ کر وہاں سے چلے گئے۔ سمیرا نے پوچھا۔ ''میں بھی جاؤں؟''

''ابھی نہ جاؤ۔ میں تمہارے بارے میں بہت کچھ معلوم کرنا چاہتا ہوں۔''

''آپ میرے بارے میں کیا معلوم کریں گے؟ میں ایک بدنصیب لڑکی ہوں۔ اگرچہ کروڑوں کی مالک ہوں لیکن فی الوقت پیسے پیسے کی محتاج ہوں۔ ڈیڈی میرے سوتیلے بیٹے کو اہمیت دیتے ہیں۔ انہوں نے مجھے اور میری ماں کو چھوڑ دیا ہے۔ وہاں لندن میں رہتے ہیں۔ ان کی دوسری بیوی مرچکی ہے اور جس بیٹے کی خاطر انہوں نے مجھے نظر انداز کیا ہے، وہ کینسر کا مریض ہے۔ اب تب کا مہمان ہے۔ ممی پورے یقین سے کہتی ہیں کہ ڈیڈی کی تمام دولت اور جائیداد مجھے ہی ملے گی۔ خدا جانے کب ملے گی؟ میں اپنے باپ پر بھی بھروسا نہیں کرتی اس لیے ملازمت کرنے نکلی ہوں۔''

شہریز کی توجہ اس کی بائیں ہتھیلی کی پشت پر تھی۔ اس نے پوچھا۔ ''کیا میں تمہارا ہاتھ دیکھ سکتا ہوں؟''

وہ تعجب سے بولی۔ ''کیا آپ ہاتھ دیکھنا جانتے ہیں؟'' پھر وہ اپنا بایاں ہاتھ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''عورتوں کا بایاں ہاتھ دیکھا جاتا ہے ناں؟''

''ہاں۔ مگر میں تمہارے ہاتھ کی لکیریں نہیں، یہ جو اس کی پشت پر تل ہے اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔''

اس نے ہتھیلی کو پلٹ کر اس تل کو دیکھا پھر آہستگی سے اپنی انگلیاں پھیرتے ہوئے بولا۔ ''یہ تل کب سے ہے؟''

''جب سے پیدا ہوئی تب سے ہے۔''

''لیکن میں اسے پچھلے چھ برس سے دیکھتا آرہا ہوں۔ کبھی خوابوں میں کبھی خیالوں میں......''

''کیا آپ مجھے خوابوں اور خیالوں میں دیکھتے رہے ہیں؟''

''ہاں۔ کیا تم نے مجھے کبھی دیکھا ہے؟''

''میرے خیالوں میں آپ جیسا ایک قد آور جوان آتا ہے لیکن مجھے اس کا چہرہ دکھائی نہیں دیتا۔''

وہ جلدی سے بولا۔''میرے ساتھ بھی یہی ہوتا رہا ہے۔ میں تمہیں دیکھتا ہوں۔ مگر کبھی تمہارا چہرہ دکھائی نہیں دیا۔''

وہ بولی۔''ایک نجومی نے مجھ سے کہا تھا کہ جو بھی شخص میرے سامنے آکر میرے بائیں ہاتھ کو تھام لے گا وہی میرا بہترین لائف پارٹنر ہوگا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ ایسا ہوگا۔''

''تمہیں امید کیوں نہیں تھی۔''

''اس لیے کہ ہم مصافحہ کرنے کے لیے ایک دوسرے کا دایاں ہاتھ تھامتے ہیں۔ ساری دنیا میں یہی دستور ہے۔ کوئی بھی کسی کا بایاں ہاتھ نہیں پکڑتا۔''

''مجھے بھی نجومی نے کہا تھا کہ جس لڑکی کی بائیں ہتھیلی کی پشت پر سیاہ تل ہوگا، وہی میری بہترین لائف پارٹنر ثابت ہوگی۔ دیکھو! کتنا حسین اتفاق ہے کہ تمہارے نجومی کی پیش گوئی کے مطابق میں نے تمہارا بایاں ہاتھ تھام لیا ہے۔''

سمیرا نے شرما کر سر جھکا لیا۔ پھر جلدی سے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے ہچکچا کر کہا۔''یہ عجیب بات ہے کہ پہلی ملاقات میں بھی محبت کا اظہار نہیں کیا جاتا اور نہ لائف پارٹنر بننے والی بات کی جاتی ہے۔ مگر ہم ایسا کر رہے ہیں۔''

''ہمارے مقدر میں یہی لکھا ہے۔ ہمیں لائف پارٹنر بننا ہے۔''

''پلیز۔ ایسی باتیں نہ کریں۔ آپ بہت اچھے ہیں لیکن ابھی میں آپ کو جانتی نہیں ہوں۔''

''میں بھی تو نہیں جانتا، لیکن آج تم سے مل کر مقدر کو اور اور نجومی کی پیش گوئی کو مان گیا ہوں۔ تمہیں بھی مان لینا چاہیے۔''

سمیرا نے جھکی جھکی نظروں سے مسکرا کر اسے دیکھا پھر کہا۔''آپ اپنے بارے میں مجھے زیادہ سے زیادہ بتائیں۔ میں بھی اپنے متعلق بہت کچھ بتاؤں گی۔ ایک دوسرے کو اچھی طرح جاننے کے بعد ہم کسی بہتر نتیجے پر پہنچیں گے۔''

وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔''تو پھر یہاں سے اٹھو۔ ہم آؤٹنگ کے لئے جائیں گے۔ لمبی ڈرائیو ہوگی اور باتیں بھی ہوتی رہیں گی۔''

پہلی ہی ملاقات میں بیٹھے بیٹھے دوستی ہوگئی۔ پھر باہر گھومتے پھرتے محبت بڑھنے لگی۔ شہریز یہ یقین کرنا چاہتا تھا کہ واقعی سمیرا کا باپ کروڑ پتی ہے اور اس کا بھائی لندن میں زیر

لاعلاج ہے اور قریب المرگ ہے۔

سمیرا اسے یقین دلانے کے لئے اپنے چھوٹے سے بنگلے میں لے آئی۔ وہاں ایک کمرے میں کمپیوٹر رکھا ہوا تھا وہ اسے آپریٹ کرنے لگی۔ انٹرنیٹ کے ذریعے لندن میں اپنے باپ سے رابطہ کرنے لگی۔ کمپیوٹر کے ساتھ ایک کیمرا بھی تھا۔ وہاں بھی ایسا سسٹم تھا۔ رابطہ ہونے پر دونوں طرف سے وہ ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ اسکرین پر سمیرا کا بیمار بھائی دکھائی دے رہا تھا۔ وہ لندن کے ایک اپارٹمنٹ میں تھا۔ اپنے بیڈ کے قریب کمپیوٹر کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔

سمیرا نے پوچھا۔ ''جواد! کیسے ہو؟''

اس کے چہرے پر آزردہ سی مسکراہٹ ابھری۔ وہ بولا۔ ''جانتی ہو پھر پوچھتی ہو۔ زندگی میرے ساتھ مذاق کر رہی ہے۔ نہ میرا ساتھ دیتی ہے اور نہ ہی پیچھا چھوڑتی ہے ویسے یہ بات یقینی ہے کہ میں اگلے ماہ پچیس دسمبر کو کرسمس ڈے نہیں دیکھ سکوں گا۔''

سمیرا نے کہا۔ ''ایسی باتیں نہ کرو۔ کبھی کبھی معجزہ ہو جاتا ہے۔ اللہ نے چاہا تو تم سلامت رہو گے۔ یہ بتاؤ ڈیڈی کہاں ہیں؟''

''کسی کام سے گئے ہوئے ہیں۔ ایک آدھ گھنٹے میں آجائیں گے۔''

''جواد! ان سے ملو......''

اسکرین پر جواد نے شہریز کو دیکھا۔ اور شہریز نے اِدھر سے اسے دیکھا۔ سمیرا نے کہا۔ ''یہ مسٹر شہریز بخت ہیں۔ آج میں ان کے پاس جاب کے لئے گئی تھی۔''

جواد نے چونک کر پوچھا۔ ''تم جاب کے لیے گئی تھیں؟ کیوں گئی تھیں؟ تمہارے پاس کس چیز کی کمی ہے؟ مانا ڈیڈی تمہاری ممی سے ناراض ہیں لیکن تم سے تو ناراض نہیں ہو سکتے۔ پہلے بھی تھے۔ اب نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ میرے مرنے کے بعد تم ہی ان کی ایک اولاد رہ جاؤ گی۔''

شہریز نے کہا۔ ''ہیلو مسٹر جواد! میں تمہارے لیے دعا کروں گا۔ سمیرا کہہ رہی تھی، لندن میں تمہارا ابھی فوڈ پراڈکٹس کا بزنس ہے۔''

وہ بولا۔ ''ہاں اچھا پھیلا ہوا کاروبار ہے۔ میں سمیرا سے کہتا ہوں کہ اسے یہاں آجانا چاہیے اور کاروبار کو سنبھالنا چاہیے۔ آئندہ وہی اتنے بڑے بزنس کی تنہا مالک ہوگی۔''

شہریز نے کہا۔ ''کیا میں آئندہ انٹرنیٹ پر تم سے رابطہ کر سکتا ہوں؟''

''ہاں۔ مجھے خوشی ہوگی۔ ڈیڈ آئیں گے تو میں ان سے بھی تمہاری بات کراؤں گا۔ جب ہمارا بزنس ایک ہے تو وہ تم سے کاروباری باتیں کرنا چاہیں گے۔''

سمیرا نے کہا۔ ''ڈاکٹر نے تمہیں زیادہ بات کرنے سے منع کیا ہے۔ اس لیے میں رابطہ ختم کر رہی ہوں۔ ڈیڈ سے پھر کسی وقت بات کروں گی۔''

رابطہ ختم ہو گیا۔ اس رابطے کے بعد سمیرا کی اہمیت اور بڑھ گئی۔ اب وہ محض خوابوں اور خیالوں میں آنے والی دوشیزہ نہیں تھی۔ کاروباری نقطہ نظر سے بے حد و بے حساب منافع پہنچانے والی لائف پارٹنر بھی تھی اور نجومی نے یہی کہا تھا۔

رات کو کھانے کی میز پر سکندر نے کہا۔ ''بیٹے! تم عاشق مزاج تو نہیں ہو پھر ایک لڑکی کے ساتھ دفتری معاملات کو نظر انداز کر کے کہاں چلے گئے تھے؟''

''ڈیڈ! آپ نے کہاوت تو سنی ہے کہ بنئے کا بیٹا کہیں گرتا بھی ہے تو کچھ اٹھانے کے لیے ہی گرتا ہے۔''

سکندر نے سر ہلا کر کہا۔ ''ہوں۔ کون ہے وہ لڑکی؟''

وہ اس کے بارے میں تفصیل سے بتانے لگا۔ پھر اس نے یہ بھی بتایا کہ کس طرح پچھلے چھ برس سے خوابوں اور خیالوں میں ایک ایسی لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ جس کی ہتھیلی کی پشت پر ایک سیاہ تل نظر آتا تھا۔ ایک نجومی نے بھی پیش گوئی کی تھی کہ ایسی جو بھی لڑکی اسے ملے گی۔ وہ اس کی بہترین لائف پارٹنر ثابت ہوگی۔

سکندر بخت نے کہا۔ ''علم نجوم کو تو میں بھی مانتا ہوں۔ اکثر نجومیوں سے اپنے کاروبار کے اور اپنے مستقبل کے بارے میں کچھ نہ کچھ پوچھتا رہتا ہوں اور مجھے خاطر خواہ معلومات حاصل ہوتی رہتی ہیں۔''

شہریز نے کہا۔ ''میں پہلے علم نجوم کو زیادہ نہیں مانتا تھا لیکن سمیرا سے ملنے کے بعد یقین ہو گیا ہے کہ ہاتھ کی لکیریں درست کہتی ہیں۔ وہ نجومی ہاتھ کی لکیریں بھی دیکھتا تھا اور ستاروں کی چال کو بھی خوب جانتا تھا۔ میں تو اسے مان گیا ہوں۔''

سکندر نے کہا۔ ''اچانک تمہارا مزاج بدل گیا ہے۔ اب تمہارا رجحان سمیرا کی طرف ہو گیا ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ سعدیہ کے مقابلے میں سمیرا زیادہ فائدہ مند ثابت ہوگی؟''

''آپ جانتے ہیں۔ میں عشق و محبت کے چکر میں پڑنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ جہاں منافع ہو، وہیں محبت ہونی چاہیے۔ میں نے سمیرا سے آج پہلی ہی ملاقات میں اس حد تک معلوم کر لیا ہے کہ اس کا بھائی واقعی کینسر کا مریض ہے چند دنوں کا مہمان ہے۔ دوسری ملاقات میں اور بہت سی معلومات حاصل کر لوں گا۔ بلکہ ایک ہفتے کے لیے لندن جا کر اس کے بھائی کی میڈیکل رپورٹ دیکھوں گا۔ پورا یقین کروں گا کہ وہ جلد ہی اس دنیا سے

رخصت ہونے والا ہے یا نہیں؟ اس کے بعد سمیرا ہی اپنے باپ کی تمام جائیداد اور کاروبار کی مالک ہوگی۔''

''احمد جمال کہہ رہا تھا کہ کل سعدیہ اسلام آباد سے واپس آ رہی ہے۔ پرسوں تم دونوں کی منگنی کی رسم ادا کر دی جائے۔''

''آپ اس منگنی کے معاملے کو کسی طرح ٹالنے کی کوشش کریں۔''

''تمہاری باتیں سننے کے بعد سے یہی سوچ رہا ہوں کہ اسے کس طرح ٹالنا چاہیے؟ سعدیہ کا رشتہ ایک اور بزنس کمیونٹی سے آیا ہوا ہے۔ اگر ہم ٹالنے کی کوشش کریں گے تو وہ باپ بیٹی اُدھر جھک جائیں گے۔''

''ہم بزنس مین ہیں یہ جانتے ہیں کہ اپنے مال کی قدر قیمت بڑھانے کے لیے سب ہی بھاؤ دکھاتے ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ مارکیٹ میں اس کے اور بھی طلب گار ہیں۔ جبکہ اس کے مال کی مارکیٹ ویلیو کم سے کم ہوتی ہے۔ مگر دھوکا دیا جاتا ہے۔ اسی طرح جمال انکل آپ سے کہہ رہے ہیں کہ سعدیہ کا رشتہ کسی بہت بڑی بزنس کمیونٹی سے آیا ہوا ہے۔''

سکندر سر جھکا کر سوچنے لگا۔ پھر بولا۔ ''احمد جمال نے یہ مطالبہ کیا ہے کہ میں بزنس تمہارے نام لکھوں گا، تب ہی وہ بیٹی کا رشتہ دے گا۔ اب میں اس معاملے کو ٹالنے کی ہی کوشش کرتا ہوں۔ اسے کہوں گا کہ تمہارے نام سے کاغذات تیار ہو رہے ہیں۔ بزنس ٹرانسفر کرنے میں مہینہ دو مہینہ لگ جائے گا۔''

شہریز نے کہا۔ ''ہاں۔ یہ معقول بہانہ ہوگا اور انکل جمال تو بہت ہی کائیاں ہیں۔ جب تک آپ کا بزنس میرے نام نہیں ہوگا، تب تک وہ اپنی بیٹی کو مجھ سے منسوب نہیں کریں گے۔ منگنی کی رسم کو ٹال دیں گے۔''

وہ سر جھکا کر اپنی پلاننگ کی تبدیلیوں پر غور کرنے لگے۔ زیادہ سے زیادہ منافع کمانے والوں کے مزاج بدلتے ہیں تو زندگی بھی اپنا مزاج بدلتی رہتی ہے۔ انہیں ایک ڈگر سے دوسری ڈگر کی طرف بھٹکاتی رہتی ہے۔

منافع خوری رشتوں کے احترام کو بھی کھا جاتی ہے۔ جس طرح ماں باپ نے اپنی اولاد کو، اولاد کم سمجھا، آپس کی جنگ میں انہیں اپنا سپاہی بنا لیا۔ ان حالات میں ماں باپ کی عظمت اور شخصیت صفر ہونے لگتی ہے، اولاد بھی ان کی آپس کی لڑائی سے ذاتی فائدے اٹھانے لگتی ہے۔

شہریز نے یہی کیا۔ ماں کی حمایت حاصل کر کے اس کی ممتا سے کھیل کر قیمتی زمین ہتھیا

لی۔اس کے بڑھاپے کے لیے کچھ نہ چھوڑا۔

دوسری طرف باپ کے کاروبار کو اپنے نام کرنے والا تھا۔ اسے بھی بڑھاپے میں بے یارو مددگار بنانے والا تھا۔

ماں کو غرور تھا کہ وہ بیٹے کو اپنا سب کچھ دے کر شوہر پر برتری حاصل کر رہی ہے اور شوہر کو یہ فخر حاصل تھا کہ اس نے ہمیشہ کی طرح اپنی بیوی کو بیوقوف اور کمتر بنایا ہے۔ ایک طرف اسے قیمتی زمین سے محروم کیا ہے، دوسری طرف بیٹے کے ذریعے اپنے دوست احمد جمال کے کاروبار پر قبضہ جمانے والا ہے۔

وہ اپنے ہی گھر میں اپنوں کی محبت میں دیانتدار نہیں تھا پھر ایک دوست سے کیسے دیانتدار رہ سکتا تھا؟ بعض گھروں میں ماں، باپ، بیٹی، بہن، بھائی سب ہی آپس میں محبت تو کرتے ہیں لیکن ہر محبت کے پیچھے خود غرضی چھپی ہوتی ہے۔

دوسرے دن سعدیہ اسلام آباد سے واپس آرہی تھی۔ سکندر بخت نے کہا۔ ''بیٹے! تمہیں اس کے استقبال کے لیے جانا چاہیے۔ اسے بھی اپنے ہاتھ میں رکھو۔ نہ جانے کب پٹڑی بدلنی پڑ جائے۔''

وہ اپنی مرسیڈیز میں بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''ڈیڈ سمیرا کی ممی لندن سے واپس آرہی ہیں۔ میں اس کے ساتھ اس کی ماں کا استقبال کرنے جا رہا ہوں۔ اس بڑھیا کے ذریعے بھی بہت کچھ معلوم ہو سکے گا۔''

وہ قائل ہو کر بولا۔ ''بے شک ...... اس سے یہ معلوم ہو سکے گا کہ وہ سوتیلا بیٹا دنیا سے رخصت ہونے کے لیے کب تک انتظار کرائے گا؟ تم سمیرا کے باپ سے ملنے کا راستہ ہموار کرو اگر وہ اپنے بیمار بیٹے کو چھوڑ کر لندن سے یہاں نہ آسکے تو تم یہاں سے جاؤ، وہاں آنکھوں سے بہت کچھ دیکھ سکو گے اور سمجھ سکو گے۔ میں سعدیہ کو ریسیو کرنے جا رہا ہوں۔''

ان باپ بیٹے کے سامنے دو بڑی بازیاں تھیں۔ کسی ایک بازی کو جیتنے کا یقین ہونے سے پہلے دونوں طرف اپنا کھیل جاری رکھنا ضروری تھا۔

سکندر بخت سعدیہ کو ریسیو کرنے ایئر پورٹ گیا۔ اس کی فلائٹ گیارہ بجے آنے والی تھی اور شہریز ایک بجے سمیرا کے ساتھ ایئر پورٹ جانے والا تھا۔

احمد جمال نے اپنے دوست کو تنہا دیکھ کر پوچھا۔ ''شہریز کہاں ہے؟ اسے سعدیہ کو ریسیو کرنے یہاں آنا چاہیے تھا۔''

وہ بولا۔ ''تم تو جانتے ہو، کاروباری معاملات اچانک ہی ہمیں اِدھر سے اُدھر کر دیتے

ہیں۔ وہ کل رات کی فلائٹ سے لاہور گیا ہے۔ آج شام تک واپس آ جائے گا۔“

فلائٹ لیٹ ہو گئی تھی۔ تقریباً ڈیڑھ بجے پہنچی تھی۔ سعدیہ دو بجے لگیج ہال سے باہر آئی تو شہریز نظر نہیں آیا۔ اس نے سکندر بخت سے پوچھا۔ ”انکل شہریز کہاں ہے؟“

”بیٹی! وہ لاہور گیا ہے، شام کو آ جائے گا۔ اس نے کہا ہے آج ڈنر تمہارے ساتھ کرے گا۔“

احمد جمال نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”عجیب اتفاقات ہیں۔ وہ تم سے ملاقات کرنے آیا تو تم اسلام آباد چلی گئی تھیں۔ اب تم آئی ہو تو وہ لاہور گیا ہوا ہے۔“

وہ سب عمارت کے باہر آ کر اپنی گاڑیوں کی طرف جانے لگے۔ سکندر نے کہا۔ ”ملاقات تو ضرور ہو گی۔ بس ذرا دیر ہو رہی ہے۔“

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ”کوئی بات نہیں...... دیر آید...... درست آید......“

وہ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ دونوں دوست اگلی سیٹوں پر آ گئے۔ احمد جمال کار اسٹارٹ کر کے اسے آگے بڑھانے لگا۔ سعدیہ کھڑکی کے باہر دیکھ رہی تھی۔ ایسے ہی وقت چونک گئی۔ بیرونی ممالک سے آنے والی فلائٹ کی وزیٹرز لابی میں شہریز دکھائی دے رہا تھا۔ وہ پہلی ہی نظر میں اسے پہچان گئی۔ وہ اک جوان لڑکی اور ادھیڑ عمر عورت کے ساتھ مسکرا کر باتیں کر رہا تھا۔

وہ شہریز کی ایک ہی جھلک دیکھ پائی پھر کار وہاں سے گزرتی چلی گئی۔ اس نے سر گھما کر اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے سکندر بخت کو دیکھا۔ کچھ کہنا چاہتی تھی، لیکن رک گئی۔ عقل نے سمجھایا، اُدھر بیٹا ہے اِدھر باپ ہے۔ اس نے بیٹے کے بارے میں جھوٹ بولا ہے۔ اس جھوٹ کے پیچھے ضرور کوئی خاص بات ہو گی۔

وہ تھوڑی دیر تک چپ رہی، اپنے طور پر سوچتی رہی پھر باپ کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔ ”بابا! آپ دونوں دوست ہمارے فیوچر کے بارے میں کیا سوچ رہے ہیں؟“

احمد جمال نے کہا۔ ”جو سوچا ہے، جو فیصلہ کیا ہے، وہ تو تمہیں معلوم ہی ہے۔“

”ہاں...... مگر اس فیصلے پر کہاں تک عمل کیا جا رہا ہے؟“

”میں تو چاہتا تھا، کل ہی تم دونوں کی منگنی کر دی جائے لیکن مناسب یہی ہو گا کہ پہلے سکندر میرے مشورے پر عمل کرے اپنا بزنس بیٹے کے نام لکھ دے۔“

”مجھے یہ معلوم ہے کہ آپ نے انہیں ایسا مشورہ دیا ہے۔ پھر انکل! آپ اس سلسلے میں کیا کر رہے ہیں؟“

سکندر بخت نے سوال کا جواب دینے کے لیے ذرا دیر خاموشی اختیار کی۔ احمد جمال

نے پوچھا۔ ’’خاموش کیوں ہو؟ اپنی بھتیجی کو جواب دو۔‘‘

وہ بولا۔ ’’میں نے بزنس ٹرانسفر کرانے کے لیے اپنے وکیل سے بات کی ہے۔‘‘

’’تعجب ہے......؟ ان پانچ دنوں میں تم نے وکیل سے صرف بات کی ہے؟‘‘

’’وہ......وہ بات یہ ہے کہ میرا وکیل ایک کیس میں مصروف تھا۔ اب وہ میرا کام کرے گا۔ اس نے کہا ہے، کاغذات تیار کرنے میں اور مختلف پروسیس سے گزرنے میں دو تین ہفتے لگ جائیں گے۔‘‘

’’تمہارا وکیل بہت ہی کاہل اور کام چور لگتا ہے۔ یہی کام میرا وکیل دو چار دنوں میں کر دکھائے گا۔‘‘

سعدیہ نے کہا۔ ’’بابا! ذرا دیر ہوتی ہے تو ہونے دیں۔ تب تک انکل کو بلکہ ہم سب کو اچھی طرح سوچنے کا موقع ملتا رہے گا۔‘‘

احمد جمال نے سکندر کے دفتر کے سامنے کار روک دی۔ وہ بولا۔ ’’اندر چلو...... ہاٹ کافی پیتے ہیں۔‘‘

سعدیہ نے کہا۔ ’’انکل آج نہیں...... پھر کبھی سہی۔ میں تھکی ہوئی ہوں۔ سیدھی گھر جانا چاہتی ہوں۔‘‘

وہ کار سے اُترتے ہوئے بولا۔ ’’ٹھیک ہے۔ میں شہریز سے کہہ دوں گا، تم اسلام آباد سے آ گئی ہو۔ وہ تو یہ سنتے ہی تمہارے پاس دوڑا چلا آئے گا۔‘‘

وہ دروازہ کھول کر پچھلی سیٹ سے نکلی اور اگلی سیٹ پر باپ کے برابر آ کر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ’’او کے انکل! میں شہریز کا انتظار کروں گی۔ چلیں بابا......‘‘

کار آگے بڑھنے لگی۔ وہ ونڈ سکرین کے پار دیکھ رہی تھی۔ اسے سکندر بخت کے جھوٹ پر غصہ آ رہا تھا لیکن وہ غصہ برداشت کرنا جانتی تھی۔ اس نے پوچھا۔ ’’بابا! انکل سے آپ کی دوستی کتنی پرانی ہے؟‘‘

’’کالج کے زمانے سے ہے۔‘‘

’’ان کے متعلق آپ کی ریڈنگ کیا ہے؟ یہ دوست کی حیثیت سے کتنے مخلص ہیں؟‘‘

’’اچھے دوستوں میں سے ہے۔ کبھی کبھی وقت پر کام آ جاتا ہے۔ اپنا نقصان نہ ہو تو فائدہ پہنچاتا ہے اور اپنا فائدہ ہو تو دوستوں اور رشتے داروں کے نقصان کی بھی پروا نہیں کرتا۔ یوں سمجھو موقع پرست ہے۔ ہماری دوستی اس لیے قائم ہے ہم نے کبھی ایک دوسرے کو نقصان نہیں پہنچایا ہے۔‘‘

''کیا آپ نہیں سمجھتے کہ یہ آپ کے مشورے پر عمل کرنے سے کترا رہے ہیں؟ شاید اپنا بزنس بیٹے کے نام نہیں کرنا چاہتے۔''

''بیٹے! میں نے بھی گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے۔ اسے کاروبار بیٹے کے نام کرنے کا مشورہ اس لیے دیا ہے کہ شادی کے بعد وہ کہیں تمہارے ہی بزنس سے چپک کر نہ رہ جائے۔ اگر باپ کا کاروبار اس کے نام ہوگا تو بیوی کی حیثیت سے تم بھی اس کے بزنس پر حاوی ہو سکو گی۔ ایسے وقت سکندر تمہاری مداخلت پر کسی طرح کا اعتراض نہیں کر سکے گا۔''

''آپ ایک طویل عرصے سے دوست رہے ہیں۔ کیا انکل نے کبھی آپ سے جھوٹ بولا ہے؟ کبھی کسی طرح کا دھوکا دیا ہے؟''

''بزنس ورلڈ میں اپنے اپنے اہم معاملات چھپانے کے لیے ایک دوسرے سے جھوٹ بولنا ہی پڑتا ہے میں نے کئی بار اس کا جھوٹ پکڑا ہے لیکن اس سے میرا کوئی نقصان نہیں ہوا۔ اسی طرح اس نے بھی کبھی میرا جھوٹ پکڑا ہوگا۔ بائی داوے...... تمہاری باتوں اور لہجے سے ایسا لگ رہا ہے کہ تم ضرورت سے کچھ زیادہ ہی سنجیدہ ہو۔''

''جی ہاں...... میں نے ابھی انکل کا جھوٹ پکڑا ہے۔''

اس نے چونک کر بیٹی کو دیکھا پھر ونڈ سکرین کے پار دیکھتے ہوئے بولا۔ ''کیا کہہ رہی ہو؟ وضاحت کرو......''

وہ بولی۔ ''شہریز لاہور نہیں گیا ہے۔ یہیں، اسی شہر میں ہے۔''

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ''یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟''

''میں نے ابھی اسے ایئرپورٹ پر دیکھا ہے۔''

اس نے بے یقینی سے کار کو سڑک کے کنارے روک دیا پھر بیٹی کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا......؟ وہ...... ایئرپورٹ پر......؟ تعجب ہے، سکندر نے ہم سے جھوٹ کیوں بولا؟ شہریز وہاں تھا تو ہم سے ملنے کیوں نہیں آیا؟ اوآئی کانٹ بلیو اِٹ......''

''کیا میں آپ سے جھوٹ بولوں گی؟''

''یہ بات نہیں ہے سعدیہ! دراصل بات سمجھ میں نہیں آ رہی ہے کہ شہریز وہاں موجود تھا لیکن تم سے کترا رہا تھا اور باپ جھوٹ بول رہا تھا۔ تمہاری جگہ کوئی دوسرا یہ بات کہتا تو میں کبھی بھی یقین نہ کرتا۔ ہمیں سوچنا ہوگا، سمجھنا ہوگا کہ یہ باپ بیٹے کیا پلاننگ کر رہے ہیں؟ کیوں جھوٹ بول رہے ہیں؟''

وہ سیٹ کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے بولی۔ ''اچھا ہے بابا! رشتہ کنفرم ہونے سے

پہلے ان کی اصلیت معلوم ہو رہی ہے۔ آئندہ اور بہت کچھ معلوم ہو سکے گا......''

☆======☆======☆

منزل اپنی ماں کے ساتھ گھر سے باہر آئی پھر کار کی اگلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''آپ بینک کیوں جا رہی ہیں؟ کیا بڑی رقم نکالیں گی؟ مجھے شاپنگ کرائیں گی؟''

فریدہ نے کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''آج تم کسی بات کی ضد نہیں کرو گی۔ میں صرف اپنی ایک چیز خریدنے جا رہی ہوں۔''

''اس چیز کا کوئی نام تو ہوگا؟''

وہ بڑے فخر سے مسکراتے ہوئے بولی۔ ''ایک بہت ہی ونڈرفل ڈائمنڈ ہے۔ کل میں نے صمد جیولرز کے ہاں اس ہیرے کو دیکھا تو بس دیکھتی ہی رہ گئی۔ ابھی تمہیں بھی دکھاؤں گی تو معلوم ہوگا کہ تمہاری ممی کی چوائس کتنی زبردست ہے؟''

''پھر تو وہ بہت قیمتی ہوگا؟''

''میرے بینک بیلنس کے مطابق قیمتی نہیں ہے۔ ایک بہت ہی خوبصورت سونے کا نیکلس ہے۔ اسی میں وہ ہیرا اجڑا ہوا ہے۔ صرف ہیرے کی قیمت ایک لاکھ بیس ہزار روپے ہے اور پورا سیٹ ایک لاکھ ستر ہزار کا ہے۔''

''اوہ ممی! آپ سب سے اپنا بینک بیلنس چھپاتی ہیں۔ یہی ظاہر کرتی ہیں کہ ڈیڈی نے آپ کو پیسے پیسے کا محتاج کر رکھا ہے۔''

''میں تمہیں یہی سمجھاتی ہوں کہ گھر کے مردوں کو کبھی یہ معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ ہم کتنے حیلے بہانوں سے بچت کرتی ہیں اور اس بچت کو کس طرح چھپا کر رکھتی ہیں۔''

''مجھے تو آپ کے سوا کوئی کچھ دیتا ہی نہیں ہے۔ میں آپ کے ہی نقشِ قدم پر چلتی ہوں۔ جب میری شادی ہوگی تو آپ کی طرح اپنے میاں سے اور سسرال والوں سے اپنی بچت چھپایا کروں گی۔ فی الحال تو ڈائمنڈ نیکلس خریدنے کی خوشی میں آپ مجھے بھی شاپنگ کرائیں گی۔''

''بس تم شروع ہو گئیں۔ میں نے پہلے ہی کہا تھا، آج تم ضد نہیں کرو گی۔ میں اپنے اکاؤنٹ سے بہت بڑی رقم نکال رہی ہوں۔''

''جہاں ایک لاکھ ستر ہزار نکالیں گی۔ وہاں پچیس تیس ہزار زیادہ نکال لیں۔ کیا فرق پڑے گا؟''

''تم کچھ زیادہ ہی لاڈلی بنتی جا رہی ہو۔ تمہارا یہ لاڈ پیار مجھے مہنگا پڑتا ہے۔ چلمن کو

دیکھو وہ کبھی ایسی ضد نہیں کرتی۔"

"چلمن آپ سے نہیں ڈیڈی سے ضد کرتی ہے اور اپنے بڑے بڑے مطالبات منواتی رہتی ہے۔"

ان کی کار بینک کے سامنے آ کر رک گئی۔ منزل دروازہ کھول کر اُتر رہی تھی۔ ایسے ہی وقت اس کی نظر شاہ زیب پر پڑی۔ اس نے بھی اسے دیکھ لیا۔ نظریں ملیں تو وہ فوراً ہی آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ "کیا حسنِ اتفاق ہے؟ میں یہاں ایک کام سے آیا تھا اور تم سے ملاقات ہو گئی۔"

فریدہ دوسری طرف کا دروازہ کھول کر نکل رہی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ منزل نے مسکرا کر کہا۔ "یہ میری ممی ہیں اور ممی! یہ شاہ زیب ہیں۔"

شاہ زیب نے بڑے ادب سے سر جھکا کر آداب کہا۔ فریدہ نے مسکرا کر کہا۔ "خوش رہو بیٹے! میں تم سے ملاقات کرنے والی تھی۔ یہاں اچانک ہی ہم مل رہے ہیں۔"

"یہ تو میری خوش نصیبی ہے کہ آپ جیسی معزز خاتون سے ملاقات ہو رہی ہے۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو حکم کریں۔"

"اگر تم مصروف نہیں ہو تو ہمارے ساتھ رہو۔ میں ابھی بینک سے رقم نکال کر ایک جیولر کے پاس جاؤں گی۔ پھر ہم ساتھ لنچ کریں گے۔"

"آنٹی میں تو آپ کا تابعدار ہوں۔ آپ کہتی ہیں تو ساتھ رہوں گا۔"

فریدہ نے کہا۔ "منزل ایسا کرو تم شاہ زیب کے ساتھ یہیں کار میں بیٹھو۔ میں ابھی رقم نکال کر لاتی ہوں۔"

"آل رائٹ ممی! ہم یہیں آپ کا ویٹ کریں گے۔"

فریدہ وہاں سے گھوم کر بینک کی سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اندر چلی گئی۔ منزل نے پوچھا۔ "یہاں کیا کر رہے تھے؟"

اس نے کہا۔ ایک دوست نے وعدہ کیا تھا کہ مجھے کاروبار کے لیے ایک لاکھ روپے قرض دے گا۔ اس نے یہاں ملنے کو کہا تھا لیکن اب تک نہیں آیا۔ بائی دا وے...... تمہاری بہن مجھے دیکھتے ہی کیوں دشمن بن گئی تھی؟ تمہاری ممی کا رویہ تو دوستانہ ہے۔ ان سے مل کر حوصلہ ہو رہا ہے۔"

"ممی بہت اچھی ہیں۔ میری خوشی میں خوش رہتی ہیں۔ تم میری پسند ہو اس لیے وہ بھی تمہیں پسند کر رہی ہیں۔ تمہیں کوئی کاروبار شروع کرنے کے سلسلے میں پریشان نہیں ہونا

چاہیے۔ می کا دل جیت لو۔ وہ تم پر اعتماد کرنے لگیں گی تو ان کے ذریعے تمہیں بڑی سے بڑی رقم بہ طور قرض دلاؤں گی۔"

پھر وہ بینک کی طرف دیکھ کر بولی۔ "مجھے اندازہ نہیں ہے۔ کہ می کا بینک بیلنس کتنا ہے؟ وہ بہت گہری ہیں۔ ابھی دو لاکھ روپے نکالنے گئی ہیں۔ ایک بہت ہی قیمتی نیکلس خریدنے والی ہیں۔"

شاہ زیب کے دماغ میں چاندی کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ یوں لگ رہا تھا، جیسے اس کی باؤلی محبوبہ اسے مژدہ جاں فزا سنا رہی ہو۔

فریدہ آدھے گھنٹے میں واپس آ گئی۔ شاہ زیب کی نظریں اس کے ہینڈ بیگ پر تھیں۔ وہ بولی۔ "منزل! تم پچھلی سیٹ پر چلی جاؤ۔ شاہ زیب کو آگے بیٹھنے دو۔ میں اس سے باتیں کرتی رہوں گی۔"

وہ تینوں کار میں بیٹھ گئے۔ پھر وہاں سے ایک شاپنگ سینٹر کی طرف جانے لگے۔ شاہ زیب نے کہا۔ "آنٹی! منزل آپ کے بارے میں بہت سی باتیں کرتی رہتی ہے۔ میں انہیں سن کر تصور میں آپ کو دیکھتا تھا۔ آپ ایسی ہوں گی۔ آپ ویسی ہوں گی لیکن آپ کو دیکھنے کے بعد پتا چلا کہ......"

اس نے بات ادھوری چھوڑی تو فریدہ نے پوچھا۔ "مجھے دیکھنے کے بعد مایوسی ہو رہی ہے؟"

وہ سیٹ پر پہلو بدلتے ہوئے بولا۔ "اوہ نو آنٹی! منزل نے تو آپ کی تعریف کرنے میں بڑی کنجوسی سے کام لیا ہے۔ یہ تعریف کرتی تھی تو میں ایک بھاری بھر کم ماں کو تصور میں دیکھتا تھا لیکن آپ تو بہت ہی خوبصورت اور اسمارٹ ہیں۔ خود کو اتنی اچھی طرح مین ٹین رکھا ہے کہ کسی طور پر می نہیں لگتیں منزل کی بڑی بہن دکھائی دیتی ہیں۔"

وہ خوش ہو کر بولی۔ "اوہ نو۔ اب اتنی تعریفیں بھی نہ کرو۔ میرے چہرے سے عمر ظاہر ہو جاتی ہے۔"

"نہیں آنٹی! آپ چہرے سے ایک باوقار خاتون دکھائی دیتی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ شادی شدہ لگتی ہیں لیکن کسی بچے کی ماں نہیں لگتیں۔ اتنی دیر سے سوچ رہا تھا کہ آپ کی شخصیت میں ایک انجانی سی کشش کیوں ہے؟ لیکن ابھی تک یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

وہ خوش ہو کر ہنسنے لگی اور وہ خوش کرنے کا ہنر خوب جانتا تھا۔ وہ تینوں ہنستے بولتے ایک شاپنگ سینٹر کے سامنے پہنچ گئے۔ وہاں کار کو پارک کیا۔ پھر اسے لاک کر کے اس بڑی سی

عمارت کی طرف جانے لگے۔

فریدہ کے بائیں طرف منزل تھی، دائیں طرف شاہ زیب چل رہا تھا اور وہ بیگ فریدہ کے دائیں ہاتھ میں تھا۔

وہ اس کی ہونے والی خوشدامن تھی۔ دامن کے اس طرف اس کی پیار بھری منزل تھی اور اس طرف بھی من کی مراد پوری کرنے والی منزل بیگ میں چھپی ہوئی تھی۔ شاپنگ سینٹر کی سیڑھیاں بہت ہی وسیع و عریض تھیں۔ اس کا فرسٹ فلور ذرا اونچائی پر تھا۔ وہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اوپر آ گئے وہاں اچھی خاصی بھیڑ تھی۔ یہ کہنا چاہیے کہ خاصی رونق تھی۔ اسی رونق میں اچانک ایک زوردار دھماکا ہوا۔

دہشت گردی تو اس شہر کے مقدر میں جیسے لکھ دی گئی ہے۔ ایک دم سے بھگدڑ مچ گئی۔ عورتیں، بچے بوڑھے سب ہی عمارت سے باہر نکلنے کے لیے انہی سیڑھیوں کی طرف ایک سیلابی بلا کی طرح آ گئے تھے۔ ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے۔ گر رہے تھے۔ منزل اور فریدہ بھی اس بھگدڑ میں اپنا توازن قائم نہ رکھ سکیں۔ منزل گرنے کے بعد سنبھلنے کی کوشش کرنے لگی لیکن فریدہ تو سیڑھیوں پر ایسی گری کہ نیچے کی طرف لڑھکتی چلی گئی۔

سیڑھیوں کی ایک قریب والی دکان میں بم بلاسٹ ہوا تھا۔ اس کے بعد پھر کوئی دھماکا نہیں ہوا لیکن دل و دماغ میں دہشت طاری ہو گئی تھی کہ اب دوسرے تیسرے دھماکے بھی ہو سکتے ہیں۔

منزل زینے کے ایک پائدان پر سنبھل سنبھل کر قدم رکھتے ہوئے نیچے ماں کی طرف جانے لگی۔ وہاں پہنچ کر اس نے اسے سہارا دیا۔ اچھی خاصی چوٹیں آئی تھیں لیکن وہ چوٹوں کو بھول کر اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولی۔ ''بیٹی! میرا بیگ کہاں ہے؟''

منزل بھی اِدھر اُدھر دور تک نظریں دوڑانے لگی۔ گرنے پڑنے والے لوگ دکھائی دے رہے تھے لیکن وہ بیگ نظر نہیں آ رہا تھا۔

فریدہ نے پوچھا۔ ''شاہ زیب کہاں ہے؟''

وہ بولی۔ ''ہو سکتا ہے اس نے بیگ اٹھا لیا ہو اور کار کے پاس ہمارا انتظار کر رہا ہو۔ ہمیں اُدھر جانا چاہیے۔''

وہ بیٹی کا سہارا لے کر تکلیف سے کراہتی ہوئی تیزی سے چلتی ہوئی باہر جانے لگی۔ پارکنگ ایریا میں اپنی کار کے پاس پہنچی۔ لوگ اپنی اپنی گاڑیاں اس شاپنگ سینٹر سے دور لے جا رہے تھے۔ منزل نے کہا۔ ''ممی! آپ کار میں بیٹھیں۔''

وہ جھنجھلا کر بولی۔ ”یہاں بیٹھ کر کیا کروں؟ میرا بیگ کہاں ہے؟ وہ شاہ زیب بھی نظر نہیں آرہا ہے۔“

”ممی! پہلے آپ گاڑی یہاں سے دور لے چلیں۔ شاہ زیب بھی آ جائے گا۔“

وہ کار میں بیٹھ گئی منزل ڈرائیونگ سیٹ پر آ گئی۔ اسے اسٹارٹ کر کے وہاں سے ذرا دور جانے لگی۔ فریدہ اس شاپنگ سینٹر کی طرف دور دور تک نظریں دوڑا رہی تھی اور پوچھ رہی تھی۔ ”وہ بیگ شاہ زیب کے پاس ہی ہوگا ناں......؟“

”ہمیں یہی امید کرنی چاہیے لیکن یہ ضروری تو نہیں ہے۔ کوئی دوسرا بھی اس بیگ کو اٹھا کر لے جا سکتا ہے۔ اٹھائی گیرا ایسے ہی موقعوں کی تاک میں رہتے ہیں۔“

وہ دور جا کر رک گئی۔ وہاں ایک کے بعد دوسرا دھماکا نہیں ہوا تھا۔ اس شاپنگ سینٹر سے دور لوگوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ پولیس والے بھی پہنچ گئے تھے۔ یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ دہشت گرد عمارت کے اندر ہی ہیں یا وہاں سے فرار ہو چکے ہیں؟

یہ ایک بات تو مصدقہ تھی کہ وہاں جو کچھ ہوا تھا۔ اس کے نتیجے میں فریدہ کو نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ وہ بیٹی کے ساتھ وہاں دو گھنٹے تک رہی۔ بعد میں اس شاپنگ سینٹر کے اندر بھی گئی لیکن ایسے ایماندار لوگ کہاں ہوتے ہیں کہ دو لاکھ روپے سے بھرے بیگ کو اس کے قدموں میں لا کر رکھ دیتے؟ شاہ زیب نے ان کے قدموں تلے سے زمین کھینچ لی تھی۔ یہ انہیں بعد میں تسلیم کرنا پڑا۔

فریدہ نے تھانے میں رپورٹ درج کرائی کہ شاپنگ سینٹر کے ہنگامے میں ایک بھاری رقم سے بھرا ہوا بیگ کوئی اس سے چھین کر لے گیا ہے۔

اس نے یہ بیان نہیں دیا کہ چھیننے والے کا نام شاہ زیب ہے اور وہ اس کی بیٹی کا بوائے فرینڈ ہے۔

اگر وہ ایسا بیان دیتی تو یہ بات گھر تک بھی پہنچتی۔ چلمن نے پہلے ہی وارننگ دی تھی کہ شاہ زیب لالچی اور فریبی ہے۔ سکندر بخت نے بھی اپنی بیٹی کی حمایت میں کہا تھا کہ وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتی۔ اگرچہ شاہ زیب کے خلاف کوئی ثبوت اور گواہ نہیں ہے لیکن چلمن نے کہہ دیا کہ وہ ناقابلِ اعتماد ہے تو پھر وہ ایسا ہی مجرمانہ ذہنیت رکھنے والا جوان ہوگا اور وہ اس کے بارے میں انکوائری کرے گا۔

اب اسے کسی انکوائری کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ فریدہ اپنی بیٹی چلمن اور اپنے شوہر سکندر بخت کے سامنے شاہ زیب کا نام لے کر شرمندہ نہیں ہونا چاہتی تھی۔ اس نے دو لاکھ

کے نقصان کی بات شہریز کو بتائی لیکن اسے بھی شاہ زیب کے متعلق کچھ نہیں بتایا۔

ایسا نقصان اٹھانے کے بعد بھی یہ بات کسی کی سمجھ میں آنے والی نہیں تھی کہ جب گھر کے لوگ آپس میں اختلافات رکھتے ہیں اور ایک دوسرے پر اعتماد نہیں کرتے تو ایسے ہی نقصانات سے دوچار ہوتے رہتے ہیں۔

دوسری طرف وہ باپ بیٹا بھی نفع ونقصان کی گرما گرم بازیاں کھیلنے میں مصروف تھے اور جلد ہی یہ فیصلہ کرنے والے تھے کہ دونوں میں سے کون سی بازی جاری رکھی جائے اور کسے چھوڑ دیا جائے؟

شہریز نے سمیرا کی ممی سے ملاقات کی تھی۔ وہ لندن سے اپنے سوتیلے بیٹے کی مکمل رپورٹ لے کر آئی تھی۔ وہ رپورٹ اس بات کی تصدیق کر رہی تھی کہ سمیرا کا سوتیلا بھائی کینسر کا مریض ہے۔ شاید چار چھ ماہ سے زیادہ نہیں جی سکے گا۔

سمیرا کے باپ نے ایک مختصر سا خط لکھا تھا۔

''بیٹی! میں تم سے ناراض نہیں ہوں۔ تمہارے بھائی کی طویل بیماری نے مجھے تم سے دور کر دیا ہے۔ اس دوری کو باپ کی بے حسی یا ناراضگی نہ سمجھو۔ تم نے فون پر بتایا ہے کہ کسی شہریز نامی جوان سے شادی کرنا چاہتی ہو اور وہ جوان ایک بزنس مین ہے۔ میں نے تم سے کہا تھا، پہلے شہریز کے بارے میں معلومات حاصل کروں گا پھر تمہاری پسند کے مطابق اسے اپنی پسند بناؤں گا۔ تمہارے لیے ایک خوشخبری ہے، میں نے مکمل معلومات حاصل کی ہیں۔ وہ سکندر بخت نامی ایک اچھے خاصے بزنس مین کا بیٹا ہے۔ ان کی فوڈ انڈسٹریز ہیں اور وہ باپ بیٹا کامیاب بزنس مین ہیں۔ تم نے اس جوان کو پسند کر کے ثابت کیا ہے کہ واقعی مجھ جیسے بزنس مین کی ذہین بیٹی ہو۔ میں جلد ہی وہاں آ کر تمہارے شہریز سے اور اس کے باپ سکندر بخت سے ملاقات کروں گا اور رشتے کی بات کو آگے بڑھاؤں گا۔''

سمیرا کے باپ ظہیر صدیقی کا وہ خط پڑھ کر اور تمام میڈیکل رپورٹس دیکھنے کے بعد اس سیاہ تل کا پلڑا بھاری ہو گیا تھا۔ شہریز ان تمام اہم کاغذات کی فوٹو سٹیٹ کاپیاں لے کر باپ کے پاس آیا۔ اس نے بھی انہیں پڑھا۔

بیٹے نے کہا۔ ''ڈیڈ! پچھلے چھ برس سے قدرت کی طرف سے اشارہ مل رہا تھا۔ سمیرا کا وہ سیاہ تل میرے خوابوں اور خیالوں میں آ کر یہ سمجھاتا رہا تھا کہ میں اسے صرف خیالی دوشیزہ نہ سمجھوں۔ وہ میرے مستقبل کے لیے بہت اہم ہے۔ میں تو اس نجومی کو مان گیا۔ اس نے بھی یہی کہا تھا کہ وہ سیاہ تل والی میری بہترین شریکِ حیات ثابت ہوگی۔''

سکندر نے قائل ہو کر کہا۔ ''بے شک۔ ہمیں اس کاروباری شادی کا معاملہ سمیرا کے باپ ظہیر صدیقی سے ڈن کر لینا چاہیے۔''

''میں ڈن کر چکا ہوں۔ اس خط کے جواب میں وہیں بیٹھ کر ظہیر صدیقی کو لکھا ہے کہ میں ان سے ملنے کے لیے بے چین ہوں اور سمیرا میری زندگی ہے، ایسی محبت ہے جو میرے سامنے آنے سے پہلے ہی میرے دل و دماغ پر چھا گئی ہے۔ میرے ڈیڈ سکندر بخت بھی آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔ ہمیں آپ کی آمد کا شدت سے انتظار رہے گا۔ میں خط وہیں سے ان کے نام فیکس کر چکا ہوں۔''

''یہ اچھا کیا تم نے...... ہماری طرف سے بھی اس بات کی یقین دہانی ہونی چاہیے کہ ہم رشتے کے لیے بالکل تیار ہیں۔''

وہ دونوں اس رات آٹھ بجے احمد جمال کے گھر پہنچے۔ پہلے یہ طے تھا کہ شہریز ڈنر کے لیے سعدیہ کے پاس آئے گا۔ وہاں دونوں اچھا خاصا وقت گزاریں گے لیکن وہ اکیلا نہیں آیا باپ کو بھی ساتھ لے آیا۔ کیونکہ اب دوٹوک فیصلہ کرنا تھا۔

وہاں احمد جمال ان کا منتظر تھا۔ اس نے کہا۔ ''سعدیہ ابھی کام سے باہر گئی ہے تھوڑی دیر میں آ جائے گی۔ میں ایک بیٹی کا باپ ہوں۔ اس وقت دوراہے پر کھڑا ہوا ہوں۔ ایک طرف تو تم اپنے بیٹے کا رشتہ لائے ہو دوسری طرف ایک اور بہت ہی اچھے خاندان سے رشتہ آیا ہوا ہے۔ میں انہیں برسوں سے جانتا ہوں اور وہ بھی میرے لیے قابلِ اعتماد ہیں۔''

سکندر بخت نے کہا۔ ''برسوں کے تو ہم بھی دوست ہیں۔ میں سعدیہ بیٹی کو اپنی بہو بنانا چاہتا ہوں لیکن تمہاری یہ شرط منظور نہیں ہے کہ مجھے اپنا کاروبار اپنے بیٹے کے نام لکھ دینا چاہیے۔''

وہ بولا۔ ''میں جانتا تھا، تم اپنے نفع و نقصان کا حساب کرو گے اور پھر پٹڑی بدلنے میں دیر نہیں کرو گے۔ میں بھی جواباً اپنا فیصلہ سنانے کے لیے یہاں تیار بیٹھا ہوں۔''

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا ایک کمرے کے دروازے تک گیا۔ پھر دستک دیتے ہوئے بولا۔ ''عمیر بیٹے! آ جاؤ......''

وہ دروازہ فوراً کھل گیا۔ وہاں سے جو نوجوان سامنے آیا اسے دیکھ کر شہریز چونک گیا۔ اس جوان نے شہریز کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ''تم نے پہلی بار مجھے انٹرنیٹ کے ذریعے دیکھا۔ میں نے بھی تمہیں دیکھا۔ اس وقت میں نے اپنا فرضی نام بتایا تھا اور بیمار تھا۔ سوری...... مجھے مجبوراً وہ ڈراما کرنا پڑا۔ میرا نام عمیر صدیقی ہے اور میرے پاپا کا نام ظہیر صدیقی......''

شہریز اور سکندر الجھ گئے۔ انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ عمیر صدیقی نے کہا۔

''آپ ابھی الجھ رہے ہیں۔آپ سے پہلے جمال انکل بری طرح الجھے ہوئے تھے۔ یہ فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے ہم میں سے کھرا کون ہے اور کھوٹا کون ہے؟ یہ کامیاب ڈراما پلے کرنے میں تمہارے ایک دوست نے میری بڑی مدد کی ہے۔''

شہریز نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا پھر پوچھا۔''میرے دوست نے......؟''

''ہاں۔تمہارے اس دوست کا نام کاشف ہے۔وہ کینیڈا جانے اور اپنا فیوچر بنانے کے لیے بے چین تھا لیکن اس کے پاس نہ تو رقم تھی اور نہ مضبوط ذرائع تھے۔میں نے اس کی مشکل آسان کر دی ہے۔وہ اب کینیڈا جا چکا ہے۔اس نے مجھے بتایا تھا کہ تم ایک ایسی لڑکی کے دیوانے ہو، جس کی بائیں ہتھیلی کی پشت پر ایک سیاہ تل ہے۔''

وہ ایک طرف سے دوسری طرف جاتے ہوئے بولا۔''بڑے بڑے پاگلوں کا علاج ہو جاتا ہے۔پھر تمہارے جیسے دیوانے کا علاج کیوں نہ ہوتا؟ سمیرا مڈل کلاس سے تعلق رکھتی ہے۔میرے ہی آفس میں ملازمت کرتی ہے۔بہت تیز طرار لڑکی ہے۔میں نے اسے اچھی خاصی رقم دے کر عارضی طور پر اپنی سوتیلی بہن بنا لیا۔اس کی بائیں ہتھیلی کی پشت پر کبھی کوئی تل نہیں تھا۔پلاسٹک سرجری کے ذریعے بنا دیا گیا۔''

یہ سنتے ہی شہریز کا سر چکرانے لگا۔

عمیر صدیقی نے کہا۔''ہم کاروباری لوگ ہیں۔دو نمبر مال کو ایک نمبر بنا کر مارکیٹ میں لانا جانتے ہیں۔سمیرا دو نمبر تھی۔ہم نے ایک ننھے سے تل کا اضافہ کر کے اسے ایک نمبر بنا دیا۔''

وہ ٹہلنے کے انداز میں ایک طرف سے دوسری طرف جاتے ہوئے بولا۔''میں نے انٹرنیٹ پر پہلی ملاقات میں اپنا نام جواد بتایا تھا اور تم نے جواد کی جو میڈیکل رپورٹ پڑھی وہ بالکل درست ہے۔وہ بے چارہ کینسر کا مریض تھا۔مر چکا ہے۔یعنی تمہارے سامنے کینسر کا جو مریض آیا وہ اصل مریض تھا۔ایک نمبر تھا۔ہم نے دو نمبر بنا کر پیش کیا۔''

احمد جمال نے کہا۔''سمیرا کی ماں لندن سے تنہا نہیں آئی۔یہ عمیر صدیقی بھی اس کے ساتھ آیا ہے۔تم سے نظر بچا کر اسی طرح گزر گیا۔جس طرح تم ایئرپورٹ پر میری بیٹی سے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔دھوکا دے رہے تھے کہ تم لاہور گئے ہوئے ہو۔''

احمد جمال نے جیب سے ایک تہہ شدہ کاغذ نکال کر اسے کھول کر دکھاتے ہوئے کہا۔''تم نے عمیر صدیقی کے والد ظہیر صدیقی کے خط کے جواب میں یہ تحریر یہاں سے فیکس کی تھی۔یہ تحریری ثبوت بھی موجود ہے کہ تم کسی ظہیر صدیقی کی بیٹی سمیرا سے شادی کرنا چاہتے ہو، جبکہ ظہیر صدیقی کی کوئی بیٹی نہیں ہے۔صرف یہی ایک بیٹا عمیر صدیقی ہے۔''

شہریز کا سر جھکا ہوا تھا۔ سکندر بخت بھی اپنے دوست احمد جمال سے نظریں چرا رہا تھا۔ پھر اس نے بیٹے سے کہا۔ ''ہمیں چلنا چاہیے۔''

وہ دونوں باپ بیٹا وہاں سے جانے کے لیے پلٹ گئے۔ ایسے ہی وقت سعدیہ دروازے سے اندر داخل ہوتے ہوئے بولی۔ ''شہریز! ہم لڑکپن کے ساتھی تھے۔ مگر تم ان لوگوں میں سے ہو جو پیدا کرنے والوں کا بھی تمام عمر ساتھ نہیں دیتے۔ تم محبوب پرست نہیں ہو، مفاد پرست ہو۔ اگر میری ذات سے تمہیں ذرا بھی دلچسپی ہوتی تو آج یہ بہت بڑا دھوکا نہ کھاتے۔ ابھی تمہیں معلوم ہوگا کہ تم نے کتنا بڑا نقصان اٹھایا ہے؟''

احمد جمال نے کہا۔ ''بیٹی انہیں جانے دو۔''

سعدیہ نے کہا۔ ''میں انہیں روکوں گی نہیں لیکن ہمیں دوستانہ انداز میں جدا ہونا چاہیے۔ شہریز! کیا مجھ سے مصافحہ نہیں کرو گے؟''

اس نے جھجکتے ہوئے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ پھر اپنا ہاتھ مصافحے کے لیے بڑھا دیا۔ مصافحہ ہمیشہ دائیں ہاتھ سے کیا جاتا ہے شہریز نے دایاں ہاتھ پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''ایک کا بایاں ہاتھ...... دوسرے کا دایاں ہاتھ...... بھلا مصافحہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

اس کی ہتھیلی کی پشت پر نظر پڑتے ہی شہریز ایک دم سے چونک گیا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ''یہ پیدائشی نہیں ہے۔ اب سے کوئی پانچ چھ سال پہلے نمایاں ہوا تھا۔ جب تم کینیڈا جا رہے تھے تو مجھ سے مصافحہ کرتے ہوئے تم نے اس تل کو دیکھا تھا۔ ایک ننھے سے تل کی بساط ہی کیا ہوتی ہے؟ تمہارے ذہن سے اُتر گیا۔''

شہریز کا سر چکرا رہا تھا۔ اس ننھے سے سیاہ تل نے اس کی پوری زندگی پر سیاہی پھر دی تھی۔

☆======☆======☆

اُلو

گھونگھٹ اُٹھتا ہے تو جذبوں کے بوجھ سے جھکی ہوئی نگاہیں تصور میں آتی ہیں۔ عورت کی زندگی کا یہ عجیب موڑ ہوتا ہے۔ جہاں سے وہ بے خوف وخطر نگاہیں جھکا کر گزر جاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ اس خوب صورت حادثے کو دعوت دیتی ہے، جس کے بعد زندگی ایک نئی ڈگر پر چل پڑتی ہے۔

لیکن عمار نے خواہش کا گھونگھٹ اٹھایا تو تصور کی جھکی جھکی نگاہیں ہوا ہو گئیں۔ خواہش بڑی بے باکی سے اسے ایک ٹک دیکھنے لگی۔ عمار نے ذرا جھجکتے ہوئے سوچا۔ ''یہ کیسی دلہن ہے؟''

ایک طرف تو وہ اس کے یوں تکنے پر حیران ہو رہا تھا لیکن دوسری طرف اس کی بے باکی پر پیار بھی آ رہا تھا۔ وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ رہی تھی اور وہ بے اختیار ان پیالوں میں ڈوبتا جا رہا تھا پھر اچانک یہ خواب ناک سلسلہ رک گیا۔ نگاہیں جھک گئیں، خواہش کے چہرے پر لاج اور شرم نے ڈیرے جما لیے۔ وہ شرما کر سمٹنے لگی۔

عمار نے ایک بار پھر تعجب سے سوچا۔ ''یہ کیسی دوغلی صورتِ حال ہے؟ کچھ دیر پہلے اس دلہن سے زیادہ کوئی بے باک نہیں تھا اور اب ایسا لگتا ہے، جیسے اچانک ہی کسی نے اس کے اندر لاج اور شرم کا خناس بھر دیا ہے۔''

وہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ لگتا تھا خوابوں میں آنے والا حقیقت میں چلا آیا ہے۔ وہ سوچنے لگی۔ ''شکل وصورت کے تو بہت اچھے ہیں۔ پتا نہیں دل کے کیسے ہوں گے؟''

عمار نے بڑی محبت سے اس کے ہاتھ کو تھام کر کہا۔ ''تم نے نظریں ملا کر چرا لی ہیں۔ کیا میں تمہیں اچھا نہیں لگا؟''

اس نے نظریں چرائی نہیں تھیں، جھکا لی تھیں۔ اب اس کے سوال پر سر مزید جھکتا چلا گیا۔ عمار نے اسے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''میں اس آنکھ مچولی کو کیا سمجھوں؟''

بہت سی باتیں ، بہت سے جواب تھے جو دل میں مچل رہے تھے۔ ہونٹوں تک آنا چاہتے تھے مگر زبان تو جیسے تالو سے چپک کر رہ گئی تھی۔ عمار نے ایک انگلی سے اس کی ٹھوڑی کو تھام کر چہرے کو ذرا اٹھایا۔ نظریں بدستور جھکی ہوئی تھیں اور اب تو تقریباً بند ہو چکی تھیں۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اس بے باک سی دلہن پر یہ شرمیلی دلہن کیوں حاوی ہو گئی ہے؟

وہ بڑے دھیمے لہجے میں بولا۔ ''کچھ دیر پہلے تم مجھے گہری نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ میں ان نگاہوں میں کہیں گم ہو رہا تھا۔ تم نے ایسا خوب صورت سلسلہ کیوں روک دیا؟''

خواہش کو پہلی بار احساس ہوا کہ کچھ آوازیں کانوں سے نہیں دل سے سنی جاتی ہیں۔ عمار کا لب ولہجہ سیدھا اس کے دل میں اُتر رہا تھا۔ عجیب سی خماری پیدا کر رہا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے اس کے قریب ہونے لگا۔ پہلے لمس کی آنچ دہکا رہی تھی اور اب سانسوں کی حرارت سلگانے لگی تھی۔ وہ پیچھے ہٹتے ہٹتے بیڈ کی پشت سے جا لگی۔

وہ کسی حاکم کی طرح اس کے حواس پر مسلط ہوتا جا رہا تھا، وہ محکوم بنی ہوئی تھی۔ پلکیں ہوا میں اُڑتے پردے کی طرح لرز رہی تھیں۔ جذبوں کی ہوا کبھی انہیں اٹھا رہی تھی اور کبھی جھکا رہی تھی۔

وہ دھیمی سرگوشی میں بولا۔ ''تم نے جواب نہیں دیا؟''

وہ اپنا ایک ہاتھ گلے پر رکھتے ہوئے بولی۔ ''پانی......''

عمار کو اس کی سرگوشی نے مزید بھڑکا دیا مگر اس کھنکتی ہوئی سرگوشی نے کسی جذبے کا نہیں، ضرورت کا اظہار کیا تھا۔ وہ اس سے الگ ہو کر بیڈ سے اُترتے ہوئے بولا۔ ''میں ابھی لے کر آتا ہوں۔''

وہ وہاں سے چلتا ہوا سینٹر ٹیبل کے قریب آیا۔ خواہش دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھی کہ اس قدر نازک موقع پر جبکہ منہ زور جذبے اپنی منہ زوری دکھانے والے تھے۔ اس نے ضرورت کا اظہار کر دیا تھا۔ اس کے باوجود عمار کے ماتھے پر بیزاری کی شکنیں نہیں ابھری تھیں۔ وہ بڑی تابعداری سے اس کی ضرورت پوری کر رہا تھا۔

وہ جگ اٹھا کر ایک گلاس میں پانی انڈیلنے لگا۔ خواہش کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ پہلے بھی کئی بار اسے چوری چھپے دیکھتا رہتا تھا لیکن آج اسے دلہن کے روپ میں دیکھ کر اپنی قسمت پر رشک کر رہا تھا۔ اس حسین مورتی کی پوجا کرنے کو جی چاہ رہا تھا۔

یہ اس کی لگن اور سچی محبت ہی تھی جو طرح طرح کی مخالفتوں کے باوجود خواہش کو اس کے اس قدر قریب لے آئی تھی۔ اس کے تمام عزیز و اقارب، دوست احباب اس کی محبت کی دیوانگی کو جانتے تھے۔ ایک خواہش ہی تھی جو بے خبر تھی کہ کوئی اسے پانے کے لیے دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔

اس کے دوست اکثر کہتے تھے۔ ''یار! ہمیں بڑی حیرت ہوتی ہے۔ تم اس قدر

پروفیشنل ہونے کے باوجود عشق و محبت جیسی فضولیات میں الجھ رہے ہو اور سونے پہ سہاگا یہ کہ لَو میرج بھی کرنا چاہتے ہو۔''

دوسرے دوست نے کہا۔''شیر آزاد رہ کر ہی اپنی طاقت منوا سکتا ہے، قیدی بن کر نہیں اور جب قید ہونا ہی ہے تو پھر سونے کا پنجرہ تلاش کرو۔ خواہش ایک مڈل کلاس کی لڑکی ہے۔ کم از کم اپنی اور اس کی کلاس کے فرق کو ہی سمجھو......''

وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔''محبت میں اونچ نیچ نہیں، شدت دیکھی جاتی ہے۔''

''یار! برا مت ماننا۔ تمہاری شدت یک طرفہ ہے۔''

''ہاں۔ میں جانتا ہوں۔ وہ میری محبت اور دیوانگی سے بے خبر ہے۔ اسے تب خبر ہو گی، جب ممی اس کا ہاتھ مانگنے اس کے گھر جائیں گی۔''

''یہ تمہاری بھول ہے۔ آنٹی کبھی اس تھرڈ کلاس محلے میں تمہارا رشتہ لے کر نہیں جائیں گی۔ وہ انکار کر چکی ہیں۔''

''میں ان کا انکار رضامندی میں بدل کر ہی دم لوں گا۔''

ایک دوست نے اس کے شانے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔''یار! کیوں خواہ مخواہ آنٹی کو پریشان کر رہے ہو؟ اگر خواہش تمہیں اتنی ہی اچھی لگتی ہے تو ایک رات کے لیے اسے خرید لو۔ سارے ارمان ٹھنڈے ہو جائیں گے۔ محبت کا بھوت سر سے اُتر جائے گا۔''

عمار نے ایک جھٹکے سے اٹھتے ہوئے کہا۔''مجھے جسم کی ہوس نہیں ہے۔ اگر ہوتی تو اس ایڈورٹائزنگ کمپنی کا ایم، ڈی ہونے کے ناتے نہ جانے اپنی کتنی ہی تاریک اور تنہا راتوں کو رنگین بنا چکا ہوتا۔ یہاں ایک سے بڑھ کر ایک حسین چہرے اور بھرپور جسم دکھائی دیتے ہیں لیکن بالائی اُترا ہوا دودھ پینا میری فطرت نہیں ہے۔ میں خواہش کو صرف حاصل نہیں کرنا چاہتا اس کا حاصل بھی بننا چاہتا ہوں۔''

وہ اسے دل کی گہرائیوں سے چاہتا تھا۔ اس چاہت نے ماں کو مجبور کر دیا۔ وہ بیٹے کا رشتہ لے کر خواہش کے گھر پہنچی تو اس کے گھر والے اور تمام رشتے دار حیران پریشان ہو گئے۔ کچھ رشک کر رہے تھے اور کچھ اس کی خوش قسمتی سے حسد اور جلن میں مبتلا ہو رہے تھے۔

بات ہی ایسی تھی۔ خود خواہش بھی حیرت زدہ تھی، الجھی ہوئی تھی۔ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ خوشی کے ساتھ ساتھ اندیشے اور وسوسے بھی دل میں جنم لے رہے تھے۔''ہو سکتا ہے، وہ شادی شدہ ہو اور چھپ کر دوسری شادی کر رہا ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس میں کوئی پوشیدہ بیماری ہو۔ کوئی نہ کوئی تو مسئلہ ہے۔ ورنہ یہ بڑے لوگ ہم جیسے چھوٹے لوگوں کے گھر رشتہ

جوڑنے کیوں آتے ......؟''

خواہش کے بھائیوں اور باپ نے عمار کی ہسٹری معلوم کی۔ تمام تحقیقات تسلی بخش تھیں۔ خواہش ایک ایک بات کی سن گن لے رہی تھی۔ خوش ہو رہی تھی، اپنی قسمت پر ناز کر رہی تھی۔ آخرکار بھرپور اطمینان کے بعد رشتہ کے لیے ہاں کر دی گئی۔

اس کی دیوانگی رنگ لے آئی اور وہ دلہن بن کر اس کی سیج پر آ گئی۔

اس نے پانی سے بھرا ہوا گلاس بڑے جذبے سے اسے پیش کیا۔ شادی کی پہلی رات، پہلی بار وہ کچھ پیش کر رہا تھا۔ پانی ہی سہی..... مگر انداز ایسا تھا، جیسے دل پیش کر رہا ہو۔

سہاگ کی پھولوں بھری سیج ایک طرح سے میدانِ جنگ ہوتی ہے۔ کوئی زیر ہوتا ہے، کوئی زبر ہوتا ہے۔ کسی کو حلال کرنے سے پہلے پانی پلایا جاتا ہے، وہ پانی پلا رہا تھا۔

وہ پانی پی رہی تھی۔ پانی پی پی کر کوستے ہیں۔ اپنے زیر اثر لاتے ہیں اور اس رات جو زیر ہو جائے پھر وہ تمام عمر زبر نہیں ہو پاتا۔

☆======☆======☆

دوسری صبح خواہش کی کزنز ناشتا لے کر اس کی سسرال پہنچیں تو اس نے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اماں نہیں آئیں؟''

ایک کزن نے کہا۔ ''ماں باپ بیٹی کو لینے نہیں آتے اتنا تو تمہیں معلوم ہونا چاہیے۔''

عمار نے کہا۔ ''آپ انہیں لینے آئی ہیں؟''

دوسری کزن نے کہا۔ ''کیا آپ نہیں جانتے کہ دلہن کو دوسرے دن میکے لے جایا جاتا ہے؟''

ایک اور کزن نے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔ ''دلہن کو دولہے سے ذرا دور کیا جائے تو اس کی طلب اور بڑھتی ہے۔''

دولہا بولا۔ ''یہ تو آپ میری نیند اُڑانے والی بات کر رہی ہیں۔''

خواہش خوشی سے کھل رہی تھی۔ میاں صاحب ایک ہی رات میں دیوانے ہو گئے تھے۔ ایک اور کزن نے کہا۔ ''فکرمند نہ ہوں دولہا بھائی! ہم سہاگ کی دوسری رات آپ کو تنہا نہیں رہنے دیں گے۔ آج رات ہی دلہن بیگم کو آپ کے ساتھ میکے سے روانہ کر دیں گے۔''

خواہش نے ذرا شرما کر عمار کو دیکھا۔ ایسے ہی وقت ایک ملازمہ نے آ کر کہا۔ ''آپ سب کو بیگم صاحبہ نیچے بلا رہی ہیں۔ کہہ رہی ہیں، دولہا دلہن کو تنہا ناشتا کرنے دیں۔''

وہ سب اٹھ کر جانے لگیں ایک کزن نے دروازے پر رک کر دعائیہ انداز میں ہاتھ بلند

کرتے ہوئے کہا۔ ’’ہائے ایسی سمجھ دار ساس خدا مجھے بھی دے۔‘‘

عمار نے بلند آواز میں آمین کہا پھر دروازے کولاک کر کے خواہش کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ وہ دھلی دھلائی سی لڑکی دل میں اُتر رہی تھی۔ وہ ذرا اور قریب ہو کر سرگوشی میں بولا۔ ’’جانا ضروری ہے؟‘‘

اس نے دھیرے سے ہاں کے انداز میں سر ہلایا۔ جبکہ دل کی دھڑکنیں انکار کر رہی تھیں۔ اس ساحر سے جدا نہیں ہونا چاہتی تھیں لیکن رسم دنیا نباہنا ہی پڑتی ہے۔ ایک طرف شوہر کی سحر زدہ کر دینے والی محبت اسے کھینچ رہی تھی تو دوسری طرف وہ اپنی اماں سے ملنے کے لیے بے چین ہوئی جا رہی تھی۔

ساحر نے پھر سحر پھونکا۔ ’’کوئی بات نہیں۔ رات کو ہی لینے پہنچ جاؤں گا۔‘‘

وہ میاں صاحب کی بے صبری سے محظوظ ہو رہی تھی۔ وہ دھیمی سرگوشی میں بولا۔ ’’تم نے ایک ہی رات میں مجھے اپنا عادی بنا لیا ہے۔‘‘

ہائے! یہ رشتہ بھی کیا ہوتا ہے؟ عورت اپنا سب کچھ ہار کر ایک مرد کی ساری زندگی جیت لیتی ہے۔ آج اماں سے ملنا بہت ضروری نہ ہوتا تو وہ عمار کو ایک منٹ کے لیے بھی چھوڑ کر نہ جاتی۔

جانا ضروری تھا، اتنا ضروری کہ میاں کو چھوڑنا ضروری ہو گیا۔ وہ اپنی کزنز کے ساتھ ایک بڑی سی مہنگی سسرالی کار میں بیٹھ کر میکے آ گئی۔

اماں نے اس کی بلائیں لیتے ہوئے کہا۔ ’’میری بچی......! میری جان......! تُو آ گئی؟ بڑی مہنگی گاڑی میں بیٹھ کر آئی ہے۔ محلے والوں کی تو آنکھیں پھٹ گئی ہوں گی؟‘‘

ایک کزن نے کہا۔ ’’ارے آنٹی! کیسے نہیں پھٹیں گی؟ اس محلے میں تو ٹیکسی ہی کبھی ایک دو بار آتی ہے یہ تو پھر اتنی مہنگی اور بڑی گاڑی ہے۔‘‘

دوسری کزن نے خواہش کے قریب بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ ’’اب تو تمہیں یہ گھر چھوٹا چھوٹا سا لگ رہا ہوگا۔ اتنے بڑے محل سے جو آئی ہو۔‘‘

وہ بولی۔ ’’دنیا کا کوئی محل والدین کے گھر سے بڑا نہیں ہو سکتا۔‘‘

اماں نے اس سے پوچھا۔ ’’عمار کیسا ہے؟‘‘

اس نے ذرا شرما کر سر جھکا لیا۔ ایک کزن نے کہا۔ ’’یہ کیا بتائے گی؟ ہم بتاتے ہیں، دولہا بھائی تو دیوانے ہیں، دیوانے!‘‘

اماں نے چونک کر دیکھا پھر پوچھا۔ ’’اے لڑکی! کیا کہہ رہی ہے؟ دولہا میاں کیا دماغی

مریض ہیں؟ کیا ہمارے ساتھ دھوکا ہوا ہے؟''

پھر وہ سینہ پیٹ کر بولی۔ ''آئے ہائے میری بچی کی تو قسمت پھوٹ گئی۔''

اس کے کزن نے گھبرا کر کہا۔ ''آنٹی! آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔''

''کیا غلط سمجھ رہی ہوں؟ کیا تو نے یہ نہیں کہا کہ دولہا میاں دیوانے ہیں؟''

''ہاں...... ہیں لیکن اپنی خواہش کے۔''

اماں نے ایک دم سے خوش ہو کر بیٹی کو دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر پھیلی مسکراہٹ سمجھا رہی تھی کہ وہ کزن سچ کہہ رہی ہے۔ ایک اور کزن نے کہا۔ ''خواہش نے ایک ہی رات میں دولہے صاحب پر نہ جانے کیا جادو چلایا ہے وہ تو اس کے لیے دیوانے ہوئے جارہے ہیں۔''

اماں نے خوش ہو کر بے چینی سے پہلو بدلا پھر ان کزنز سے کہا۔ ''اے لڑکیو! تم سب باہر جاؤ، ہم ماں بیٹی کو تنہائی میں باتیں کرنے دو۔ چلو باہر جاؤ۔''

ایک نے کہا۔ ''ارے آنٹی! یہ کیا بات ہوئی؟ وہاں ان کی ساس صاحبہ نے بلا لیا تھا اور یہاں آپ کمرے سے باہر نکال رہی ہیں؟ ہمیں تو کوئی خواہش کے پاس بیٹھنے ہی نہیں دے رہا ہے۔''

اماں نے ہاتھ نچاتے ہوئے کہا۔ ''ارے...... یہ کہیں بھاگی نہیں جارہی ہے۔ پورا دن پڑا ہے، کرتی رہنا باتیں۔ ابھی ہمیں دو گھڑی کے لیے تنہا چھوڑ دو۔''

وہ سب منہ بسورتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئیں۔ اماں نے جھٹ سے اٹھ کر دروازہ بند کر کے کنڈی چڑھائی اور پٹ سے آ کر بیٹی کے قریب بیٹھ گئی۔ وہ بھی ماں سے باتیں کرنے کے لیے بے چین ہوئی جارہی تھی۔ تنہائی ملتے ہی بولی۔ ''اماں! میرا تو جی چاہتا ہے، تمہارے پاؤں دھو دھو کر پیوں۔''

اماں نے خوش ہو کر کہا۔ ''میں نے تو آتے ہی تیرے چہرے پر کامیابی کی چمک دیکھ لی تھی۔ فوراً ہی سمجھ گئی تھی کہ تُو بھی میری طرح میدان مار کر آئی ہے۔''

''یہ کامیابی تمہارے دم سے ہے۔ میں تو دعا کرتی ہوں اللہ سب کو تمہاری جیسی اماں دے۔ تمہارے وظیفے نے تو ایسا کام دکھایا ہے کہ میاں صاحب ایک ہی رات میں لٹو ہو گئے ہیں۔''

اماں خوشی سے کھلی جارہی تھی پھر بولی۔ ''ارے یہ تو شروعات ہے۔ آگے آگے دیکھ ہوتا ہے کیا؟ اپنی اماں کی ہدایت پر عمل کرتی رہ...... پھر دیکھ کیسے خوشیاں سمیٹتی رہے گی؟ میاں پیسے والا ہو تو اسے مٹھی میں کر کے رکھنا ضروری ہوتا ہے۔''

خواہش کو سہاگ رات کا وہ منظر یاد آیا، جب عمار نے اس کا گھونگھٹ اٹھایا تھا۔ تب وہ ایک ٹک اسے تکے جارہی تھی اور عمار کے چہرے پر حیرانی و پریشانی کے سائے لہرا رہے تھے۔ وہ زیرلب مسکرانے لگی۔

اماں نے اسے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھ کر پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟ کیوں مسکرا رہی ہو؟''

وہ ذرا چونک کر بولی۔ ''کچھ نہیں۔ بس رات کی بات یاد آ گئی تھی۔ تمہاری ہدایت کے مطابق جب میں نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنا وظیفہ پڑھنا شروع کیا تو وہ حیرت سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ سوچ رہے ہوں گے یہ کیسی دلہن ہے جو ایسی بے باکی سے دولہا کو دیکھے جارہی ہے؟''

اماں نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ ''تُو اس کی سوچ کو چھوڑ۔ یہ بتا کہ وظیفہ پورا کیا تھا یا نہیں؟ یا شرما کر نظریں تو نہیں جھکا لی تھیں؟''

''اب میں ایسی بھی نادان نہیں ہوں کہ اپنا وظیفہ ادھورا چھوڑ دیتی۔ تم نے کہا تھا، یہ وظیفہ تب ہی اپنا زیادہ اثر دکھاتا ہے، جب دلہن پہلی رات دولہا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے پڑھے۔ تو میں ایسی رات کو اور ایسے موقع کو کیوں ضائع کرتی؟''

ماں نے شاباش دینے کے انداز میں اس کے شانے کو تھپکتے ہوئے کہا۔ ''بس میری بچی! اسی طرح دانش مندی کا مظاہرہ کرتی رہ اور میرے مشوروں پر چلتی رہ۔ میں شوہر کو اُلو بنانے کے ایک سو ایک وظیفے جانتی ہوں۔''

خواہش نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اور یہ وظائف محلے بھر کی عورتوں کو بتاتی رہتی ہو۔ خود ابا پر بھی آزماتی رہتی ہو۔''

اماں نے ذرا فخریہ انداز میں کہا۔ ''دیکھتی نہیں کہ وہ کیسے میرے آگے پیچھے گھومتے رہتے ہیں؟ کیا تُو نہیں چاہے گی کہ عمار بھی تیری ہر بات مانے، یوں سمجھ کہ اُلو بنا رہے۔''

''میں کیوں نہیں چاہوں گی؟ تمہارے وظیفے تو میرے لیے یوں بھی ضروری ہیں۔ مجھے دولت مند اور خوب رُو شوہر ملا ہے۔ انہیں تمہارے تعویذ ہی میرے قابو میں رکھ سکتے ہیں۔ ورنہ میرے پاس کیا ہے؟ صرف اچھی صورت ...... اور یہ کب تک رہے گی؟ وہ تو ایڈورٹائزنگ کمپنی کے ایم، ڈی ہیں۔ وہاں نہ جانے کتنی حسین لڑکیاں ان کے آگے پیچھے پھرتی ہوں گی۔ ایسے میں تمہارے تعویذ ہی میرے کام آ سکتے ہیں۔''

''تُو فکر نہ کر! میرے مشورے پر ہی تیرے باپ بھائیوں نے تجھے یہاں سے رخصت

کر کے اس محل میں پہنچایا ہے۔اب تجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے وہاں بسائے رکھنا میری ذمے داری ہے۔''

دروازے پر دستک دی گئی پھر ایک کزن کی آواز سنائی دی۔''بس کریں آنٹی! باہر آجائیں۔اب ہمیں بھی اس کے پاس بیٹھنے کا موقع دیں رات کو دولہا صاحب آئیں گے اور اسے لے جائیں گے پھر نہ جانے کب ہماری ملاقات ہو گی؟''

اماں بیزاری سے اور نا گواری سے اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھی، پھر ٹھٹک گئی، پلٹ کر دھیمی آواز میں بولی۔''ارے ہاں ...... یہ تو بتا وظیفہ مکمل ہونے کے بعد آزمایا بھی تھا۔ کہاں تک کامیابی ہوئی؟''

''تم نے کہا تھا کہ آزمانے کے لیے میاں صاحب سے پانی مانگنا۔اگر وہ پہلی رات پانی پلا دے تو سمجھو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تمہارا غلام بن گیا ہے۔ میں نے جیسے ہی پانی مانگا انہوں نے فوراً ہی بڑی تابعداری سے مجھے پانی لا کر دے دیا۔''

اماں تیزی سے چلتی ہوئی اس کے قریب آئی پھر اس کے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر پیشانی کو چومتے ہوئے بولی۔''میں صدقے، میں واری ...... مجھے اندازہ تھا کہ تُو شوہر کو لٹو بنانے کے معاملے میں مجھ سے پیچھے نہیں رہے گی۔ یہ ٹوٹکا یاد رکھ، جو شوہر پہلی رات پانی پلائے وہ ساری عمر بیوی کے آگے پانی بھرتا رہتا ہے۔''

ایک بار پھر دروازے پر دستک ہوئی۔ محلے کی ایک عورت کی آواز سنائی دی۔''ارے اماں! ہمیں بھی دلہن کے پاس بیٹھنے کا موقع دے دو۔''

اماں نے نا گواری سے دروازے کی طرف دیکھا پھر زیرلب بڑابڑاتی ہوئی دروازے کی طرف چلی گئی۔ خواہش سر جھکا کر مسکرا کر سوچنے لگی کہ شادی سے پہلے وہ اتنی اہم تو نہیں تھی، جتنی کہ اب ہو گئی ہے۔ واقعی دولت کیسے شخصیت کو بدل دیتی ہے۔ دلہن تو یوں بھی اہم ہوتی ہے، اگر لڑکی کو اونچے گھرانے میں بیاہ دیا جائے تو اس کی اہمیت کچھ زیادہ ہی بڑھ جاتی ہے۔ ایسا ہی کچھ خواہش کے ساتھ بھی ہو رہا تھا۔

اماں نے دروازہ کھولا تو لڑکیوں کا ایک ٹولا کمرے میں گھستا چلا آیا۔ان کے ساتھ محلے کی عورتیں اور بچے بھی تھے۔ سب ہی اس مہنگی کار میں آنے والی شہزادی کو دیکھنے آئے تھے۔ یوں لگ رہا تھا، جیسے وہ سب خواہش سے پہلی بار مل رہے ہیں۔ عورتوں نے اندر آتے ہی اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔کوئی اس کے لباس کی تعریف کر رہی تھی، کوئی زیور کو گھور رہی تھی۔ کسی کو اس کے کنگن پسند آ رہے تھے تو کسی کو انگوٹھیاں اپنی طرف کھینچ رہی تھیں۔

ایک عورت نے اپنے دوسالہ بچے کواس کی گود میں بٹھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ میرا بچہ ایسا ہے کہ جس نئی دلہن کی گود میں بیٹھتا ہے۔اس دلہن کی ایک سال کے اندر اندر گود ہری ہو جاتی ہے۔“

وہ بچہ خواہش کی گود میں بیٹھ کر اس کے مہنگے سوٹ پر کیے گئے دبکے کے کام کو نوچنے لگا۔خواہش کو بیزاری ہو رہی تھی۔ وہ عورت تو جیسے اپنے بچے کو اس کی گود میں بٹھا کو بھول ہی گئی تھی۔

خواہش کے دماغ میں ایک ترکیب آئی۔ اس نے دھیرے سے اس بچے کے جسم پر چٹکی بھری تو وہ بلبلا کر رونے لگا۔اس نے فوراً ہی اسے اس کی ماں کے حوالے کر دیا۔

وہ کچھ دیر تک عورتوں کے درمیان بیٹھی ہنستی بولتی رہی پھر اس نے اپنی ایک کزن سے سرگوشی میں کہا۔ ”روبی! میں تو تھک گئی۔ کچھ دیر کے لیے لیٹنا چاہوں گی۔ پلیز......ان سب کو جانے کے لیے کہو۔“

”کیسی باتیں کر رہی ہو۔ میں انہیں نکالوں گی تو یہ سب مجھ پر پل پڑیں گی۔ جھگڑا کریں گی کہ میں انہیں تمہارے پاس بیٹھنے نہیں دے رہی ہوں۔“

”تو پھر اماں سے کہو وہی کچھ کریں گی۔ پلیز جاؤ۔ تھکن کے مارے میری حالت خراب ہو رہی ہے اور یہ ہیں کہ ان کی باتیں ختم نہیں ہو رہی ہیں۔“

”اچھا ٹھیک ہے میں ہی آنٹی سے کہتی ہوں۔“

روبی وہاں سے اٹھ کر کمرے سے باہر چلی گئی۔اس کے جانے کے کچھ دیر بعد ہی اماں اندر آئی۔ کولہے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ”اے بنو! تمہیں کچھ احساس ہے، بچی تھکی ہوئی آئی ہے۔اسے ذرا آرام کرنے دو تم لوگوں نے تو آتے ہی بے چاری کو گھیر لیا ہے۔“

ایک عورت نے کہا۔ ”اے لو......ساری دلہنیں ہی تھکی ہوئی میکے آتی ہیں۔ ہم بھی آئی تھیں لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ آتے ہی چادر تان کر سو جاتیں۔ ہمیں اس کی تھکن کا احساس ہے، ہم نے سلامی دی ہے، کچھ دیر تو اور بیٹھنے دو۔“

دوسری عورت نے اس کی تائید میں کہا۔ ”اور نہیں تو کیا؟ منہ دکھائی دی ہے، منہ تو دیکھ لینے دو۔“

اماں نے ہاتھ نچاتے ہوئے کہا۔ ”اے ہے، میری بیٹی کا منہ ہے یا دوسو گز کا پلاٹ، جو ابھی تک دکھائی ہی نہیں دیا؟ اتنی تو منہ دکھائی نہیں دی ہوگی، جتنی آنکھیں سینک رہی ہو۔“

ایک عورت نے اماں سے کہا۔ ”دولت مند گھرانے میں رشتہ ہوتے ہی تمہارا تو لہجہ بدل گیا ہے۔ قسمت بیٹی کی بدلی اور مزاج اماں کا بدل گیا۔“

اماں نے غصے سے کہا۔ ''اے خبردار! میرے منہ نہ لگنا ورنہ میں ایک ایک کے گھر جا کر بتا دوں گی کہ تم سب مجھ سے کیسے کیسے تعویذ لے جاتی ہو؟''

سب عورتوں کو جیسے چپ سی لگ گئی۔ وہ چور نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔ وہ محلے بھر میں تعویذ والی اماں کے نام سے مشہور تھی۔ ہر کوئی اس سے اپنی اپنی ضرورت کے مطابق تعویذ لے کر جاتی تھی۔ اس طرح ان سب عورتوں کی کوئی نہ کوئی کمزوری اماں کے پاس رہتی تھی۔

کسی نے اپنی ساس کو اس کے وظیفوں یا تعویذ گنڈوں کے ذریعے اپنے زیر اثر لانے کی کوشش کی تھی۔ کوئی اپنے بیٹے کو باغی ہونے سے بچانے کے لیے اس کے تعویذوں کا سہارا لے رہی تھی۔ کوئی اپنے شوہر کو مٹھی میں رکھنے کے لیے اس کے دم درود کی محتاج رہتی تھی۔

تعویذ والی اماں کے پاس جادو ٹونے اور عملیات کرنے کی بہت سی کتابیں تھیں۔ ان کتابوں میں ہر مسئلے اور ہر بیماری کا علاج اور حل جادو ٹونا یا وظائف کی صورت میں لکھا گیا تھا۔ عمل کرنے کے ایسے ایسے طریقے بتائے گئے تھے کہ جنہیں عقل تسلیم نہیں کرتی تھی۔

مثلاً یہ کہ اگر کسی شخص کو اپنا مطلوب بنانا مقصود ہو اور وہ کسی دوسرے شہر میں ہو تو ایسی صورتِ حال میں تعویذ والی اماں چینی پر کچھ پڑھ کر دیتی تھی اور کہتی تھی کہ اپنے گھر کے کسی کونے میں ڈال دینا۔ چیونٹیاں اسے کھاتی جائیں گی اور وہ مطلوب تمہارا ہوتا چلا جائے گا۔

خواہش کے گرد بیٹھی عورتیں ایک ایک کر کے رخصت ہونے لگیں۔ کچھ ہی دیر میں کمرا خالی ہو گیا۔ اماں نے خواہش سے کہا۔ ''تم نے زبیدہ کی سنی؟ کیسے کہہ رہی تھی کہ قسمت تیری بدلی ہے اور مزاج میرا بدل گیا ہے۔ اونہہ...... اپنے وہ دن بھول گئی، جب میاں کے لیے روتی ہوئی میرے پاس آئی تھی کہ وہ دوسری شادی کرنے والا ہے اور بڑے دھڑلے سے ہونے والی سوکن کے گھر آتا جاتا ہے۔ اس وقت میں نے اسے ایک تعویذ دیا تھا اور اسے شوہر کے تکیے میں رکھنے کو کہا تھا۔ تب سے اب تک اس نے ہونے والی سوکن کے گھر کا رخ نہیں کیا ہے۔ دوسری شادی کا نام بھی نہیں لیتا ہے اور آج یہ میرے احسان کو بھلا کر مجھے طعنے دے رہی ہے؟''

خواہش نے نیم دراز ہوتے ہوئے کہا۔ ''چھوڑو اماں! یہ سب ایسی ہی احسان فراموش ہیں۔ منہ پر تمہارے گن گاتی ہیں اور پیٹھ پیچھے برائیاں کرتی ہیں۔ تم کس کس سے نمٹو گی؟''

''زبیدہ شاید مجھے جانتی نہیں ہے۔ میں ایسا الٹا عمل کروں گی کہ دوسرے ہی دن سوکن اس کے سینے پر مونگ دلنے چلی آئے گی۔''

”مٹی ڈالو اس بات پر۔ کیوں خواہ مخواہ الٹا عمل کر کے اپنی جان خطرے میں ڈالنا چاہ رہی ہو؟ مجھے قدم قدم پر تمہاری رہنمائی کی ضرورت ہے۔ دوسروں کے پھڈے میں نہ پڑو۔“

خواہش کو اپنی ذات سے زیادہ اماں کے وظیفوں اور تعویذوں پر بھروسا تھا۔ جو اس کی سوچ کے مطابق آئندہ اس کی ازدواجی زندگی میں اہم کردار ادا کرنے والے تھے۔ اسے فخر تھا کہ سب کی تعویذ والی اماں اس کی اپنی سگی اماں ہے۔

☆======☆======☆

شادی کو ایک ماہ گزر گیا۔ اس دوران میں عمار نے اسے بھرپور محبتیں دیں۔ اس کی دیوانگی خواہش پر ظاہر ہوتی جا رہی تھی۔ وہ بھی اسے ٹوٹ کر چاہنے لگی۔ بڑی دیانت داری سے ایک وفا شعار بیوی کے فرائض ادا کر رہی تھی۔

عمار کی یہ خوش نصیبی تھی کہ اسے اپنی ہم مزاج شریکِ حیات ملی تھی۔ اسے لڑکیوں کے چہرے پر میک اَپ تھوپنا اور بال ترشوانا اچھا نہیں لگتا تھا۔ وہ قدرتی حسن کا دلدادہ تھا اور اتفاق سے خواہش بھی یہی مزاج رکھتی تھی۔ وہ الٹے سیدھے جھمیلوں میں الجھ کر اپنا چہرہ بگاڑنے کی قائل نہیں تھی۔ یوں عمار کے حسنِ نظر کو اس کے قدرتی حسن سے تسکین ملتی رہتی تھی۔

خواہش یہ سب جاننے کے باوجود عورت کی فطرت کے مطابق ذرا پریشان ہی رہتی تھی کہ کہیں کوئی میک اَپ زدہ چہرہ اس کے شوہر کے دل میں جگہ نہ بنا لے۔

وہ ایک اعلیٰ اور بڑے گھرانے کا چشم و چراغ تھا۔ اپنے ہی جیسے کسی اونچے گھرانے میں شادی کر سکتا تھا مگر وہ جانتا تھا کہ ایسی شادی میں کہیں نہ کہیں سے لالچ یا خود غرضی کا پہلو ضرور نکلتا ہے۔ کسی نہ کسی چیز کا لین دین ضرور ہوتا ہے، اور وہ ایسی کاروباری شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے خواہش کا انتخاب کیا۔ کیونکہ وہ اسے یا اس کے وسیع و عریض کاروبار کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔ اس شادی میں کوئی کاروباری لین دین نہیں ہوا تھا۔ یوں یہ ہونے والا نیا بے غرض رشتہ عمار کو بھرپور خوشیاں دے رہا تھا۔

خواہش نے ایک ماہ گزر جانے کے بعد بھی اس کی دولت کا حساب لینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ عمار کی دولت سے نہیں، اس سے محبت کرتی ہے اور یہی حقیقت بھی تھی۔ اسے دولت اور جائیداد اپنے نام کروانے کے بجائے یہ فکر لاحق رہتی تھی کہ وہ ایسا کیا کرے کہ ہمیشہ ہمیشہ عمار کے نام سے وابستہ رہے۔ کسی دوسری کو یہ نام نہ ملے۔

وہ امیر گھرانے کی بہو بنی تھی۔ اس لیے ذرا سہمی ہوئی رہتی تھی۔ اس کی ساس ایک تنظیم کی سربراہ تھی۔ سوشل ورکر ہونے کی حیثیت سے اس کا زیادہ وقت گھر سے باہر ہی گزرتا تھا۔

بہو سے بہت کم سامنا ہوتا تھا اور جب ہوتا تھا تو وہ بہو ہونے کی حیثیت سے اس کی خوب خدمت کرتی تھی۔

شروع شروع میں تو ساس کا رویہ اسے مایوس کرتا رہا لیکن جس طرح پانی قطرہ قطرہ پتھر کے سینے میں اپنی جگہ بنالیتا ہے۔ اسی طرح اس کی خدمت گزاری نے دھیرے دھیرے اس کے دل میں اس کے لیے جگہ بنا دی۔ وہ خدمت گزاری کے علاوہ اس کو رام کرنے کے لیے اماں کے بتائے ہوئے وظیفے بھی پڑھتی رہتی۔

ایک شام عمار گھر آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک پیکٹ دیکھ کر اس نے خوشی سے پوچھا۔

''کیا میرے لیے کچھ لائے ہیں؟''

وہ اس لفافے کو سینٹر ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولا۔ ''نہیں...... اس پیکٹ میں تصویریں ہیں۔''

وہ ٹائی کی گرہ ڈھیلی کرتا ہوا واش روم کی طرف چلا گیا۔ اس نے پیکٹ کو اٹھا کر الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''اس میں کون سی تصویریں ہیں؟''

وہ دروازے سے جھانک کر بولا۔ ''کھول کر دیکھ لو۔''

اس نے اس لفافے کو کھولا تو لڑکیوں کی بے شمار تصویریں نکلتی چلی آئیں۔ ان میں چند تصویریں لڑکوں کی بھی تھیں۔ وہ ایک ایک تصویر کو اٹھا کر دیکھنے لگی۔ کچھ دیر بعد عمار واش روم سے باہر آیا تو اس نے پوچھا۔ ''آپ کی دراز میں پہلے سے ہی اتنی ساری تصویریں ہیں۔ اب یہ مزید لے آئے ہیں۔ اتنی تصویروں کا کیا کریں گے؟''

وہ مسکرا کر بولا۔ ''ان ڈھیر ساری تصویروں میں سے صرف دو ماڈل گرلز سلیکٹ کرنی ہیں۔ ہم نیا پروجیکٹ شروع کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں بڑی مغز ماری کرنا پڑتی ہے۔ آفس میں وزیٹرز پیچھا نہیں چھوڑتے۔ اسی لیے تو میں دفتر کا کام گھر پر ہی لے آتا ہوں۔''

وہ میز پر بکھری تصویروں کو سمیٹتے ہوئے بولی۔ ''چائے پئیں گے؟''

''ہاں...... ضرور، مگر تمہارے ہاتھوں کی بنی ہوئی''۔ یہ کہہ کر اس نے خواہش کے ہاتھوں کو چوم لیا۔ وہ ایسا ہی دیوانہ تھا، وقت بے وقت اسے چوم لیا کرتا تھا اور وہ اس کی یہ دیوانگی دیکھ کر ہی دل ہی دل میں پہلے خدا کا اور پھر اپنی اماں کا شکر ادا کرتی رہتی تھی۔ اس کی سمجھ میں یہی بات آ رہی تھی کہ پہلی رات پڑھے گئے وظیفے کے اثر میں شدت آتی جا رہی ہے۔ عمار اس کا دیوانہ ہوتا جا رہا ہے۔

وہ چائے بنا کر لائی تو عمار سینٹر ٹیبل پر جھکا ہوا ان تصویروں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ پیالی اس

کی طرف بڑھاتے ہوئے مسکرا کر بولی۔ ’’بڑی توجہ سے تصویریں دیکھی جارہی ہیں؟‘‘

اس نے چونک کر اسے دیکھا پھر پیالی لیتے ہوئے مسکرا کر بولا۔ ’’ہاں ...... بھرپور توجہ دینے کے بعد بھی الجھ رہا ہوں۔‘‘

’’کیوں الجھ رہے ہیں؟ کیا کوئی مسئلہ ہے؟

اس نے اس کا بازو پکڑ کر ایک جھٹکے سے اپنے قریب بٹھاتے ہوئے کہا۔ ’’مسئلہ یہ ہے محترمہ! کہ جب میں ان تصویروں کو دیکھتا ہوں تو ماڈل گرل کے چہرے کے بجائے مجھے تمہاری صورت نظر آنے لگتی ہے۔ تم مجھے بہت تنگ کرتی ہو۔ ہر وقت میرے دل و دماغ پر ڈیرے جمائے رکھتی ہو۔‘‘

وہ بڑی محبت سے شکایت کر رہا تھا اور اس کے چہرے کے نقوش پر یوں انگلیاں پھیر رہا تھا۔ جیسے بھول بھلیوں میں گم ہو کر راستہ تلاش کر رہا ہو۔ وہ اس کے لمس سے پگھلی جارہی تھی پھر ایک دم سے سنبھل کر اس سے الگ ہوتے ہوئے بولی۔ ’’آپ کی چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔‘‘

اس نے مسکرا کر پیالی اٹھائی پھر ایک چسکی لینے کے بعد کہا۔ ’’تم بھی میری طرح حسین نظر رکھتی ہو۔ خوب صورتی کے پہلوؤں کو سمجھتی ہو۔ آج ماڈل گرلز سلیکٹ کرنے کے سلسلے میں تمہیں میری مدد کرنا ہوگی۔‘‘

’’مجھے یہ کام کر کے خوشی ہوگی۔‘‘

وہ ان تصاویر کو سینٹر ٹیبل پر اِدھر سے اُدھر پھیلاتے ہوئے بولا۔ ’’مجھے دو ماڈل گرلز کی ضرورت ہے۔ تم دیکھو، ان میں سے کون کون سی بہتر ہیں؟‘‘

وہ ایک ایک تصویر کو غور سے دیکھنے لگی۔ ایسے ہی وقت عمار کے موبائل کا بزر سنائی دیا۔ اس نے اسے آن کر کے کان سے لگا کر کہا۔ ’’ہیلو......!‘‘

وہ کچھ دیر تک دوسری طرف کی باتیں سنتا رہا پھر بولا۔ ’’یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ اگر وہ دونوں مجرا کرنے والی راضی ہیں تو پھر ہمیں کسی دوسری ماڈل گرل کی ضرورت نہیں ہوگی۔‘‘

وہ پھر کچھ دیر خاموش رہ کر دوسری طرف کی باتیں سنتا رہا۔ خواہش مجرا کرنے والیوں کے بارے میں سن کر چونک گئی تھی۔ اس نے فون پر کہا۔ ’’ان سے معاملات طے کرنے کے لیے ہمیں کوٹھے پر جانا ہوگا۔ وہ ہماری ڈیمانڈ کے مطابق ہیں۔ اگر راضی ہو جاتی ہیں تو یہ بہت اچھی بات ہوگی۔ ہمارے پروجیکٹ کے خواب کو تعبیر مل جائے گی۔‘‘

وہ دوسری طرف کی باتیں سن کر بولا۔ ’’تم ابھی ان سے رابطہ کرو۔ ہم آج رات ہی تمام معاملات طے کر لیتے ہیں۔ تم وقت مقرر کر کے مجھے فون کرو۔ میں تیار رہوں گا۔‘‘

اس نے فون کا ایک بٹن دبا کر رابطہ ختم کر دیا پھر خواہش سے کہا۔ ''رات کو کام کے سلسلے میں شاید مجھے باہر جانا پڑے۔''

خواہش کا دل ڈوب رہا تھا۔ اس نے دھیمی آواز میں پوچھا۔ ''آپ کوٹھے پر جائیں گے؟''

''ہاں...... اشتہاری فلموں کے لیے وہاں سے بھی لڑکیوں کو ارینج کیا جاتا ہے۔''

''کیا آپ کا وہاں جانا بہت ضروری ہے؟''

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ''یس مائی ڈیئر! بزنس جہاں لے جاتا ہے، وہاں جانا ہی پڑتا ہے۔''

پھر وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ ''میں محسوس کر رہا ہوں۔ تم میرے وہاں جانے کی بات پر کچھ پریشان ہوگئی ہو۔''

اس نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔ وہ اس کے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر اٹھاتے ہوئے بولا۔ ''شوہر کوٹھے پر جائیں تو بیویاں اسی طرح پریشان ہو جایا کرتی ہیں مگر میرے اور دوسروں کے وہاں جانے میں بڑا فرق ہے۔ میں بزنس ڈیلنگ کے لیے جا رہا ہوں۔ تمہیں گھبرانا نہیں چاہیے۔ مجھ پر اعتماد کرنا چاہیے۔ میں تمہارا ہوں تمہارا ہی رہوں گا۔''

وہ ایک ذرا مطمئن ہو کر مسکرائی پھر بولی۔ ''مجھے آپ پر بھروسا ہے۔''

وہ اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر بولا۔ ''دیٹس لائیک آ گڈ وائف......''

خواہش اس کے سینے سے لگی ہوئی تھی۔ دو دل باہم دھڑک رہے تھے۔ اس کے ہونٹ خواہش کی گردن پر ادھر سے اُدھر رینگ رہے تھے۔ وہ اس کی قربت میں گم ہوتا چلا جا رہا تھا۔

رات کے تقریباً نو بجے عمار کے موبائل کا بزر سنائی دیا۔ اس نے اسے آن کر کے کان سے لگاتے ہوئے پوچھا۔ ''ہاں بولو بات بنی......؟''

دوسری طرف سے کچھ کہا گیا پھر اس نے رابطہ ختم کر دیا۔ خواہش اس وقت ساس کے کمرے میں تھی۔ وہ جانے کے لیے تیاری کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ کمرے میں آئی تو وہ تیار ہو چکا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ''آپ جا رہے ہیں؟ کیا فون آیا تھا؟''

''ہاں جا رہا ہوں۔ تقریباً ایک دو گھنٹے میں واپسی ہوگی۔''

وہ اپنا ایک ہینڈ بیگ اٹھا کر جانے لگا پھر اس کے قریب آ کر اس کی پیشانی کو چومتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں مجھ پر بھروسا ہے نا؟''

وہ مسکرا کر اس کی گردن میں باہیں ڈالتے ہوئے بولی۔ ''مجھے بھروسا ہے اور پھر آپ

ہی نے تو کہا ہے کہ آپ میرے ہیں، میرے ہی رہیں گے۔ وہاں جانا آپ کے بزنس کی مجبوری ہے۔''

''مجھے خوشی ہے کہ تم میرے بزنس کو سمجھ رہی ہو اور میرے ساتھ کوآپریٹ کر رہی ہو۔''

عمار کو اس پر پیار آ رہا تھا۔ وہ عام بیویوں سے مختلف تھی۔ شوہر کی سچی اور کھری محبت کو سمجھتی تھی۔ اسی لیے کھلے دل سے اسے کوٹھے پر جانے کی اجازت دے رہی تھی۔

وہ کچھ دنوں بعد اپنے میکے گئی تو وہاں اماں اسٹول پر چڑھی صحن میں لگے ہوئے درخت کی شاخوں سے الجھ رہی تھی۔ ایک طرف محلے کی ایک عورت کھڑی ہوئی تھی۔ خواہش نے اس عورت کو سلام کرنے کے بعد بلند آواز میں پوچھا۔ ''اماں! وہاں کیا کر رہی ہو؟''

اماں کے بجائے اس عورت نے جواب دیا۔ ''ایک تعویذ باندھ رہی ہیں۔''

''کیسا تعویذ؟''

وہ بولی۔ ''میرا داماد میری بیٹی کے ساتھ بہت زیادتی کر رہا ہے اسے مارتا پیٹتا رہتا ہے۔ میں نے یہ بات اماں کو بتائی تو انہوں نے ایک تعویذ لکھا ہے اور اب اسے اس ہرے بھرے پودے میں باندھ رہی ہیں۔ تاکہ ان میاں بیوی کی محبت ہمیشہ ہری بھری رہے۔''

عمار نے اسے موبائل دے رکھا تھا۔ تاکہ وہ جہاں کہیں بھی ہو، اس کے رابطے میں رہے۔ وہ صحن میں کھڑی اس عورت سے باتیں کر رہی تھی ایسے ہی وقت اس کے موبائل کا بزر سنائی دیا۔ اس نے اسے آن کر کے کان سے لگایا پھر کہا۔ ''جی!''

دوسری طرف سے پیار بھری آواز سنائی دی۔ ''پہنچ گئیں، یا ابھی راستے میں ہو؟''

''ابھی پہنچی ہوں اور آتے ہی آپ کا فون آ گیا۔''

وہ کچھ دیر تک دوسری طرف کی باتیں سنتی رہی، مسکراتی رہی پھر بولی۔ ''ہاں ہاں بابا...... میں خیریت سے پہنچ گئی ہوں۔''

اماں اسٹول پر سے اُتر چکی تھی اور خوش ہو کر بیٹی کو دیکھ رہی تھی۔ وہ فون پر بولی۔ ''آپ کی آواز کٹ کٹ کر آ رہی ہے۔ سگنل کی کمی ہے۔ میں فون بند کر رہی ہوں۔ بعد میں رابطہ کروں گی۔''

اس نے ایک بٹن دبا کر رابطہ ختم کر دیا۔ وہ عورت جو اماں کے پاس تعویذ لینے آئی تھی بڑی حسرت سے خواہش کو دیکھ رہی تھی پھر بولی۔ ''اماں! میری بیٹی کے لیے بھی کچھ ایسا ہی کرو کہ وہ اپنی سسرال میں سکھی رہے۔''

اماں نے کہا۔ ''تُو فکر نہ کر۔ یہ تعویذ جو میں نے باندھا ہے نا......؟ بڑی کرامت والا

ہے۔ ایک ہفتے کے اندر ہی اندر اپنا اثر دکھانا شروع کر دے گا۔''

وہ مطمئن ہو کر چلی گئی۔ وہ دونوں ایک کمرے میں آ کر بیٹھ گئیں۔ اماں نے پوچھا۔ ''اور سنا...... سب خیریت تو ہے نا؟''

وہ خوش ہو کر بولی۔ ''جہاں تمہارے وظیفے پہنچ جائیں، وہاں خیریت نہ ہو؟ یہ ناممکن سی بات ہے۔''

اماں اپنی تعریف سن کر خوش ہو گئی پھر بولی۔ ''میں تو تیرے لیے دن رات دعائیں مانگتی رہتی ہوں۔ اتنے بڑے گھر میں شاد و آباد رہنا بچوں کا کھیل تھوڑا ہے؟ اچھا یہ بتا، عمار کا رویہ تیرے ساتھ کیسا ہے؟''

''ان کی تو نہ ہی پوچھو۔ پہلی رات پانی پلا کر آج تک میرے آگے پانی بھر رہے ہیں۔ تم نے صحیح کہا تھا، پہلی رات تابعداری کرنے والا شوہر عمر بھر تابعداری کرتا رہتا ہے۔''

اماں ایک ذرا فخر سے بولی۔ ''یہ سب میرے وظیفے کی کرامات ہیں۔''

''اور تو اور اب ساس صاحبہ بھی مجھ سے خوش رہنے لگی ہیں، کہتی ہیں کہ میں اس گھر کے لیے خوش قدم ثابت ہوئی ہوں۔ میرے وہاں جانے کے بعد سے ان کے بیٹے کے کاروبار میں ترقی ہوئی ہے۔''

''تُو میرے بیٹی ہے، خوش قدم کیسے نہ ہوتی؟ تجھے رخصت کرتے وقت میں نے تجھ پر دم کیا تھا۔ اب بھی ہر شام صحن میں آ کر دم کرتی ہوں۔ تیری کوٹھی کی طرف رخ کر کے پھونکیں مارتی ہوں۔ آخر یہ سب عملیات اپنا اثر تو دکھائیں گے نا؟''

اس نے قائل ہونے کے انداز میں سر ہلایا۔ اماں نے ذرا سرگوشی میں پوچھا۔ ''یہ بتا...... میاں پر بھی نظر رکھتی ہے یا صرف اپنی تعریفیں ہی سن کر خوش ہوتی رہتی ہے؟ میاں زیادہ دیوانگی ظاہر کرے تو بیوی کو چوکنا ہو جانا چاہیے۔''

اس نے سوالیہ نظروں سے ماں کو دیکھا پھر کہا۔ ''اماں! تم کیا چاہتی ہو؟ کیا میں ان کی محبت پر شبہ کروں؟''

''آں ہاں...... تُو میری بات سمجھی نہیں۔ میں داماد جی کی مصروفیات پر نظر رکھنے کو کہہ رہی ہوں کہ وہ کس وقت گھر سے دفتر جاتے ہیں؟ اور کس وقت واپس آتے ہیں؟ کسی دن دیر ہو جائے تو کیا بہانے کرتے ہیں؟ تجھے ان ہی چھوٹی چھوٹی باتوں پر نظر رکھنا ہوگی۔''

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ''میں ان کی کس مصروفیت پر نظر رکھوں؟ شادی سے اب تک وہ آفس ٹائم سے پہلے ہی گھر آ جاتے ہیں اور اب تو دفتر کا کام بھی گھر میں لے آتے ہیں۔

اپنے ایڈورٹائز کے لیے مجھ سے لڑکیاں پسند کرواتے ہیں۔''

اماں نے ذرا تعجب سے پوچھا۔''کیا تُو ان لڑکیوں کو دیکھنے کے لیے دفتر جاتی ہے؟''

''ارے نہیں۔ وہ ان کی تصویریں لے آتے ہیں پھر جسے میں پسند کرتی ہوں اسے ہی اپنی اشتہاری فلم میں کام دیتے ہیں۔''

اماں نے ذرا سوچنے کے انداز میں اپنی ٹھوڑی پر ہاتھ رکھ کر کہا۔''اس کا مطلب ہے، داماد جی کے پاس لڑکیوں کی تصویریں رہتی ہیں؟''

اس نے مسکرا کر کہا۔''کوئی ایک دو نہیں۔ درجنوں تصویریں ان کی دراز میں بھری پڑی ہیں۔''

''داماد جی کے پاس لڑکیوں کی تصویریں رہتی ہیں اور تُو یہ بات مجھے مسکرا کر بتا رہی ہے؟ اری کیوں ان آستین کے سانپوں کو دراز میں رکھ کر اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار رہی ہے؟''

''تم کہنا کیا چاہتی ہو؟''

''اب کیا یہ بھی مجھے سمجھانا پڑے گا۔ اری نادان لڑکی! شوہر جوان لڑکیوں کی تصویروں سے دل بہلاتا ہے اور تجھے کوئی پرواہ ہی نہیں ہے؟''

''وہ دل نہیں بہلاتے، اپنا کام کرتے ہیں۔''

''ارے میں صدقے تیری معصومیت پر میری بچی! تُو میری بیٹی ہو کر ایسی نادانی کی باتیں کرے گی، میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔''

''میں کیا نادانی کر رہی ہوں؟''

''میاں کو شہہ دے رہی ہے اور مجھ سے پوچھ رہی ہے کہ کیا نادانی کر رہی ہے؟ داماد جی کام کا بہانہ کر کے جوان لڑکیوں کی تصویروں سے اپنی آنکھیں سینکتے ہیں۔ گھر سے باہر نہ جانے کہاں کہاں جا کر گل چھرّے اُڑاتے ہوں گے؟''

''تم اس طرف سے مطمئن رہو۔ وہ جہاں جاتے ہیں، مجھے بتا کر جاتے ہیں۔ ابھی چند روز پہلے کوٹھے پر گئے تھے تو مجھے بتا کر گئے تھے۔''

اماں نے یہ سنتے ہی اپنا سر پیٹ لیا پھر سینے پر ہاتھ رکھ کر دہائی دیتے ہوئے کہا۔''ہائے میں مرگئی، یہ...... یہ تُو کیا کہہ رہی ہے؟ کیا وہ کوٹھے پر جاتے ہیں؟ تُو نے یہ بات مجھے پہلے کیوں نہیں بتائی؟ ابھی تُو نے کہا ہے کہ وہ تجھے بتا کر جاتے ہیں تو کیا تُو انہیں روک نہیں سکتی ہے؟ غضب خدا کا، عمار تو صورت شکل سے عیاش نظر نہیں آتا، لیکن چھپا رستم ثابت ہو رہا ہے۔''

وہ ایک ہی سانس میں بولے چلے جا رہی تھی۔ خواہش کو بات کرنے کا موقع نہیں دے

رہی تھی۔ آخر وہ چیخ کر بولی۔ ''اماں! میری بھی تو کچھ سنو، اپنی ہی کہے جارہی ہو۔''

اماں اپنے دونوں کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ ''تُو نے تو ایسا دھما کا کیا ہے کہ میرا کلیجا پھٹ گیا، کان پھٹ گئے ہیں۔ مجھے تو کچھ سنائی نہیں دے رہا ہے۔''

وہ ذرا تیز آواز میں بولی۔ ''وہ کوٹھے پر رنگ رلیاں منانے نہیں جاتے۔''

''تو کیا کوٹھے والی کو صندل لگانے جاتے ہیں؟''

''نہیں۔ بزنس کے سلسلے میں وہاں جانا پڑتا ہے۔''

''اے وہاں بزنس ہی تو ہوتا ہے۔ وہ کم بخت ماریاں وہاں دھندے کے لیے ہی تو بیٹھتی ہیں۔''

''میں ان عورتوں کے نہیں، عمار کے بزنس کی ات کر رہی ہوں۔ وہاں دو ایسی لڑکیاں ہیں۔ جنہیں وہ اپنے اشتہارات میں ماڈل بنا کر پیش کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ان سے معاملات طے کرنے کے لیے گئے تھے۔''

''تُو ان کی حمایت میں نہ بول۔ مردوں کی محبت میں بھی سیاست ہوتی ہے۔ تُو ان کی ہیرا پھیری کو نہیں سمجھ سکتی۔ میرا تو پہلے ہی ماتھا ٹھنکا تھا۔ داماد جی تیری جو اتنی تعریفیں کرتے رہتے ہیں اور محبت جتاتے ہیں اس کے پیچھے ضرور اپنی کسی کمزوری کو چھپاتے ہیں اور تُو عقل کی اندھی ان کی محبت میں ایسی گم ہوئی کہ میاں پر نظر رکھنا ہی بھول گئی۔''

''اوہو اماں! اگر ان کے دل میں چور ہوتا تو وہ مجھے بتا کر کیوں جاتے؟''

''یہی تو ہیرا پھیری ہے۔ مردوں کی یہ چالبازی ابھی تیری سمجھ میں نہیں آئے گی۔''

وہ خاموش ہو کر سوچنے لگی۔ اماں نے دہائی دینے کے انداز میں کہا۔ ''ہائے ...... یہاں تو بازی ہی الٹ گئی۔ میں نے تو تجھے داماد جی کو اُلو بنانے کا کہا تھا لیکن یہاں تو وہ تجھے اُلو بنا رہا ہے اور تُو بن رہی ہے۔''

بیٹی نے ذرا پریشان ہو کر کہا۔ ''اماں! اگر ایسا ہے تو تم کچھ کرو ناں ...... لیکن ایک بات ہے، میرا دل نہیں مانتا کہ وہ کوٹھے پر عیاشی کرنے جاتے ہوں گے ...... مگر تم کہہ رہی ہو تو ...... جاتے ہوں گے۔''

''یہ امیر زادے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اپنی دولت خرچ کرنے کے لیے کوٹھوں کا رخ کرتے ہیں اور تباہی کے دہانے پر پہنچ جاتے ہیں۔''

وہ بری طرح پریشان ہو گئی تھی۔ خالی خالی نظروں سے ماں کو دیکھ رہی تھی پھر بولی۔ ''میں انہیں کیسے روکوں؟''

اماں نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔ ''بیوی کی محبت مرد کو اس جگہ جانے سے روک نہیں سکتی۔ تُو اس خوش فہمی میں نہ رہ کہ منع کرے گی اور وہ مان جائیں گے۔ اس طرف کا رخ نہیں کریں گے۔''

وہ ذرا روہانسی ہو کر بولی۔ ''اماں! ڈراؤ مت......''

اماں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر اسے چمکارتے ہوئے کہا۔ ''میری بچی! میں تجھے ڈرا نہیں رہی، حقیقت بتا رہی ہوں۔''

''یہ حقیقت تو بہت کڑوی ہے۔ اسی کڑواہٹ کو مٹھاس میں بدلنا ہے۔''

اماں نے مسکرا کر کہا۔ ''وہی کر جو میں کہوں گی۔ میرا نام بھی تعویذ والی اماں ہے۔ اگر داماد جی کو سیدھے راستے پر نہ لے آئی تو تُو میرا نام بدل دیجیو۔''

اس نے ایک ذرا مطمئن ہو کر ماں کو دیکھا۔ وہ بولی۔ ''میں تجھے دم کی ہوئی چینی دوں گی۔ وہ چٹکی بھر چینی تجھے عمار کو کھلانا ہوگی۔ وہ داماد جی کے پیٹ میں اُترتے ہی اپنا اثر دکھانا شروع کر دے گی۔''

وہ خوش ہو کر اماں کی باتیں سن رہی تھی پھر بولی۔ ''لیکن مجھے یہ سب کیسے پتا چلے گا کہ وہ کوٹھے پر جا رہے ہیں یا نہیں؟ کیا مجھے ان سے پوچھنا ہوگا؟''

''تجھے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ چینی خود ہی اپنا اثر دکھائے گی۔ عمار کے دل میں نیک خیالات پیدا کرے گی کہ بیوی کو دھوکہ دینا اچھی بات نہیں ہے اور کوٹھے پر جانا سراسر برائی میں پڑنا ہے۔ اس طرح وہ لاشعوری طور پر تیرے وفادار رہیں گے۔''

وہ خوش ہو کر ماں سے لپٹ گئی پھر اپنے ہینڈ بیگ میں سے ہزار ہزار کے پانچ نوٹ نکال کر دیتے ہوئے بولی۔ ''انہیں رکھ لو۔''

''تُو اتنے سارے نوٹ مجھے کیوں دے رہی ہے؟''

''رکھ لو اماں! تمہارے کام آئیں گے۔''

ماں نے اس رقم کو لوٹاتے ہوئے کہا۔ ''نہیں...... تُو بیٹی ہے۔ میں تجھ سے پیسے نہیں لے سکتی۔''

''کیسے نہیں لو گی؟ بیٹوں سے تو چھین چھین کر لے لیتی ہو۔ میں دے رہی ہوں تو منع کر رہی ہو؟''

''بیٹوں کی کمائی پر میرا حق بنتا ہے۔ یہ داماد کی کمائی ہے میں نہیں لے سکتی۔''

''رقم نہیں لو گی تو میں خفا ہو جاؤں گی۔ لے لو...... اپنے لیے جوڑے بنا لینا۔''

وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ ''مجبور کرتی ہے تو رکھ لیتی ہوں مگر یہ میرے کہاں کام

آئیں گے؟ تیرے ابا آج کل بہت پریشان ہیں۔ان کی پرچون کی دکان کا سامان ختم ہو رہا ہے۔یہ وہیں خرچ ہوں گے۔''

اماں نے نہ چاہتے ہوئے بھی وہ رقم رکھ لی۔شام ہوئی تو ڈرائیور کار لے کر وہاں پہنچ گیا۔وہ اماں سے چینی کی پڑیا لے کر رخصت ہوگئی۔

☆======☆======☆

شام کو عمار گھر آیا۔وہ فوراً ہی اس کے لیے چائے بنانے کچن میں چلی گئی۔وہاں ایک ملازمہ کام میں مصروف تھی۔وہ چولہے پر چائے کا پانی چڑھا کر اپنے گریبان میں ہاتھ ڈالنا چاہتی تھی لیکن ایسے ہی وقت وہ ملازمہ دوسرے چولہے پر چڑھی ہوئی پتیلی میں چمچہ چلانے وہاں پہنچ گئی۔

وہ فوراً ہی سنبھل کر اپنا دوپٹا درست کرنے لگی۔کچھ دیر بعد ملازمہ پلٹ کر دوسری طرف چلی گئی تو اس نے فوراً ہی اپنے گریبان میں ہاتھ ڈال کر چینی کی پڑیا کو نکالا پھر اسے کپ میں ڈالنے لگی۔ایسے وقت اس کا دل بڑی تیزی سے دھڑک رہا تھا۔جیسے وہ کوئی جرم کر رہی ہو۔اس کے دل نے سمجھایا کہ وہ جرم نہیں کر رہی ہے۔اپنے شوہر کی بھلائی کر رہی ہے۔اسے راہِ راست پر لا رہی ہے۔

اس کا چہرہ پسینے سے تر بتر ہو گیا تھا۔ہاتھ بری طرح کانپ رہے تھے، یہ کارروائی مکمل ہونے تک چائے میں ابال آ چکا تھا۔اس نے سر گھما کر محتاط نظروں سے ملازمہ کو دیکھا۔وہ اپنے کام میں مصروف تھی۔اس کا دھیان خواہش کی طرف نہیں تھا۔اس نے مطمئن ہو کر کپ میں چائے انڈیلی پھر اسے پرچ میں رکھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

عمار اسے دیکھ کر مسکرایا پھر بولا۔''آج چائے بنانے میں تم نے کچھ زیادہ ہی محنت کی ہے۔''

اس نے چونک کر اسے دیکھا پھر پوچھا۔''آپ کو کیسے پتا چلا؟''

وہ قریب آ کر چہرے کو چھوتے ہوئے بولا۔''تمہارا چہرہ بتا رہا ہے۔''

وہ بوکھلا گئی۔اس سے ذرا دور ہٹ کر اپنے چہرے کو چھوتے ہوئے بولی۔''کیا...... میرا چہرہ کیا بتا رہا ہے؟''

''وہی...... جو تم کچن میں کرتی رہی ہو۔''

اسے یکبارگی یوں لگا جیسے بھید کھل گیا ہے۔چوری پکڑی گئی ہے اور کچھ ہی دیر میں عمار اسے دھوکا دینے کے الزام میں گھر سے نکالنے والا ہے۔وہ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی اور آنے والے برے وقت کا انتظار کر رہی تھی۔

وہ اس کے قریب آیا پھر اس کی پیشانی کو چوم کر بڑے پیار سے بولا۔ ''آئندہ تم کچن میں نہیں جاؤ گی۔ دیکھو تو، کیسے پسینہ پسینہ ہو رہی ہو؟ تم میری جان ہو۔ میں تمہیں شہزادی بنا کر رکھنا چاہتا ہوں۔ یہ چولہے ہانڈی کا کام ملازموں کو ہی کرنے دو۔''

خواہش نے مطمئن ہو کر اسے دیکھا پھر سکون کی ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ''اوہ ......تو یہ بات تھی۔''

''کون سی بات......؟''

وہ چونک کر بولی۔ ''آں...... کچھ نہیں۔ آپ چائے پیئیں ناں۔ ٹھنڈی ہو رہی ہے۔''

وہ اس سے الگ ہو کر ایک صوفے پر آ کر بیٹھ گیا پھر پیالی اٹھا کر ایک گھونٹ لینے کے بعد بولا۔ ''اتنی میٹھی چائے؟ کیا آج بھول گئی تھیں کہ میں کم چینی پیتا ہوں؟''

خواہش نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ''کچھ زیادہ میٹھی ہو گئی کیا؟''

''ہاں...... ملازمہ سے کہو۔ وہ دوسری چائے بنا کر لے آئے گی۔''

وہ پریشان ہو کر اسے دیکھنے لگی۔ الجھ کر سوچنے لگی، اب کیا کرنا چاہیے؟ عمار نے اسے خاموش دیکھ کر پوچھا۔ ''کیا ہوا؟ میں نے کچھ کہا ہے۔''

وہ خیالات سے چونک کر دھیرے دھیرے چلتی ہوئی اس کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی پھر اس سے لگ کر اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔ ''یاد ہے؟ آپ نے کہا تھا کہ آپ میری خاطر سب کچھ کر سکتے ہیں۔''

وہ اس کی کمر میں اپنا بازو حمائل کر کے اسے مزید اپنی طرف کھینچتے ہوئے بولا۔ ''ہاں کہا تھا، اور آج اس بات پر قائم ہوں۔''

''تو پھر میری خاطر یہ میٹھی چائے پی لیں ناں۔''

اس نے مسکرا کر پوچھا۔ ''یہ کیسی فرمائش ہے؟''

وہ اس کے برابر آ کر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''پلیز...... میری فرمائش جیسی بھی ہے۔ آپ اسے پورا کر دیں۔''

پھر وہ سینٹر ٹیبل پر رکھی ہوئی پیالی اٹھا کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''آج میٹھی چائے پی لیں۔ پلیز''

وہ پیالی لیتے ہوئے بولا۔ ''تم اپنی ہر بات مجھ سے منوا لیتی ہو۔''

وہ اس کے سینے پر سر رکھ کر بولی۔ ''آپ مان جاتے ہیں۔ اس لیے منواتی ہوں۔''

وہ اس کے سینے پر سر رکھے باتیں کرتی رہی اور وہ اس کی ضد پوری کرتا رہا پھر چائے ختم

کرنے کے بعد بولا۔ ''لو...... میں نے تمہاری ضد پوری کر دی مگر مجھے اس ضد کی کوئی تک سمجھ میں نہیں آئی۔''

وہ سیدھی ہو کر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''آپ ملازمہ کو بلوا کر دوسری چائے بنواتے تو میری سُبکی ہوتی۔ میں نے شرمندگی سے بچنے کے لیے ذرا سی خود غرضی سے کام لیا ہے۔ کیا آپ کو برا لگا؟''

وہ مسکرا کر اس کا ہاتھ تھام کر بولا۔ ''ہرگز نہیں۔ مجھے تو اپنے آپ پر غصہ آ رہا ہے کہ میں اتنی محبت سے بنائی ہوئی چائے کو ٹھکرا کر ملازمہ کے ہاتھ کی چائے منگوا رہا تھا۔''

وہ خوش ہو کر لپٹ گئی۔ خوشی کے ساتھ ساتھ اطمینان بھی تھا کہ اماں کی دی ہوئی چینی میاں صاحب کے پیٹ میں اُتر چکی تھی اور اب اس کے اثر سے وہ مزید اس کے تابعدار بن کر رہنے والے تھے۔

☆======☆======☆

اس روز وہ اپنے میکے پہنچی تو گھر کے سامنے لوگوں کا ہجوم دکھائی دیا۔ جیسے وہاں کوئی تماشا ہو رہا ہو۔ خواہش کو گھر کا دروازہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ ذرا پریشان ہو کر کار سے اتری پھر تیزی سے چلتی ہوئی مجمع کے درمیان سے گزر کر دروازے پر آئی۔

وہاں اس کے دونوں بھائی اور ابا ایک دوسرے سے کسی بات پر تکرار کر رہے تھے۔ خواہش نے پوچھا۔ ''ابا! کیا بات ہے؟ یہاں کیا ہو رہا ہے؟ یہ اتنے سارے لوگ ہمارے دروازے کے سامنے کیوں جمع ہیں؟''

وہ پلٹ کر اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اچھا ہوا جو تُو آ گئی، یہاں تو بڑا غضب ہو گیا ہے۔ تمہارا باپ تماشا بن رہا ہے۔''

''مگر ہوا کیا ہے؟ کچھ بتاؤ بھی تو؟''

''ہونا کیا ہے؟ میری زندگی عذاب ہو گئی ہے۔ اس عمر میں یہ دن بھی دیکھنا تھا۔''

وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام کر گھر کے دہلیز پر بیٹھ گیا۔ باپ کے یوں پریشان ہو کر بیٹھ جانے سے اس کا دل ڈوبنے لگا۔ چھٹی حس خطرے کا الارم دینے لگی۔

اس نے ایک بھائی کا بازو پکڑ کر پوچھا۔ ''تم ہی کچھ بتاؤ۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟''

وہ بولا۔ ''وہ...... اماں کو پولیس لے گئی ہے۔''

اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ دم بخود سی ہو کر بھائی کے چہرے کو تکنے لگی۔ اس نے ایسا دھماکا کیا تھا کہ اس کا پورا وجود لرز کر رہ گیا تھا۔ وہ گم صم سی کھڑی بھائی کو دیکھ رہی تھی۔ سنی ہوئی بات پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

پھر جیسے وہ ایک دم سے ہوش میں آ گئی۔ اسے اپنے سسرالی ڈرائیور کا خیال آیا۔ اس کے ذریعے یہ توہین آمیز معاملہ اس کے سسرال تک پہنچ سکتا تھا۔ وہ تیزی سے پلٹ کر لوگوں کی بھیڑ چیرتی ہوئی کار کے قریب آئی تو ڈرائیور اپنی سیٹ پر نہیں تھا۔ اس نے ایک طرف دیکھا تو وہ محلے کے ایک آدمی کے پاس کھڑا ہوا باتوں میں مصروف تھا۔

وہ ایک دم سے ٹھٹک گئی۔ ''پتا نہیں وہ شخص اسے کیسی معلومات فراہم کر رہا ہے؟ اماں کے بارے میں کچھ کہہ رہا ہوگا۔ بات یہاں سے اُڑ کر عمار کے کانوں تک پہنچے گی تو میری اور میرے میکے والوں کی کیا عزت رہ جائے گی؟ اماں نہ جانے کس جرم میں تھانے پہنچی ہے؟ یہ میں بعد میں معلوم کروں گی۔ پہلے مجھے اس ڈرائیور کو یہاں سے روانہ کرنا چاہیے۔''

اس نے اسے پکارا تو وہ تیزی سے چلتا ہوا اس کے قریب آ گیا۔ وہ بولی۔ ''تمہیں یہاں سے چلے جانا چاہیے تھا۔''

وہ بولا۔ ''آپ کوئی حکم دیئے بغیر چلی گئی تھیں۔ میں اجازت کے بغیر کیسے جا سکتا تھا؟''

''اچھا اچھا...... ٹھیک ہے۔ اب تم گاڑی لے جاؤ اور جب میں فون کروں، تب آنا۔''

اس نے ڈرائیونگ سیٹ پر آ کر کار اسٹارٹ کی پھر اسے ڈرائیو کرتا ہوا، آگے بڑھتا ہوا اس گلی سے چلا گیا۔ گاڑی نظروں سے اوجھل ہو گئی تو وہ ایک ذرا مطمئن ہو کر باپ بھائیوں کے پاس آ کر بولی۔ ''خدا کے لیے۔ اندر چلیں۔ باہر کیوں تماشا بن رہے ہیں؟''

ابا نے ایک ذرا ناگواری سے کہا۔ ''اب تماشا بننے کو رہ ہی کیا گیا ہے؟ اس گھر سے کبھی کوئی مرد تھانے نہیں گیا لیکن آج تیری ماں وہاں پہنچی ہوئی ہے۔ ہمیں تماشا بنا رہی ہے۔''

باپ محلے بھر کے سامنے اماں کی توہین کر رہا تھا۔ خواہش کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مسئلہ کیا ہے؟ اور نہ ہی وہ محلے والوں کے سامنے باپ کو کریدنا چاہتی تھی۔ یہ بات ہی توہین آمیز تھی کہ اماں کو پولیس پکڑ کر لے گئی ہے۔

ایک بھائی نے کہا۔ ''جب سے اماں گئی ہے، تب سے ابا ایسی ہی جلی کٹی باتیں کر رہا ہے۔ ہم جانتے ہیں، وہ بے قصور ہے۔''

باپ تیز لہجے میں بولا۔ ''تو چپ کر۔ اپنی ماں کی زیادہ حمایت نہ کر......''

خواہش نے ایک نظر مجمع پر ڈال کر باپ سے کہا۔ ''ابا! ہم گھر کے اندر بھی یہ باتیں کر سکتے ہیں۔ گھریلو مسائل گھر کی دہلیز پر نہیں، چار دیواری میں حل کیے جاتے ہیں۔''

مجمع میں سے ہلکی ہلکی سرگوشیاں ابھر رہی تھیں۔ ابا نے کہا۔ ''ارے۔ کون سا گھریلو مسئلہ؟ پولیس اسے محلے بھر کے سامنے پکڑ کر لے گئی ہے۔''

خواہش نے دونوں بھائیوں کو دیکھا پھر کہا۔ ''اندر آؤ......''

وہ دہلیز پر بیٹھے ہوئے باپ کے قریب سے گزرتی ہوئی گھر کے اندر چلی گئی۔ دونوں بھائی بھی اس کے پیچھے پیچھے اندر آ گئے۔ اس نے پلٹ کر دیکھا پھر کہا۔ ''ابا کو بھی اندر لاؤ۔''

ایک بھائی باپ کو بلانے چلا گیا۔ اس نے کمرے میں آ کر دوسرے بھائی سے پوچھا۔ ''اماں نے کیا جرم کیا ہے جو پولیس اسے پکڑ کر لے گئی ہے؟''

وہ بولا۔ ''اماں نے کوئی جرم نہیں کیا، وہ بے قصور ہے۔''

ابا نے کمرے میں آتے ہوئے کہا۔ ''وہ بے قصور ہے تو کیا پولیس والے پاگل ہیں؟ جو اسے گرفتار کر کے لے گئے ہیں۔''

بیٹا ایک دم سے چیخ کو بولا۔ ''ہاں پاگل ہیں۔ وہ ہماری اماں پر جھوٹا الزام لگا رہے ہیں اور تم نہ جانے کیوں اماں کی حمایت کرنے کے بجائے ان لوگوں کی طرف داری کر رہے ہو۔ اماں کو مجرم ٹھہرا رہے ہو؟ تمہیں اس کی کوئی فکر نہیں ہے۔''

وہ بولا۔ ''میں اس کی کیا فکر کروں؟ جب منع کرتا تھا تو مانتی نہیں تھی۔ محلے میں مشہور ہونے کا بڑا شوق تھا۔ خود کو تعویذ والی اماں کہلوا کر بڑی خوش ہوتی تھی۔ اب نتیجہ بھگت رہی ہے۔ بڑی مشہور ہو رہی ہے، بڑا نام کما رہی ہے۔''

بیٹے نے خواہش سے کہا۔ ''تم سن رہی ہو، یہ کیسی دل جلانے والی باتیں کر رہا ہے؟''

وہ جھنجھلا گئی۔ اسے ابھی تک اصل بات کا علم نہیں ہو سکا تھا۔ اس نے ذرا تیز لہجے میں کہا۔ ''کیا تم سب آپس میں لڑتے ہی رہو گے؟ مجھے کچھ نہیں بتاؤ گے؟ اماں وہاں تھانے میں اکیلی پریشان ہو رہی ہو گی اور تم لوگوں کو لڑنے جھگڑنے سے فرصت نہیں ہے۔ خدا کے لیے جھگڑا ختم کرو اور مجھے اصل معاملہ بتاؤ۔''

ایک بھائی اسے بتانے لگا۔ ''بات یہ ہے کہ ایک ڈیڑھ ہفتے پہلے ایک عورت اماں کے پاس آئی تھی۔ اپنے شوہر کا دکھڑا رو رہی تھی۔ اماں نے اسے کچھ تعویذ دیئے مگر ان کا اس کے شوہر پر کچھ خاص اثر نہ ہوا۔''

باپ نے پھر مداخلت کی۔ ''ارے کیسے اثر ہوتا۔ تمہاری اماں لوگوں کو بے وقوف بناتی ہے، نہ جانے کیا لکھ لکھ کر دیتی رہتی ہے۔''

خواہش نے الجھ کر کہا۔ ''ابا......! تم تھوڑی دیر کے لیے خاموش رہو گے؟ تم تو اماں کے کسی دشمن کی طرح بول رہے ہو۔''

بیٹے نے ناگواری سے باپ کو دیکھا پھر خواہش کو بتانے لگا۔ ''وہ عورت کچھ دنوں بعد

آئی تو اماں نے اسے پڑھی ہوئی چینی دے کر تاکید کی کہ وہ اسے اپنے شوہر کو کھلا دے۔'' وہ چینی لے کر چلی گئی تھی اور آج پولیس کے ساتھ روتی پیٹتی ہوئی آئی تھی۔ اماں کو الزام دے رہی تھی کہ اس کی دی ہوئی چینی کھا کر اس کا شوہر مر گیا ہے۔

''اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

باپ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔''کیوں نہیں ہو سکتا؟ تیری اماں کے الٹے سیدھے جادو ٹونے نے بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ وہ خود کو بڑی پہنچی ہوئی بزرگ ہستی ظاہر کرتی ہے۔ آج تھانے پہنچی ہوئی ہے، اونہہ......اب چلائے نہ اپنا جادو کروالے خود کو آزاد......''

بیٹا ماں کی توہین سن کر پھر باپ سے الجھ گیا۔ خواہش کسی کی طرف دھیان نہیں دے رہی تھی۔ اس کا سر گھوم رہا تھا۔ پڑھی ہوئی چینی کی کارگردگی سن کر اسے رہ رہ کر عمار کا خیال آ رہا تھا۔ اس نے چند روز پہلے اماں کی دی ہوئی چینی اسے کھلائی تھی۔ دل میں اندیشے سر ابھارنے لگے۔ دھڑکنیں بے ترتیب سی ہو گئی تھیں۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ ابھی اُڑتی ہوئی اپنے عمار کے پاس پہنچ جائے۔ اس کی خیریت معلوم کرے۔

چھوٹے بھائی نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔''باجی! وہ عورت جھوٹ بول رہی ہے۔ ہمیں کچھ لوگوں نے بتایا ہے کہ وہ کسی ساگر نامی کالا جادو جاننے والے بابا کے پاس بھی آتی جاتی ہے۔ اس سے اپنے شوہر پر جادو کراتی تھی۔ وہ یہاں آ کر اماں سے تعویذ لیتی رہی اور وہاں جا کر کالا جادو کراتی رہی۔ سب اماں کی حمایت کر رہے ہیں کہ وہ کبھی غلط تعویذ نہیں دیتی۔ کالا جادو اماں کے نیک عمل سے ٹکرایا ہے اور اس کے نتیجے میں اس آدمی کی جان چلی گئی ہے۔ پورا محلہ اماں کی طرف داری کر رہا ہے۔ عورتیں پولیس والوں سے الجھ پڑی تھیں اماں کو چھڑانے کے لیے۔ ایک یہ ابا ہی ہے جو مسلسل اس کی مخالفت کر رہا ہے۔''

چھوٹے بھائی کی باتوں نے خواہش کی ذرا ڈھارس بندھائی۔ اس نے اپنے دل کو تسلی دی کہ اماں کی چینی سے کچھ نہیں ہوا۔ یہ ضرور کالے جادو کا اثر ہے جو آدمی مر گیا ہے۔ میرے عمار کو کچھ نہیں ہو گا۔

وہ بولی۔''اماں اکیلی تھانے گئی ہے۔ کیا تم میں سے کوئی اس کے ساتھ نہیں جا سکتا تھا؟ ابا......! تم اس گھر کے سرپرست ہو۔ تمہیں اس مصیبت کے وقت میں اماں کے ساتھ ہونا چاہیے تھا۔''

''میں وہاں جا کر کیا کرتا؟ وہاں نوٹوں کی بولی سنی جاتی ہے۔ غریبوں کی فریاد کون سنتا۔''

ایک بھائی نے کہا۔ ”خواہش! تم عمار بھائی سے بات کرو، شاید وہ اس مسئلے کو حل کر سکیں۔ان کی تو بڑے بڑے لوگوں سے جان پہچان ہوگی۔“

وہ بولی۔ ”خبردار! ان کا نام بھی نہ لینا۔ میں یہ توہین آمیز معاملہ ان تک نہیں پہچانا چاہتی۔ میں اپنے سسرال میں اس بات کی بھنک بھی نہیں پڑنے دوں گی کہ اماں تھانے گئی تھی۔عقل سے سوچو۔اگر یہ بات وہاں پہنچے گی تو میری کیا عزت رہ جائے گی؟ میں تو کسی سے آنکھ ملا کر بات بھی نہیں کرسکوں گی۔“

ایک بھائی نے کہا۔ ”ہاں ...... تم ٹھیک کہہ رہی ہو مگر یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔تمہیں گاڑی واپس نہیں بھیجنی چاہیے تھی۔تم اس بڑی سی کار میں بیٹھ کر تھانے جاتیں تو پولیس والوں پر رعب پڑتا۔وہ تم سے متاثر ہوکر اماں سے نرمی کرسکتے تھے۔“

”بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔تم کیا چاہتے ہو کہ میں تھانے جا کر عمار کا نام اچھالوں؟ تم لوگ مجھے تھانے کے چکر میں نہ گھسیٹو۔ اس معاملے کو ابھی اسی وقت کسی نہ کسی طرح نمٹانے کی کوشش کرو مگر یہ خیال دل سے نکال دو کہ میں عمار سے اماں کے لیے سفارش کروانے یا اس کی ضمانت کروانے کی بات کروں گی۔“

چھوٹے بھائی نے کہا۔ ”پھر کیا کیا جائے؟ ہم اماں کو رات تھانے میں گزارنے نہیں دیں گے۔“

ابا نے اسے گھور کر دیکھا پھر کہا۔ ”اپنی اماں کی اتنی ہی فکر ہے تو کوئی ترکیب لڑا۔ جذباتی باتیں نہ بنا۔ وہ خود تو وہاں جا کر بیٹھ گئی ہے اور یہاں ہماری جان مصیبت میں پھنسا گئی ہے۔لاکھ بار سمجھاتا تھا کہ یہ فراڈ کا کھیل نہ کھیل۔کسی دن پچھتائے گی مگر وہ میری بات ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اُڑا دیتی تھی۔“

بیٹے نے کہا۔ ”ابا ...... ! تم اماں کے پیٹھ پیچھے اس کی زیادہ برائی نہ کرو۔اگر اس کا تعویذ گنڈے کرنا تمہیں برا لگتا ہے تو یہ برا کیوں نہیں لگتا کہ اماں ان تعویذوں کے نذرانے کی رقم سے تمہاری دکان میں مال ڈلواتی ہے؟ اگر وہ لوگوں سے فراڈ کر رہی ہے تو تم اس کے پیسے کیوں لیتے ہو؟ کیوں غلط کمائی سے اپنی دکان چلاتے ہو؟“

باپ ایک دم سے طیش میں آ کر اسے مارنے کے لیے آگے بڑھا۔خواہش نے بھائی کے سامنے ڈھال بنتے ہوئے کہا۔ ”یہ کیا تماشا کر رہے ہو؟ زبان سے لڑتے لڑتے ہاتھا پائی پر اتر رہے ہو۔“

باپ نے اس بیٹے کو گھور کر خواہش سے کہا۔ ”اس سے کہہ دے، یہ میرے منہ نہ لگے۔

میرا دماغ گھوما ہوا ہے، میں اسے کوٹ کر رکھ دوں گا۔''

وہ بولی۔''یوں غصہ دکھانے سے یا اسے مارنے سے اماں رہا نہیں ہو جائے گی۔''

باپ دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام کر ایک پلنگ کے سرے پر بیٹھ گیا۔ وہ بیوی کی غیر موجودگی میں اسی طرح چیختا چلاتا اور بچوں پر رعب جھاڑتا پھرتا تھا مگر اس کے سامنے آتے ہی بھیگی بلی بن جاتا تھا۔

بیٹے نے کہا۔''یوں سر پکڑ لینے سے کچھ نہیں ہوگا۔ میری سمجھ میں تو ایک راستہ آ رہا ہے، ہمیں علاقے کے کونسلر کے پاس چلنا چاہیے۔ شاید وہ کچھ کر سکے؟''

خواہش نے اس کی تائید کی۔''ہاں...... ہمیں ایسا ہی کرنا چاہیے۔''

ابا نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا پھر کہا۔''مشکل ہی ہے جو وہ تمہارے کام آئے۔''

ان تینوں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ بولا۔''تمہاری اماں نے اسے ووٹ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اب شاید وہ اس بات کو یاد رکھتے ہوئے تمہاری اماں کے لیے کچھ نہ کرے؟''

وہ تینوں سوچ میں پڑ گئے۔ خواہش نے کہا۔''کوشش کر لینے میں کیا حرج ہے؟ تم تینوں جا کر اس سے بات تو کرو۔''

یہ سن کر وہ تینوں ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ باپ نے بیٹی سے کہا۔''تم ہی ان دونوں کے ساتھ جا کر کونسلر سے بات کر لو۔ میرے جانے یا نہ جانے سے کیا فرق پڑے گا؟''

اس نے ناگواری سے باپ کو دیکھتے ہوئے کہا۔''اگر تم ہمارے باپ نہ ہوتے تو بھی کیا فرق پڑتا؟ ہم کسی دوسری جگہ پیدا ہو جاتے۔ جب باپ بن ہی چکے ہو تو اپنے فرائض پورے کرو۔ تم اس گھر کے بزرگ ہو، سرپرست ہو۔ تمہیں آگے رہنا چاہیے لیکن تم پیچھے بھاگ رہے ہو۔''

ایک بھائی نے کہا۔''تم ٹھیک کہہ رہی ہو، ابا کو آگے رہنا چاہیے لیکن تم ساتھ چلو تو اچھا ہے۔ ابا صرف گھر میں ہی بول سکتا ہے، باہر کسی سے بات کرتے ہوئے ایسا مسکین بن جاتا ہے، جیسے کسی سے قرض لے کر کھا گیا ہو، یہ کونسلر سے ایسی عاجزی سے بات کرے گا تو وہ یہی سمجھے گا کہ ہماری اماں قصوروار ہے۔''

وہ چڑ کر بولی۔''تم مرد ہونے کے باوجود ہر معاملے میں مجھے گھسیٹ رہے ہو۔ میں لڑکی ہو کر غیر مردوں سے بات کروں مگر تم لوگ کچھ نہیں کر سکتے۔ مجھ پر ہی تکیہ کر رہے ہو تو پھر چلو!''

وہ خواہش کو اس لیے بھی اپنے ساتھ لے جانا چاہ رہے تھے کہ اگر وہاں رقم کے لین دین کی بات ہوگی تو خواہش فوراً ہی کچھ نہ کچھ بندوبست کر دے گی۔ وہ اسے امیر خاندان میں بیاہ کر جادو کا چراغ سمجھنے لگے تھے۔ جو پلک جھپکنے میں ان کے مصائب کو دور کر سکتا تھا۔

وہ چاروں دروازے پر تالا ڈال کر کونسلر کے گھر کی طرف جانے لگے۔ اس نے اپنے گھر کے ایک کمرے کو ہی دفتر بنایا ہوا تھا۔

اس وقت وہاں کونسلر کے سامنے ایک فیشن کی ماری بوڑھی عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے اپنی عمر سے زیادہ چہرے پر میک اپ تھوپ رکھا تھا۔ وہ کلر فل لباس میں ملبوس بڑھیا آنکھیں مٹکا مٹکا کر باتیں کر رہی تھی۔

کونسلر اس کی باتیں سن رہا تھا لیکن چہرے سے بیزاری ظاہر ہو رہی تھی۔ جیسے وہ اس سے جلد از جلد جان چھڑانا چاہتا ہو۔ وہ تعویذ والی اماں کے سلسلے میں ہی اس کے پاس آئی تھی لیکن اپنی شکایتوں کا پٹارا کھول کر بیٹھ گئی تھی۔ اسے محلے کے چند لڑکوں سے شکایت تھی کہ وہ اسے دیکھ کر سیٹیاں بجاتے ہیں اور گانے گاتے ہیں۔

کونسلر نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آنٹی! تم اس عمر میں ایسا حلیہ بنا کر گھر سے نکلو گی تو تمہیں گلی کے لڑکے ہی نہیں بچے بھی چھیڑیں گے۔''

وہ ایک دم سے بھنا کر بولی۔ ''یہ...... یہ تم نے آنٹی کس کو کہا؟ کیا میں تمہیں آنٹی دکھائی دیتی ہوں؟ میری عمر زیادہ نہیں ہے، مجھے کم بخت بیماریوں نے گھیر لیا تھا۔ جن کے نتیجے میں وقت سے پہلے ایسی ہو گئی ہوں لیکن اب میں ایسی نہیں رہوں گی۔''

کونسلر اسے دفتری کمرے میں بلا کر پچھتا رہا تھا۔ وہ سنتی کم تھی اور بولتی زیادہ تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ''میں نے تعویذ والی اماں سے اپنا علاج شروع کرایا ہے۔ اس کے پاس چہرے کو پرکشش بنانے کا ایک وظیفہ ہے۔ ابھی دو روز پہلے ہی میرا علاج شروع ہوا ہے اور وہ کم بخت تھانے والے اسے اٹھا کر لے گئے ہیں۔''

کونسلر کو یہ اطلاع مل چکی تھی کہ تعویذ والی اماں کو پولیس والے گرفتار کر کے لے گئے ہیں۔ دوسرے محلے میں ہونے والی موت کا الزام اماں پر لگایا گیا ہے کہ وہ شخص اس کے تعویذوں کے اثر سے مر گیا ہے۔

کونسلر نے پوچھا۔ ''کیا تمہاری تعویذ والی اماں ایسے تعویذ گنڈے بھی کرتی ہے کہ جن کے نتیجے میں آدمی مر جائے؟''

''ارے نہیں۔ وہ تو بڑی اچھی ہے، بڑے نیک کاموں کے سلسلے میں تعویذ دیتی ہے اور وظیفے پڑھتی ہے۔ جیسے مجھے جوان اور پرکشش بنانے کے لیے ایک وظیفہ پڑھ رہی ہے۔ تم بھی تو عقل مند ہو۔ سمجھ سکتے ہو کہ تعویذ وغیرہ نیک کاموں کے لیے ہی دیئے جاتے ہیں۔ وہ عورت جس کا شوہر مر گیا ہے، ایک نمبر کی جھوٹی اور مکار ہے۔ اماں کو بدنام کر رہی ہے۔''

''تم یہ بات کیسے کہہ سکتی ہو؟''

''اس لیے کہ میں جانتی ہوں۔ وہ اپنے شوہر پر کالا جادو بھی کراتی رہی تھی۔ اسی کے اثر سے وہ مرا ہے لیکن وہ عورت اماں پر الزام لگا رہی ہے۔''

وہ بولا۔''تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟''

وہ ایک ذرا انکساری سے بولی۔''میں اماں کو رہا کروانے کے سلسلے میں تمہارے پاس آئی ہوں۔ اے بھیا! تم اپنی کوئی سورس لڑاؤ۔ اگر وہ آج رات واپس نہ آئی تو میرے وظیفے کا ناغہ ہو جائے گا۔''

کونسلر بھی یہی چاہتا تھا کہ تعویذ والی اماں کی مدد کر کے اسے اپنا گرویدہ بنا لے۔ وہ احسان مند بن کر رہے گی تو اگلے الیکشن میں اس احسان کا بدلہ یوں اتار سکے گی کہ اپنے عقیدت مندوں کو اسے ووٹ دینے کو کہے گی۔ اس طرح اس کے ووٹرز میں اضافہ ہوگا۔

اس بڑھیا نے پوچھا۔''اے بھیا! تم کس سوچ میں پڑ گئے؟ میرا کچھ خیال کرو۔ میرا وظیفہ درمیان میں رہ گیا تو میں آدھی ایشوریہ رائے اور آدھی راکھی بن کر رہ جاؤں گی۔''

وہ ذرا جھنجھلا کر بولا۔''بڑی بی! تم کچھ دیر کے لیے خاموش ہو جاؤ۔ مجھے کچھ سوچنے دو۔ کسی نتیجے پر پہنچنے دو۔''

وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ ہاتھ نچاتے ہوئے بولی۔''تم نے پھر مجھے بڑھیا کہا؟ کیا تمہاری سمجھ میں میری بات نہیں آئی؟ میں عمر رسیدہ نہیں ہوں، بیماریوں نے مجھے ایسا بنا دیا ہے۔ ذرا اماں کا وظیفہ پورا ہو لینے دو پھر دیکھنا تم سب مجھے بے بی، بے بی کہہ کر مخاطب کرنے پر مجبور ہو جاؤ گے لیکن ابھی مجھے میرے نام سے پکارو۔''

وہ اس کے سامنے ہار مانتے ہوئے بولا۔''مجھ سے غلطی ہوگئی۔ میں اب تمہیں آنٹی تو کیا، باجی بھی نہیں کہوں گا۔''

وہ خوش ہو کر دوبارہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ پرس میں سے ایک آئینہ نکال کر اپنے چہرے کو دیکھنے لگی پھر بولی۔''میں زیادہ باتیں کروں تو میری سرخی پھیل جاتی ہے۔ ویسے میں تمہیں ایک مشورہ دوں گی کہ تم اپنی آنکھوں کا علاج کراؤ۔''

وہ بولا۔''تمہارے مشورے کا شکریہ۔ میری آنکھیں ٹھیک ہیں۔''

''اے لو۔ اگر ٹھیک ہوتیں تو کیا تم مجھ جیسی جوان جہان عورت کو بڑھیا کہتے؟ تمہاری نظر کمزور ہے۔ تب ہی تو تمہیں محلے کی اجاڑ سڑکیں دکھائی نہیں دیتیں۔ جہاں جگہ جگہ گڑھے پڑے ہوئے ہیں۔ تم کونسلر ہو ان راستوں کو ٹھیک کروانا تمہارا فرض ہے مگر تمہیں کچھ دکھائی

دے تب ہے نا......''

''اس سلسلے میں چندہ جمع کیا جا رہا ہے۔ انشاء اللہ جلد ہی یہ راستے ٹھیک ہو جائیں گے۔''

وہ دونوں علاقے کی بری حالت پر بحث کرنے لگے۔

ایسے ہی وقت خواہش اپنے باپ بھائیوں کے ساتھ اس دفتری کمرے میں داخل ہوئی۔ کونسلر اسے دیکھتے ہی خوش ہو کر اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ بڑی تابعداری سے بولا۔ ''آیئے...... بیٹھیے......''

خواہش نے پہلے ابا کو ایک کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ پھر دوسری کرسی پر خود بیٹھ گئی۔ کونسلر نے کہا۔ ''چائے منگواؤں یا ٹھنڈا؟''

وہ بولی۔ ''کچھ منگوانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم ایک مسئلہ لے کر آپ کے پاس حاضر ہوئے ہیں۔''

یہ کہہ کر اس نے باپ کو کہنی ماری۔ اشارہ دیا کہ وہ بات شروع کرے۔ ابا نے پہلے اسے اور پھر کونسلر کو دیکھا پھر ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ''وہ...... بات یہ ہے، مبین صاحب! کہ......''

وہ بولتے بولتے چپ ہو گیا۔ جیسے گاڑی پیٹرول ختم ہو جانے کے بعد رک جاتی ہے۔ کونسلر نے کہا۔ ''آپ چپ کیوں ہو گئے۔ کہیے میں سن رہا ہوں۔''

وہ پھر ہچکچانے لگا۔ ''وہ...... میں نہیں...... خواہش آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔''

بیٹی نے ایک دم سے چونک کر باپ کو گھورا۔ وہ پیسوں سے تو دور کی بات، زبان سے بھی ماں کی مدد کرنے کے قابل نہیں تھا۔ ایک بھائی نے خواہش کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''تم بات شروع کرو نا۔ دیر کیوں کر رہی ہو؟''

اسے اپنے باپ بھائیوں پر شدید غصہ آ رہا تھا۔ وہ مرد ہوتے ہوئے بھی ایک کمزور بہن اور بیٹی کو بیساکھی بنا رہے تھے۔ اسے اپنی ماں کا خیال نہ ہوتا تو ابھی اسی وقت یہاں سے اٹھ کر چلی جاتی۔

کونسلر نے مسکرا کر اسے دیکھا پھر کہا۔ ''کہیے......''

وہ باپ بھائیوں کو گھور رہی تھی پھر کونسلر کی طرف متوجہ ہو کر بولی۔ ''شاید آپ تک یہ اطلاع پہنچ چکی ہوگی کہ اماں کو پولیس والے لے گئے ہیں۔ جبکہ ان کا کوئی قصور نہیں ہے۔ ان کے خلاف کوئی ثبوت کوئی گواہ نہیں ہے۔''

خود کو جوان کہنے والی اس بوڑھی عورت نے مداخلت کی۔ ''میں بھی تو یہی کہنے آئی

ہوں۔ مجھے تم سب سے زیادہ اماں کی فکر ہے۔تب ہی تو اس کی سفارش کرنے کے سلسلے میں سب سے پہلے میں یہاں پہنچی ہوں۔''

کونسلر نے گھور کر اسے دیکھا۔ وہ حسبِ عادت بات سے بات نکالتی جا رہی تھی۔ کونسلر نے اسے نظر انداز کرتے ہوئے خواہش سے پوچھا۔''باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ پہلے یہ بتائیں کہ آپ کی گاڑی دھوپ میں تو نہیں کھڑی ہے؟''

ابا نے ذرا ناگواری سے کہا۔''مبین صاحب! گاڑی کو چھوڑیں اس کی ماں نے تو ہمیں دھوپ میں کھڑا کر دیا ہے۔اسی لیے آپ کے سائے میں آئے ہیں۔''

بیٹی نے گھور کر باپ کو دیکھا۔ پہلے تو وہ بول نہیں رہا تھا، اب بولا تھا تو ماں کی برائی ہی کر رہا تھا۔ اس نے کونسلر سے کہا۔''آپ فکر نہ کریں میں گاڑی میں نہیں آئی ہوں۔ پلیز ..... آپ اماں کے لیے کچھ کریں۔ انہیں رہا کرانے کی کوئی صورت نکالیں۔''

وہ مسکرا کر بولا۔''صورت نکالنے سے ہی نکلتی ہے۔اب ہمیں دیکھیں۔ہم اس علاقے کے خادم ہیں۔ یہاں کی صورت شکل بنانا چاہتے ہیں۔ یہاں کی شکستہ سڑکوں کی مرمت اور بھرائی کرانا چاہتے ہیں اور اس سلسلے میں کوششیں بھی کر رہے ہیں۔ہم نے چندہ جمع کرنے کی مہم چلائی ہے۔''

اس بڑھیا نے پھر مداخلت کی۔''ابھی کل ہی تو میں نے دس روپے کا چندہ دیا ہے۔''

کونسلر نے اس کی بات سن کر مسکراتے ہوئے خواہش کو دیکھا پھر کہا۔''دس پانچ روپے کے چندے سے کیا ہوتا ہے؟ مگر یہاں رہنے والے لوگ اپنی حیثیت کے مطابق اتنے ہی روپے دے سکتے ہیں۔ اب آپ ہی بتائیں، کیا یوں قطرہ قطرہ چندہ جمع ہونے میں اگلے الیکشن نہیں آ جائیں گے؟''

خواہش نے کہا۔''لیکن یہ تو حکومت کا کام ہے؟''

وہ بولا۔''جی ہاں ..... لیکن ابھی بل پاس نہیں ہوا ہے۔ مجھے اس علاقے سے بڑی محبت ہے۔اس لیے تو چندہ جمع کروانے کی خواری اٹھا رہا ہوں کہ جب تک حکومت کچھ نہیں کر رہی ہے تب تک میں شکستہ سڑکوں کی تھوڑی بہت مرمت تو کرا لوں۔''

خواہش اس کی باتوں سے بیزار ہو رہی تھی۔ اسے اماں کی فکر کھائے جا رہی تھی مگر یہ تھا کہ علاقے کی صورتِ حال پر روشنی ڈالنے بیٹھ گیا تھا۔خواہش نے گفتگو کے دوران میں کئی بار اسے ٹوکنا بھی چاہا لیکن وہ تو جیسے اپنے سامنے کسی کی سنتا ہی نہیں تھا۔

کچھ دیر پہلے وہ اس نان اسٹاپ بولنے والی بڑھیا سے پریشان ہو رہا تھا مگر اب خود اسی

کے نقشِ قدم پر چل رہا تھا اور خواہش کو جھنجھلاہٹ میں مبتلا کر رہا تھا۔

وہ بولا۔ ''یہ راستے ٹھیک ہو جائیں گے تو اس میں آپ جیسے لوگوں کا فائدہ ہے۔ ورنہ یہاں کے لوگوں کا کیا ہے؟ یہ تو پیدل چلنے والے ہیں۔ گڑھوں سے کترا کر بھی گزر سکتے ہیں۔ آپ اپنی مہنگی گاڑی میں یہاں آتی جاتی ہیں۔ اسی محلے کی بیٹی ہیں اور بیٹی کی گاڑی کو نقصان پہنچے گا تو ہمیں بڑی شرمندگی ہوگی۔ اگر کوئی صاحبِ حیثیت یکمشت ہزار دو ہزار روپے دے دے تو ہم فوراً ہی ان راستوں کی حالت درست کر دیں گے۔''

خواہش اس کی باتوں کا مطلب سمجھ گئی تھی۔ اپنے پرس میں سے ہزار ہزار کے دو نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''اسے رکھ لیں!''

وہ نوٹوں کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے ہچکچا کر بولا۔ ''ارے رہنے دیتیں...... لیکن خیر ...... یہ آپ ہی کے کام آئیں گے۔''

اس نے وہ نوٹ لے کر اپنی جیب میں رکھ لیے پھر کہا۔ ''میری تھانے والوں سے بڑی جان پہچان ہے لیکن یہ بات سب ہی جانتے ہیں کہ وہ اپنے باپ کا بھی لحاظ نہیں کرتے۔ میں اماں کی سفارش کروں گا مگر یہ بات پہلے ہی بتا دوں کہ تھانے والوں کی جیب گرم کیے بغیر کام نہیں بنے گا۔''

بیٹی نے پریشان ہو کر باپ کو دیکھا پھر کونسلر سے کہا۔ ''کیا دو چار ہزار سے کام چل جائے گا؟''

وہ بولا۔ ''چل تو جاتا...... لیکن آپ کی اماں کو مرڈر کیس میں پھنسایا جا رہا ہے۔''

اس نوخیز بڑی بی نے پوچھا۔ ''یہ کیا ہوتا ہے؟''

کونسلر نے بیزاری سے اسے دیکھا پھر کہا۔ ''ان کی اماں کو قتل کے کیس میں پھنسایا جا رہا ہے۔''

پھر اس نے خواہش سے کہا۔ ''ویسے آپ فکر نہ کریں۔ پولیس اور عدالت والے جادو ٹونے کو نہیں مانتے۔ یوں بھی آپ کی اماں وظیفہ پڑھتی اور پڑھاتی ہیں۔ جادو ٹونے نہیں کرتیں۔ کسی ثبوت اور گواہ کے بغیر انہیں گرفتار نہیں کیا جا سکتا۔''

''پھر پولیس والے انہیں کیوں لے گئے ہیں؟''

''ان تھانے والوں کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔ کوئی واردات ہو جائے اور انہیں اپنی کارکردگی دکھانی ہو تو یہ شیر کی جگہ بکری کو لا کر باندھ دیتے ہیں۔ خانہ پُری تو کرنی ہی ہوتی ہے۔ اس طرح جیب گرم کرنے کا بھی موقع مل جاتا ہے۔ یہ اماں کو چھوڑنے کے لیے کچھ لمبی

ہی رقم مانگیں گے۔''

وہ پریشان ہوکر سوچنے لگی۔اس کے پرس میں دس ہزار روپے تھے۔جس میں سے ابھی دو ہزار کونسلر کو دیئے تھے۔باقی آٹھ ہزار رہ گئے تھے اور وہ لمبی رقم کی بات کر رہا تھا۔

اس کے لیے رقم کوئی مسئلہ نہیں تھی۔ابھی فون کرتی تو عمار اسے لاکھوں روپے بھیج دیتا لیکن بات وہی تھی کہ وہ یہ بات سسرال والوں تک نہیں پہنچانا چاہتی تھی۔

کونسلر نے اسے پریشان دیکھ کر کہا۔''آپ پریشان نہ ہوں میں ہوں ناں، آپ کی خدمت کے لیے۔فی الحال آپ دس ہزار کا انتظام کردیں۔باقی میں ان سے نمٹ لوں گا۔''

وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔''کیا آٹھ ہزار میں کام نہیں چلے گا؟''

''کوئی بات نہیں۔آٹھ ہزار میں مک مکا نہ ہوا تو میں ادھار کرلوں گا۔انہیں بعد میں دے دیا جائے گا۔''

اس نے پرس میں سے ہزار ہزار کے آٹھ نوٹ نکال کر باپ کو دیتے ہوئے کہا۔

''ابا......!تم ان کے ساتھ جاؤ۔''

دونوں بھائی ان نوٹوں کو ندیدوں کی طرح دیکھنے لگے۔دونوں کے دل میں یہ بات تھی کہ کاش یہ پیسے تھانے والوں کے پاس نہ جاتے۔اماں تھانے میں نہ ہوتیں تو بہن ضرور اس رقم میں سے کچھ ہمیں بھی دیتی۔

باپ ان نوٹوں کو ہاتھ میں لیے بیٹھا تھا۔کچھ ہچکچا رہا تھا۔وہ بولی۔''ابا!اب اٹھو بھی، اماں وہاں بیٹھی ہوئی ہے۔''

وہ اٹک اٹک کر بولا۔''وہ.....بات یہ ہے کہ..... مجھے تھانے والوں سے خوف آتا ہے۔زندگی میں کبھی تھانے نہیں گیا ناں۔''

وہ جل کر بولی۔''اماں بھی زندگی میں پہلی بار تھانے گئی ہے اور وہ وہاں عورت ہوتے ہوئے اتنی دیر سے بیٹھی ہوئی ہے۔اس کا کچھ احساس کرو۔''

وہ بوڑھی عورت ان سب کو دیکھ رہی تھی پھر بولی۔''اے بھیا!اب اٹھ بھی جاؤ۔تم تو بہت ہی ڈرپوک ہو۔اماں گھر آجائے تو اس سے خوف دور کرنے کا کوئی تعویذ لکھوا کر گلے میں ڈال لینا۔تمہارے کام آئے گا۔میں تمہاری جگہ ہوتی تو فوراً رقم لے جا کر تھانے والوں کے منہ پر مارتی اور اماں کو گھر لے آتی۔''

وہ جبراً وہاں سے اٹھ کر کونسلر کے ساتھ چلا گیا۔خواہش بھائیوں کے ساتھ گھر آ گئی۔بے چینی سے ان لوگوں کی واپسی کا انتظار کرنے لگی۔خیالات ادھر اُدھر بھٹک رہے تھے۔

ایسے ہی وقت اس کا دھیان اس بیوہ ہونے والی عورت کی طرف چلا گیا۔ جس نے اماں پر یہ الزام لگایا تھا کہ اس کی دی ہوئی چینی کھا کر اس کا شوہر مر گیا ہے۔

دم کی ہوئی چینی کا خیال آتے ہی اسے طرح طرح کے اندیشوں نے گھیر لیا لیکن ایک ذرا اطمینان بھی تھا۔ اس نے تین دن پہلے عمار کو چینی کھلائی تھی اس کا کوئی الٹا اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ اس کے نصیبوں سے زندہ سلامت تھا۔ بلکہ خاطر خواہ نتیجہ سامنے آیا تھا۔ اس نے اس کوٹھے والی کو ماڈل بنانے سے انکار کر دیا تھا۔

خواہش نے پوچھا تھا۔ ''ایسی کیا بات ہوگئی؟ آپ کو وہ بہت پسند تھیں؟''

اس نے قریب ہو کر اس پر جھک کر پیار بھری سرگوشی میں کہا تھا۔ ''مجھے تو تم پسند ہو۔ تمہارے بعد پسندیدگی کے تمام خانے خالی ہو چکے ہیں۔ میں نے ان میں سے ایک کو اشتہاری فلم میں لینا چاہا تھا مگر یہ کوٹھے والیاں صرف بڑی آسامی پھانسنے کے لیے ماڈلنگ کرتی ہیں۔ وہ چاہتی تھی کہ میں اس کے کوٹھے پر آتا جاتا رہوں۔ میں نے اس کا کنٹریکٹ ہی ختم کر دیا۔''

وہ ایک دم سے کھل اٹھی پھر بولی۔ ''کیوں بے چاری کا کنٹریکٹ ختم کر دیا؟''

''نہ رہے گا بانس، نہ بجے گی بانسری۔ نہ وہ ایڈورٹائز کے بہانے آئے گی۔ نہ اسے چارہ ڈالنے کا موقع ملے گا۔''

اماں نے تو کمال کر دیا تھا۔ کوٹھے والی کا پتہ ہی کاٹ دیا تھا۔ وہ عمار کے سینے پر سر رکھ کر بولی۔ ''آپ میرے اتنے دیوانے ہیں۔ کیا آپ کو ایسا نہیں لگتا کہ میں آپ پر جادو کر رہی ہوں؟''

''ہاں...... یہ تو میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ تم جادو کر رہی ہو؟''

وہ ایک دم سے گھبرا کر الگ ہوگئی۔ اسے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگی۔ وہ مسکرا کر کہہ رہا تھا۔ ''شادی سے پہلے جب میں نے تمہیں چھپ کر دیکھا تھا، تب ہی سے تمہارا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔''

اس نے اطمینان کی ایک گہری سانس لی۔ اسے اپنی اماں پر پورا بھروسا تھا۔ اس کے وظیفے مثبت اثر دکھاتے تھے۔ اب یہ ضروری تو نہیں کہ وظیفے اور تعویذ ہمیشہ ہی اپنا اثر دکھاتے رہیں۔ زندگی کے ہر شعبے میں کبھی کامیابی ہوتی ہے، کبھی ناکامی۔ اماں کو بھی کبھی کبھی ناکامی ہوا کرتی تھی۔

یہی ناکامی کیا کم تھی کہ دونوں بیٹوں کو تعویذ پہنانے اور وظیفے پڑھانے کے باوجود کوئی

ڈھنگ کا روزگار نہیں ملا تھا۔ دو چار مہینے کسی نہ کسی ٹھیکے دار کے پاس کام کرتے تھے۔ ٹھیکے داری ختم ہوتی تھی تو روزگار کا سلسلہ بھی ختم ہو جاتا تھا۔ البتہ پرچون کی دکان اچھی چل رہی تھی۔ دکان کے بیچوں بیچ پنکھے کے نیچے تعویذ لٹکا رکھا تھا۔ جب وہ پنکھا تیزی سے گردش کرتا تھا تو وہ تعویذ چاروں طرف گھوم گھوم کر اپنا اثر دکھاتا تھا۔ اماں کے تمام عقیدت منداسی سے سامان خریدنے آتے تھے۔ یوں کسی کی محتاجی کے بغیر عزت و آبرو سے گزارہ ہو رہا تھا۔

موبائل فون کے بزر نے اسے چونکا دیا۔ اس نے چونک کر دیکھا ایک بھائی چار پائی پر بیٹھا ہوا تھا اور دوسرا بھائی دہلیز پر بیٹھا اماں کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے موبائل کی ننھی سی اسکرین پر دیکھا۔ سی ایل آئی پر نمبر بتا رہا تھا کہ عمار اسے یاد کر رہا ہے۔

اس نے ایک بٹن دبا کر فون کو کان سے لگایا۔ ''ہیلو۔ میں بول رہی ہوں!''

عمار کا پریشان سا لہجہ سنائی دیا۔ ''تم خیریت سے تو ہو؟''

''خدا کا شکر ہے، خیریت سے ہوں۔ آپ کچھ پریشان سے لگ رہے ہیں؟''

''کیا مجھے پریشان نہیں ہونا چاہیے؟ ابھی ڈرائیور نے بتایا ہے کہ تم پرابلم میں ہو۔ تمہاری اماں کو پولیس والے لے گئے ہیں۔''

اس کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ وہ بات چھپانا چاہتی تھی لیکن گھر کا بھیدی لنکا ڈھا گیا۔ پہلے تو وہ پریشان ہوئی پھر فوراً ہی اس نے بات بنائی۔ ''یہ ڈرائیور تو بالکل ہی بونگا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ وہ ذرا اونچا سنتا ہے۔ آم کہو تو املی سمجھتا ہے۔ پولیس والے بھلا میری اماں کو کیوں لے جائیں گے؟ البتہ میرے ابا تھانے گئے تھے۔ محلے کے نلکوں میں ایک ہفتے بعد پانی آیا تھا۔ پانی بھرنے کے سلسلے میں ایسے جھگڑے فسادات ہوئے کہ محلے کے کتنے ہی لوگوں کو تھانے جانا پڑا۔ ابا بھی گئے تھے، اب واپس آ گئے ہیں۔''

عمار نے مطمئن ہو کر کہا۔ ''تھینکس گاڈ! اب مجھے اطمینان ہوا ہے۔ اب تمہیں کوئی پریشانی تو نہیں ہے؟''

''آپ کی محبت کے سائے میں بھلا مجھے کیا پریشانی ہوگی؟''

''خواہش! تم دیکھتی ہو، شہر کے ان تمام بڑے علاقوں میں جہاں تعلیم یافتہ اور دولت مند رہتے ہیں، وہاں کبھی دنگے فسادات نہیں ہوتے، نہ کبھی سیاسی ہنگامے ہوتے ہیں۔ تم اس چھوٹے علاقے میں جاتی ہو تو مجھے ناگواری سی ہوتی ہے دل کہتا ہے، میری جان کو چھوٹے لوگوں میں نہیں جانا چاہیے۔''

وہ خوش ہو کر بولی۔ ''آپ میری مجبوری سمجھتے ہیں۔ میکے نہیں آؤں گی تو ماں باپ کا

دل دکھے گا۔''

''میں تم سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔ اپنے ابا کو مشورہ دو کہ اپنا وہ مکان اور دکان بیچ کر اچھے صاف ستھرے علاقے میں بڑا سا مکان خرید لیں۔ تم اپنی طرف سے انہیں دس بارہ لاکھ روپے دے سکتی ہو۔''

وہ مسرتوں سے بھر گئی۔ اس نے کہا۔ ''ابھی اماں آئیں گی تو میں ان سے اس سلسلے میں بات کروں گی۔''

''وہ کہاں سے آئیں گی؟ کیا وہ گھر میں نہیں ہیں۔''

وہ ایک دم سے گڑبڑا گئی پھر جلدی سے سنبھل کر بولی۔ ''وہ یہیں پڑوسن کے گھر گئی ہیں، آتی ہی ہوں گی۔''

''تم کب آ رہی ہو؟''

''جب آپ دفتر سے آئیں گے۔''

''میں اپنے وقت پر ٹھیک پانچ بجے آؤں گا۔ آج آؤٹنگ کا ارادہ ہے۔ سی ویو جائیں گے، وہیں کسی ہوٹل میں ڈنر کریں گے پھر رات گئے واپس آئیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔ آپ چار بجے ڈرائیور کو بھیج دیں۔ میں گھر پر ملوں گی اور بے چینی سے آپ کا انتظار کرتی رہوں گی۔''

وہ سرگوشی کے انداز میں بہت دھیمی آواز میں بولا۔ ''پھر تو تمہاری بے چینی دور کرنے میں وقت گزر جائے گا۔ ہم آؤٹنگ پر نہیں جا سکیں گے۔''

وہ شرما کر بولی۔ ''آپ بڑے وہ ہیں۔ میں فون بند کروں؟''

''ہاں...... مجھے یہاں ایک کلائنٹ سے باتیں کرنی ہیں۔ اب پانچ بجے ملاقات ہوگی، خدا حافظ......''

رابطہ ختم ہو گیا۔ اس نے فون کو آف کر کے پرس میں رکھ لیا۔ اسی وقت باہر شور اٹھا۔

''اماں آ گئی......اماں آ گئی......''

خواہش نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ دونوں بھائی بھی اچھل کر کھڑے ہو گئے پھر وہ سب دروازے سے باہر آئے۔ بہت دور گلی کے آخری سرے پر اماں کیا آ رہی تھی جیسے اس کی برات آ رہی تھی۔ محلے کے لڑکے اس کے آس پاس اچھل کود رہے تھے۔ شور مچا رہے تھے، گھروں کے دروازں اور کھڑکیوں سے عورتیں جھانک رہی تھیں۔ کچھ باہر آ گئی تھیں۔ خوشی کا اظہار کر رہی تھیں۔

ایک عورت نے دور سے پوچھا۔ ”اے اماں! سب خیریت تو ہے ناں؟“

وہ آگے بڑھتی ہوئی ہاتھ اٹھا اٹھا کر اونچی آواز میں بولی۔ ”خیریت کیسے نہیں ہوگی؟ کیا میں نے کسی کا کچھ لے کر کھایا ہے؟ کسی کو قتل کیا ہے؟ مجھے الزام دینے والے اپنے منہ کی کھا رہے ہیں۔ وہ کیا...... ؟ ان کے باپ دادا بھی قبر سے اٹھ کر آئیں گے تو میرے تعویذ گنڈوں کو جھوٹا ثابت نہیں کر سکیں گے۔“

ایک بوڑھی عورت نے قریب آتے ہوئے کہا۔ ”ہم سب اس الزام لگانے والی عورت کے خلاف آوازیں اٹھائیں گے۔“

اماں نے چادر سنبھالتے ہوئے ایک ہاتھ نچا کر کہا۔ ”اس کلموہی کے لیے میں اکیلی ہی کافی ہوں۔ ایسا تعویذ کروں گی کہ وہ اپنے میاں کے ساتھ قبر میں جا کر سو جائے گی۔“

خواہش کا باپ اس کے پیچھے پیچھے چلا آ رہا تھا۔ جلدی سے بولا۔ ”اری بانو! کیا کہہ رہی ہے؟ اگر اسے موت آ گئی تو تجھ پر یہ الزام آئے گا کہ تُو نے اس کے خلاف تعویذ کیے تھے۔ ذرا سوچ سمجھ کر بول۔ تُو تو ڈنکے بجا بجا کر اپنے اوپر الزام لے رہی ہے۔“

”تم چپ رہو جی! پولیس والے کیا بگاڑ لیں گے؟ تم نے دیکھا نہیں تھانے میں میری کیسی آؤ بھگت ہو رہی تھی؟ پہلے پانی دیا گیا پھر چائے پیش کی گئی اور خالی چائے نہیں۔ اس کے ساتھ بسکٹ بھی تھے۔“

وہ پیچھے پیچھے چلتے ہوئے بولا۔ ”وہ تجھے حلال کرنے سے پہلے کھلا پلا رہے تھے۔ دیکھا نہیں؟ بعد میں آٹھ ہزار لے لیے۔“

”لے لیے تو کیا ہوا؟ چار سپاہی میرے مرید بھی تو بن گئے ہیں۔ وہ مجھ سے تعویذ کروانے اور وظیفہ پڑھوانے یہاں آئیں گے ایک نے تو پچاس روپے ایڈوانس بھی دے دیئے ہیں۔ سب مجھے تعویذ والی اماں کہتے ہیں۔ تھانے بھی گئی تو وہاں اپنی دھاک بٹھا کر آئی ہوں۔“

وہ اونچی آواز میں بولتی جا رہی تھی۔ لپک جھپک چلی آ رہی تھی۔ دو عورتیں اپنے گھر سے باہر آ کر ہاتھ میں بڑی سی تھال اٹھا کر اسے ایک لکڑی سے ٹن ٹنا ٹن بجائے جا رہی تھیں۔ لڑکے اور بچے۔ ”تعویذ والی اماں زندہ باد“ کے نعرے لگا رہے تھے۔ وہاں کسی سیاسی جلسے کا سماں پیدا ہو گیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا، جیسے پورا علاقہ وہاں کھنچا چلا آیا ہو اور اس کے ساتھ ساتھ چل رہا ہو۔

وہ سب تھانے کے حالات معلوم کرنے کے لیے بے چین تھے۔ گلی میں آوازیں لگا کر چیزیں بیچنے والوں کی چاندی ہو گئی تھی۔ قلفی والے، غبارے والے اور دوسری چیزیں فروخت

کرنے والے اپنے ٹھیلے لے کر وہاں پہنچ گئے تھے۔ عورتیں خوش تھیں اور اس خوشی میں بچوں کی ضدیں پوری کر رہی تھیں۔

خواہش دروازے پر کھڑی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اماں کو آتے دیکھ رہی تھی۔ اس نے تو سوچا تھا کہ اماں جیسے ہی آئے گی وہ اس سے لپٹ کر رونے لگے گی۔ اس بات پر رونا آئے گا کہ ماں کو تھانے بلا کر اس کی توہین کی گئی ہے لیکن وہاں تو اماں جیسے میدان مار کر آ رہی تھی۔ اس کا باپ میدان مارنے والی کے کبھی پیچھے ہو رہا تھا، کبھی آگے آ رہا تھا۔ عورتوں اور بچوں کو ہٹا رہا تھا اس کے آگے بڑھنے کا راستہ صاف کرتا جا رہا تھا۔ ایسا خوشامدانہ انداز تھا کہ اگر ہاتھ میں جھاڑو ہوتی تو وہ راستہ صاف کرتا ہوا اماں کو گھر کی دہلیز تک لاتا۔

اماں نے گھر کے قریب پہنچتے پہنچتے خواہش کو دیکھا تو دونوں ہاتھ پھیلا کر تیزی سے چلتی ہوئی آگے بڑھتی ہوئی بولی۔ ''ہائے میری بچی! میں جانتی ہوں، تُو پریشان ہو رہی تھی مگر کیا تُو اپنی اماں کو نہیں جانتی؟ جب تک تھانے میں بیٹھی رہی وظیفہ پڑھتی رہی اور پھونکتی رہی۔ کسی افسر کی کسی پولیس والے کی مجال نہیں تھی کہ وہ مجھ سے آنکھیں ملا کر بات کر سکتا۔''

اس نے بیٹی کے قریب آ کر، اس کے چہرے کو تھام کر پیشانی کو چوم لیا۔ اس کے بعد نہ مزید پیار کرنے کا موقع ملا، نہ بیٹی سے بات کرنے کا۔ عورتیں اتنی تھیں کہ اسے رگیدتی ہوئی مکان کے اندر لے گئیں۔ سب کو بے چینی تھی، سب ہی اس سے تھانے کے بارے میں اور اس الزام لگانے والی کے بارے میں بہت کچھ پوچھنا چاہتی تھیں۔ جتنی باہر والیاں تھیں، وہ سب اندر چلی گئیں اور وہ دروازے کے باہر ہی کھڑی رہ گئی۔ اندر پاؤں رکھنے کی جگہ بھی نہیں رہی تھی۔

اس نے باپ سے پوچھا۔ ''ابا! تھانے والوں نے کتنی رقم لی؟''

''بیٹی! وہ تو بہت ہی منہ پھاڑ رہے تھے، پچیس ہزار مانگ رہے تھے۔ کونسلر نے منت سماجت کی، پندرہ ہزار تک نوبت ٹھہری مگر میں نے کہا، نہیں میرے پاس تو صرف آٹھ ہزار روپے ہیں۔ یہ بھی میری بیٹی کے پیسے ہیں۔ داماد سے قرض لیا گیا ہے، اس سے زیادہ ہم دے نہیں سکتے پھر نہ پوچھ کہ کیا ہوا؟''

وہ الجھ کر بولی۔ ''پھر کیا ہوا؟ کیا انہوں نے اماں سے کوئی بدتمیزی کی؟''

وہ سینہ ٹھونک کر بولا۔ ''میرے جیتے جی کون تیری ماں سے بدتمیزی کر سکتا ہے؟ میں نے تو تھانے دار سے صاف کہہ دیا کہ آٹھ ہزار میں مک مکا کرتا ہے تو بولو۔ نہیں تو میں یہاں دھرنا دے کر بیٹھ جاؤں گا۔ ہڑتال کروں گا مگر اپنی بیوی کو لے کر جاؤں گا۔ دیکھ لو۔ آخر میں تمہاری ماں کو چھڑا کر لے ہی آیا۔ دس ہزار میں بات بنی تھی دو ہزار ادھار کیے ہیں۔ وعدہ کیا

ہے کہ آج سے ٹھیک ایک ہفتے بعد یہ دو ہزار بھی دے دوں گا۔''

اس نے چور نظروں سے بیٹی کو دیکھا پھر کہا۔''اب چاہے مجھے دکان کا مال اونے پونے بیچنا پڑے۔ دو ہزار اتارنے کے لیے کچھ تو کرنا ہوگا۔''

وہ ناگواری سے بولی۔''تمہیں ایسا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں دو ہزار بھیج دوں گی۔''

وہ خوش ہو کر بولا۔''بیٹی! خوش رہو، اللہ تمہیں مزید دے۔ اگر تم وہ رقم نہ دیتیں تو تھانے والے تمہاری ماں کو کبھی نہ چھوڑتے۔''

''ابھی تو تم دعویٰ کر رہے تھے کہ بھوکے پیاسے رہ کر اماں کو لے آتے۔''

وہ جھینپ کر بولا۔''وہ...... بات یہ ہے کہ ہماری بھوک ہڑتال سے ان کم بختوں پر کیا اثر پڑتا؟ میں نے تو صرف دھمکی دی تھی اور اگر بھوک ہڑتال کرنے کی نوبت آتی تو میں کبھی پیچھے نہ ہٹتا، تُو جانتی ہے کہ میں تیری اماں کو کتنا چاہتا ہوں؟ اس کے لیے تو جان بھی دے سکتا ہوں۔''

اس نے باپ کو ناگواری سے دیکھا۔ جب تک اس نے آٹھ ہزار نکال کر نہیں دیئے تھے اس وقت تک وہ اماں کے خلاف بولتا ہی چلا جا رہا تھا۔ رقم ملنے کے بعد پولیس اسٹیشن نہیں جانا چاہتا تھا۔ خوف ظاہر کر رہا تھا اور اب اماں کو تھانے سے ایسے لے کر آیا تھا جیسے جان کی بازی لگا کر لایا ہو۔

باپ ایسا تھا تو دونوں بھائی بھی کچھ کم نہ تھے۔ ماں کے تھانے سے آتے ہی مطمئن ہو گئے تھے۔ اب کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ کہیں ڈبو یا ویڈیو گیم کھیلنے چلے گئے تھے اور اماں تھی کہ تھانے سے آتے ہی قومی اسمبلی کا اجلاس طلب کر کے بیٹھ گئی تھی۔

اس نے موبائل فون پر وقت دیکھا، تین بج رہے تھے۔ ایک گھنٹے بعد ڈرائیور گاڑی لے کر آنے والا تھا۔

☆======☆======☆

اس بار خواہش اپنا موبائل فون اماں کو دے کر آئی تھی اور اسے کہہ دیا تھا۔''میں ہر ہفتے نہیں آ سکوں گی۔ عمار کو میرا اس علاقے میں آنا جانا پسند نہیں ہے۔ یہ فون تمہارے پاس رہے گا میں کسی بھی وقت تم سے بات کر سکوں گی۔''

اس نے ماں باپ دونوں کو موبائل فون کا استعمال اچھی طرح سمجھا دیا تھا۔ وہ فون اماں کے حوالے کر کے ایک طرح سے میکے سے دور ہو گئی تھی۔ عمار کو خوش رکھنے کے لیے اسے اپنے ماں باپ سے دوری بھی منظور تھی۔

اس نے رات کو سوتے وقت عمار سے کہا۔ ''آپ نے درست کہا تھا کہ مجھے بار بار اس چھوٹے علاقے میں نہیں جانا چاہیے۔ آپ کی عزت کا خیال کرنا چاہیے۔''

''ہاں۔ میں نے کہا تھا۔ بعد میں مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ آخر وہ تمہارا میکا ہے۔ تمہیں تو وہاں جانا ہی ہوگا۔ کیا تم نے اپنے ابا سے بات کی تھی کہ وہ کسی اچھے علاقے میں منتقل ہو جائیں۔''

''نہیں۔ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ پانی کے سلسلے میں وہاں جھگڑے فسادات ہو رہے تھے۔ تھانے پولیس کا ایسا چکر چل رہا تھا کہ لوگوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ اماں اور ابا سے بات کرنے کا موقع نہیں ملا۔ میں کل صبح ان سے اس سلسلے میں بات کروں گی۔''

''کیا صبح پھر جاؤ گی؟''

''نہیں۔ میں آپ کو یہ بتانا بھول گئی کہ میں نے اپنا موبائل فون اماں کو دے دیا ہے۔ اب مجھے وہاں بار بار جانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ جب بھی ان سے بات کرنی ہوگی، ان کی یاد آئے گی تو میں فون کے ذریعے ان سے رابطہ کر لیا کروں گی۔''

عمار نے اسے بازوؤں میں سمیٹتے ہوئے کہا۔ ''یور آر سو سوئٹ! تم میری عزت کا کتنا خیال رکھتی ہو؟''

''میں اماں سے صاف صاف کہہ دوں گی کہ وہ مکان اور دکان جلد از جلد مکان بیچ کر کسی دوسرے اچھے صاف ستھرے علاقے میں ایک نیا مکان خرید لیں۔ رقم کی کمی ہوگی تو وہ ہم پوری کر دیں گے۔''

''تم اماں کے سامنے یہ شرط پیش کرو کہ اب ان سے اسی وقت ملو گی جب وہ کسی اچھے علاقے کے مکان میں شفٹ ہو جائیں گی پھر تو تمہارے ابا جلد سے جلد مکان اور دکان فروخت کر کے نئی جگہ جانا چاہیں گے۔''

وہ اپنے پورے وجود کے ساتھ اس پر نچھاور ہونے لگی۔ کہنے لگی۔ ''آپ مجھے کتنا چاہتے ہیں؟ میری خاطر میرے ماں، باپ اور بھائیوں کو ایک اچھے علاقے میں پہنچانا چاہتے ہیں۔ میں آپ سے تمام عمر محبت کرتی رہوں، آپ کی خدمت کرتی رہوں، پھر بھی آپ کی محبتوں اور مہربانیوں کا صلہ نہیں دے سکوں گی۔''

وہ اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا ''یہ کیا بکواس ہے؟ یہ مہربانی کا لفظ کہاں سے آیا؟ کیا میں تم پر مہربانیاں کر رہا ہوں؟ تم میری شریکِ حیات ہو، میری جان ہو۔ میرا جو کچھ بھی ہے اس میں تمہارا برابر کا حصہ ہے۔ اگر میں تمہیں کچھ دیتا ہوں تو تم پر مہربانی نہیں

کرتا۔تم مجھ سے اپنا حق وصول کرتی ہو۔"

وہ عمار کی ایسی محبت کا انداز دیکھ کر سوچنے لگی تھی۔"اگر اماں نہ ہوتی، اس کے وظیفے اور تعویذ نہ ہوتے تو کیا مجھے ان سے ایسی محبتیں ملتیں؟"

"شاید ملتیں یا شاید نہ ملتیں۔وہ نصیب والیاں ہوتی ہیں جن کے شوہر شادی کے بعد بڑھاپے تک ان کے دیوانے بن کر رہتے ہیں۔اماں کہتی ہے۔کون شوہر کی پیشانی پر پڑھ سکتا ہے کہ یہ سدا دیوانہ بن کر رہے گا یا نہیں؟ اس لیے کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہیے۔اسے اپنے طور طریقوں سے قابو میں کر کے رکھنا چاہیے۔"

اماں کے پاس تعویذ گنڈوں کی کتابیں تھیں۔جن میں شوہر کو اُلو بنا کر رکھنے کے لیے بہت سے نسخے لکھے ہوئے تھے۔

دوسرے دن عمار اپنے دفتر میں حسبِ معمول بہت مصروف رہا۔کتنے ہی کلائنٹس آتے رہے۔ان سے گرما گرم بحث ہوتی رہی۔معاملات طے ہوتے رہے پھر لنچ کے وقت اس نے خواہش کو یاد کیا۔جی میں آیا کہ اس کی آواز سن کر ذہن کو فریش کیا جائے۔

"اس نے فوراً ہی اپنے موبائل کے ذریعے رابطہ کیا۔رابطہ ہوتے ہی اس نے کہا۔

"ہیلو......میری جان!"

دوسرے ہی لمحے دوسری طرف سے اماں کی تیز اور کرخت آواز سنائی دی۔"ارے کم بخت! کون ہے تُو؟ نگوڑ مارے! مجھے اپنی جان بنا رہا ہے؟ ناس پیٹے! میں تیری اماں کے برابر ہوں۔تجھے شرم نہیں آتی؟ میں سمجھ گئی، یہ میری بیٹی کا فون ہے اور تُو اسے تنگ کرتا ہے،اس سے عشق لڑانا چاہتا ہے۔میری بیٹی کو بدنام کرنا چاہتا ہے۔داماد جی کو معلوم ہوگا تو قیامت آجائے گی۔منحوس مارے!اب اگر تُو نے فون کیا تو میں اسی موبائل فون سے تیرا منہ توڑ دوں گی۔"

اس نے فون بند کر دیا۔دوسری طرف عمار پہلے ہی رابطہ ختم کر چکا تھا۔اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام رکھا تھا۔اپنی یادداشت پر لعنت بھیج رہا تھا۔پچھلی رات خواہش نے اسے بتایا تھا کہ اس نے اپنا فون اماں کو دے دیا ہے لیکن دفتری جھمیلوں میں یہ بات اس کے ذہن سے نکل گئی تھی۔اس نے ذہن کو فریش کرنے کے لیے فون کیا تھا کیا خبر تھی کہ دوسری طرف سے انگارے برسنے لگیں گے۔

یہ سوچ کر شرمندگی ہو رہی تھی کہ اس نے اپنی ساس کو میری جان کہہ دیا ہے۔وہ کچھ دیر تک نادم سا رہا۔اپنی ریوالونگ چیئر سے اٹھ کر اِدھر سے اُدھر ٹہلتا رہا پھر اس نے گھر کے فون پر رابطہ کیا۔

دوسری طرف سے اسے اپنی ماں کی آواز سنائی دی۔ وہ سلام کرنے کے بعد بولا۔ ''خواہش کہاں ہے؟''

وہ بولی۔''اپنے کمرے میں ہے...... بلا دوں؟''

وہ۔''جی'' کہہ کر انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد خواہش کی آواز سنائی دی۔''ہیلو! کیسے یاد کیا؟''

''وہ...... بات یہ ہے کہ......''

وہ ہچکچانے لگا۔ وہ بولی۔''کیا بات ہے؟ آپ ہچکچا کیوں رہے ہیں؟ کہیں کسی مشکل میں تو نہیں ہیں؟''

''ہاں۔ بڑی مشکل میں ہوں لیکن تمہیں پریشان نہیں ہونا چاہیے۔''

''یہ کیا بات ہوئی؟ آپ مشکل میں ہوں اور میں پریشان نہ ہوں۔ یہ بھلا کیسے ممکن ہے؟''

''دراصل۔ میں نے تمہارے فون پر رابطہ کیا تھا...... تو اماں سے رابطہ ہو گیا۔''

''تو کیا ہوا؟ اپنی خوش دامن صاحبہ سے خوب باتیں ہوئی ہوں گی۔''

''کیا خاک باتیں ہوتیں؟ مجھ سے بہت بڑی حماقت ہو گئی۔''

''کیسی حماقت؟''

''وہی تو میں بتانے جا رہا ہوں مگر مجھے شرمندگی سی ہو رہی ہے۔ میں بھول گیا تھا کہ تم نے وہ فون اپنی اماں کو دے دیا ہے۔ میں نے رابطہ ہوتے ہی انہیں، میری جان کہہ دیا۔''

خواہش کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ وہ بولا۔''تمہیں ہنسی آ رہی ہے اور یہاں مجھے شرمندگی ہو رہی ہے۔''

''شرمندگی کیسی؟ چلیں اس بہانے اماں کو معلوم ہو گیا کہ آپ مجھے اپنی جان سمجھتے ہیں۔''

''انہیں کچھ معلوم نہیں ہوا۔ انہوں نے تو ایک منٹ میں ایک ہزار صلواتیں سنا دیں۔ وہ سمجھ رہی تھیں کہ کوئی تمہارا عاشق ہے جو فون پر تمہیں میری جان کہہ رہا ہے۔''

وہ ایک بار پھر کھلکھلا کر ہنسنے لگی پھر بولی۔''میں ابھی اماں کو فون کر کے ان کا ذہن صاف کر دیتی ہوں۔''

''اور ان سے کہہ دینا کہ آج تمہارا ڈرائیور ایک نیا موبائل فون لے کر ان کے پاس آ رہا ہے۔ وہ اس فون کو اپنے پاس رکھیں گی اور تمہارا موبائل فون تمہیں واپس کر دیں گی۔ کیونکہ تمہارا وہ نمبر میرے ذہن میں نقش ہو گیا ہے۔ میں پھر کبھی بھول سے وہی نمبر پنچ کر سکتا ہوں۔

تمہارا یہ دیوانہ صرف تم سے ہی نہیں، تمہاری ہر چیز سے پیار کرتا ہے۔ اس لیے وہ موبائل فون تمہارے پاس ہونا چاہیے۔''

وہ اس کی باتیں سن کر مست ہو رہی تھی۔ واقعی وہ اس کا بری طرح دیوانہ بن چکا تھا۔ وہ اپنی خوش قسمتی پر ناز کر رہی تھی اور اماں کو دعائیں دے رہی تھی۔

یہ اس کی خوش قسمتی تھی یا اماں کے وظیفے تھے، جو کچھ بھی تھا۔ وہ بہت خوش حال زندگی گزار رہی تھی۔

یوں تین برس گزر گئے۔ پتا ہی نہ چلا کہ وقت کو کیسے پَر لگ گئے تھے؟ اگر وہ صرف میاں بیوی ہوتے تو وقت بوجھ کی طرح آہستہ آہستہ گزرتا اور انہیں بھی بوجھل کرتا رہتا لیکن وہ تو ایک دوسرے کے دیوانے تھے اور اس سے زیادہ عمار اس کا دیوانہ تھا۔ اسے اتنی محبتیں دیتا رہتا تھا کہ اسے دن اور تاریخ یاد کرنے کی بھی فرصت نہیں ملتی تھی۔

تیسرے برس اس کے پاؤں بھاری ہوئے، چوتھا برس شروع ہونے تک اس نے ایک پیارے سے بیٹے کو جنم دیا۔ ساس صاحبہ تو نہال ہو گئیں پوتے کو گود میں لیے لیے پوری کوٹھی میں پھرنے لگیں۔ رشتہ داروں کو دعوت دی گئی۔ عزیز و اقارب، دوست احباب سب کو بلایا گیا، خوشیاں منائی گئیں یوں لگ رہا تھا، جیسے اس دنیا میں پہلی بار کسی بچے نے جنم لیا ہو۔

عمار کچھ اور زیادہ دیوانہ ہو گیا۔ کہنے لگا۔ ''امی تو ایسے باؤلی ہوئی پھر رہی ہیں، جیسے تم نے ایک شاہکار کو جنم دیا ہو۔''

وہ بولی۔ ''اگر یہ شاہکار نہیں ہے تو پھر آپ کی نظر میں کیا ہے؟''

وہ بولا۔ ''یہ میری محبت کا انعام ہے۔ دنیا کی کوئی عورت مجھے اتنا بڑا انعام نہیں دے سکتی۔''

اس نے شوخی سے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''کیوں نہیں دے سکتی؟ دوسری لے آئیں۔ وہ بھی ایک آدھ برس بعد ایسا انعام ضرور دے گی۔''

''تم میرا مزاج اچھی طرح سمجھتی ہو۔ ایک دیوانے اور ایک عیاش میں بہت فرق ہوتا ہے اور میں عیاش نہیں ہوں۔ تمہاری زندگی میں کبھی کوئی دوسری عورت یہاں قدم نہیں رکھ سکے گی۔''

کوئی ضروری نہیں کہ آدمی جو دعویٰ کرے اس پر عمل بھی کرے وہ کتنا ہی نیک نیت کیوں نہ ہو، لیکن کبھی کبھی تقدیر کا ایسا چکر چلتا ہے کہ حالات اسے وہ کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں جو وہ کرنا نہیں چاہتا۔

لندن سے ایک فون کال آئی۔ خواہش ٹیلی فون کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا تو کسی لڑکی کی آواز سنائی دی۔ ''ہیلو۔ میں لندن سے رابی بول رہی ہوں۔''

خواہش کو یاد آیا، عمار نے اور اس کی ساس نے بتایا تھا کہ اس کی ایک آنٹی لندن میں رہتی ہیں۔ وہاں ان کے جوان بچے ہیں اور وہاں ان کا کاروبار خوب چل رہا ہے۔ ان بچوں میں ایک لڑکی کا نام رابی ہے۔ وہ دوسری طرف سے بول رہی تھی۔ ''ہیلو۔ تم کون ہو؟ کیا وہاں آنٹی ہیں...... یا عمار ہیں؟''

اس کی ساس اپنے پوتے کو گود میں لیے بیٹھی ہوئی تھی اس نے ریسیور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''لندن سے رابی کا فون ہے۔''

ساس صاحبہ نے فوراً ریسیور لے کر کان سے لگایا پھر خوش ہو کر کہا۔ ''ہیلو...... رابی! کیسی ہو؟ کیا تمہاری ممی نے تمہیں بتایا کہ میں دادی بن چکی ہوں۔ میرا پوتا اس وقت میری گود میں ہے۔ بہت ہی کیوٹ ہے۔''

پھر وہ دوسری طرف کی باتیں سن کر بولی۔ ''تمہیں بھی مبارک ہو! میں نے تمہاری ممی سے کہا تھا کہ انہیں یہاں آنا چاہیے۔ میرے پوتے کو دیکھنا چاہیے۔ وہ کیوں نہیں آئیں؟''

وہ دوسری طرف کی باتیں سنتی رہی پھر خوش ہو کر بولی۔ ''اچھا؟ تو تم آ رہی ہو؟ ان کے ساتھ مجبوری ہے تو کوئی بات نہیں۔ تم ہی چلی آؤ۔ یہ بتاؤ، کب تک آ رہی ہو؟''

وہ کچھ سننے کے بعد چہک کر بولی۔ ''اچھا...... پرسوں کی فلائٹ سے؟ یعنی یہاں رات دس بجے تک پہنچ جاؤ گی؟ ہوں...... ہوں...... اچھا...... تو یہاں کچھ عرصہ رہنے کے لیے آ رہی ہو؟ یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ یہ تمہارا ہی گھر ہے۔ جب تک جی چاہے رہو اور پاکستان کو بھی دیکھو۔ تم لوگوں نے اپنے وطن کو بھلا ہی دیا ہے۔''

وہ رابی کی باتیں سننے لگی پھر بولی۔ ''عمار تو آفس میں ہے۔ شام پانچ بجے کے بعد ہی گھر آتا ہے۔ میں اسے بتا دوں گی کہ تم پرسوں یہاں پہنچ رہی ہو۔ وہ تمہیں لینے کے لیے ایئرپورٹ پہنچے گا۔ یہ شہر تمہارے لیے اجنبی ہے مگر ہم تو اجنبی نہیں ہیں پھر عمار تو تمہارا بچپن کا ساتھی ہے۔ وہ تمہاری آمد کی خبر سنے گا تو خوشی سے کھل جائے گا۔''

خواہش خاموشی سے ساس کی باتیں سن رہی تھی۔ اچانک ہی اس کے کانوں میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ ساس کے یہ الفاظ اس کے دماغ میں گونج رہے تھے کہ عمار اور رابی بچپن کے ساتھی ہیں اور وہ اس کی آمد سے بہت خوش ہو گا۔ صرف اتنا ہی نہیں، وہ یہاں کچھ عرصہ رہنے کے لیے آ رہی ہے۔

ساس کی آواز نے اسے چونکا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ''یہ لو بیٹی! ریسیور رکھ دو۔''

اس نے ریسیور لے کر کریڈل پر رکھ دیا۔ ساس نے کہا۔ ''عمار نے تمہیں رابی کے

بارے میں تو کچھ بتایا ہی ہوگا؟''

''جی ہاں۔ یونہی سرسری ذکر کیا تھا۔ کیا وہ تنہا آ رہی ہے؟''

وہ مسکرا کر بولی۔ ''تمہیں حیرانی ہو رہی ہو گی کہ ایک جوان لڑکی اتنی دور سے تنہا آ رہی ہے۔ بھئی وہ بہت آزاد خیال ہے۔ بچپن سے ہی بہت تیز طرار تھی۔ اب تو مزید ہو گئی ہے۔ یورپ اور امریکا میں تنہا گھومتی پھرتی ہے۔''

''کیا وہ ہمارے گیسٹ ہاؤس میں رہیں گی؟''

''نہیں خواہش! کیسی باتیں کرتی ہو؟ وہ میری بہن کی بیٹی ہے۔ میرے بھانجی ہے۔ یہاں ہمارے ساتھ کوٹھی میں رہے گی۔ میں اس کے لیے ایک کمرا ارینج کروا دوں گی۔ وہ انگریزوں کے ماحول سے آ رہی ہے۔ تم اس کے مزاج کو کسی حد تک سمجھ سکتی ہو۔''

''آپ فکر نہ کریں۔ میں اس کے مزاج کے مطابق ایک کمرا سیٹ کروا دوں گی۔''

وہ اپنے پوتے کو چومتے ہوئے بولی۔ ''پتا ہے؟ میں نے اور آپا نے یہ طے کیا تھا کہ رابی یہاں میری بہو بن کر آئے گی مگر آج کل کے جوان بڑے ہی سرپھرے ہوتے ہیں۔ ادھر عمار نے شادی سے انکار کیا، کاروباری مصروفیت کا بہانہ کرتا رہا، اُدھر رابی کہیں گھومنے پھرنے کے لیے نکل گئی۔ پورے چھ ماہ بعد واپس آئی۔ اس وقت تک ہم دونوں بہنوں نے سمجھ لیا کہ ان کا رشتہ نہیں ہو سکے گا۔ ویسے یہ دونوں ایک دوسرے کو چاہتے بہت ہیں۔ بچپن سے ہی ایک دوسرے کے مزاج کو سمجھتے آئے ہیں۔ اسی لیے اب بھی فون، یا ای میل کے ذریعے ایک دوسرے سے رابطہ رکھتے ہیں۔''

خواہش یہ ساری باتیں سن رہی تھی اور اس کا دل ڈوبتا جا رہا تھا۔ عمار نے ایک دو بار ہی سرسری طور پر رابی کا ذکر کیا تھا پھر کبھی اس کا تذکرہ نہیں ہوا تھا۔ اس نے کبھی یہ نہیں بتایا کہ رابی لندن سے فون کرتی ہے اور ای میل کے ذریعے بھی اس کے رابطے میں رہتی ہے۔''

انسانی مزاج کے مطابق میاں بیوی میں کبھی کبھی جھگڑا ہوتا رہنا چاہیے۔ کبھی شوہر کو ناراض ہو کر بیوی سے دور چلے جانا چاہیے پھر واپس آنا چاہیے۔ اس طرح بیوی کو اعتماد رہتا ہے کہ شوہر کہیں بھی جائے گا لیکن آخر کو واپس اپنی گھر والی کے پاس ہی آئے گا۔

پچھلے تین برسوں میں عمار سے اس کا کبھی کوئی زبردست جھگڑا نہیں ہوا تھا۔ وہ اسے کبھی چھوڑ کر کہیں نہیں گیا تھا۔ اگر کبھی ناراض ہو بھی جاتا تھا تو کچھ دیر بعد خود ہی راضی ہو جاتا تھا یا وہ اسے منا لیتی تھی۔

آج رابی کی آمد اس کا دل دہلا رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اسے چھیننے کے لیے آ

رہی ہے اور جب وہ رابی کے ساتھ چلا جائے گا تو پھر لوٹ کر نہیں آئے گا۔ ایک ہرجائی شوہر کو کس طرح صبر و تحمل سے سمجھایا منایا جاتا ہے؟ کس طرح محبت سے جیتا جا سکتا ہے؟ یہ وہ نہیں جانتی تھی۔ وہ تو بس ایک ہی راستہ جانتی تھی اور وہ اماں کے گھر کا راستہ تھا۔

اس نے اپنے بیڈ روم میں آ کر اپنے موبائل فون کے ذریعے اماں کے فون پر رابطہ کیا پھر رابطہ ہونے کے بعد کہا۔ ''اماں! میں بول رہی ہوں۔''

''اے بیٹی! میں تو فون کی گھنٹی بجتے ہی سمجھ گئی تھی کہ تم ہو۔ بیٹی یہ تم نے میرے ہاتھ میں کیا تھما دیا ہے؟ اب تو محلے والے مجھے تعویذ والی اماں کے بجائے موبائل والی اماں کہہ کر مخاطب کرنے لگی ہیں۔''

''کیا تم پھر پرانے محلے میں جانے لگی ہو؟''

''روز نہیں جاتی۔ کبھی کبھی جاتی ہوں۔ پرانے لوگ ہیں، ان کی محبتیں یاد آتی ہیں تو چلی جاتی ہوں۔ یہ جو نیا علاقہ ہے، ویسے ہے تو اچھا، صاف ستھرا ہے۔ سب پڑھے لکھے لوگ رہتے ہیں مگر گٹ پٹ بولتے ہیں۔ بس یہی مجھے پسند نہیں ہے۔ تمہاری وجہ سے یہاں آ کر رہنے لگی ہوں۔ ویسے ایک بات ہے، یہاں تمہارے ابا کی دکان خوب چل رہی ہے اور میرے بھی یہاں کئی عقیدت مند پیدا ہو گئے ہیں۔ تعویذ وغیرہ کروانے آتے ہیں۔ آہستہ آہستہ میری مشہوری ہو رہی ہے۔''

''اماں! تم بولتی ہی رہو گی یا میری بھی کچھ سنو گی؟''

''ہاں بیٹی! بول...... میں تو تیری ہی باتیں سننے کے لیے فون کو کان سے لگائے کھڑی ہوں۔ جب تُو بولتی ہے تو لگتا ہے کہ تُو میرے کان میں آ گئی ہے۔ دل میں اُتر گئی ہے اور میرے اندر بیٹھ کر بول رہی ہے۔ یہ انگریزوں نے بھی کیا چیز بنائی ہے۔ اس فون کے لیے نہ تار کی ضرورت ہے، نہ کھمبے کی میں خود ہی کھمبے کی طرح کھڑی ہوئی بول رہی ہوں۔''

''اماں! خدا کے لیے چپ ہو جاؤ۔ اگر کھڑی ہوئی ہو تو بیٹھ جاؤ۔ مجھے کچھ کہنے دو۔''

''تُو کچھ بولتی تو ہے نہیں۔ بس یہی کہے جا رہی ہے کہ کچھ کہنا چاہتی ہے۔ آخر بات کیا ہے؟ کچھ بول بھی تو سہی......''

''بات بہت ہی تشویش ناک ہے۔ میری زندگی میں زلزلہ پیدا ہونے والا ہے۔''

اماں نے اپنے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ''ہائے میں مر گئی۔ یہ زلزلہ دشمنوں کے گھر جائے، تُو مجھے صاف صاف بتا، بات کیا ہے؟ ایسا وظیفہ پڑھوں گی کہ...... کہ...... مگر پڑھوں گی کیا؟ پہلے بات تو بتا......''

''لندن سے عمار کی ایک کزن آ رہی ہے۔ اس کا نام رابی ہے مجھ سے پہلے عمار کی اس کے ساتھ رشتے کی بات چل رہی تھی مگر یہ بات آگے نہ چل سکی پھر مجھ سے عمار کی شادی ہو گئی مگر اب وہ تین برس بعد یہاں پہنچ رہی ہے۔ میرا تو دل ڈوب رہا ہے۔ مجھ سے تو کھڑا بھی نہیں ہوا جا رہا ہے۔ میرے پاؤں کانپ رہے ہیں۔ بیٹھ کر باتیں کر رہی ہوں۔''

''میری بچی! تُو فکر نہ کر...... میں ابھی وظیفہ پڑھتی ہوں تُو اپنے پیروں پر کھڑی ہو جائے گی۔''

''اماں! میں محتاج اور بے روزگار نہیں ہوں کہ تم مجھے میرے پیروں پر کھڑا کرو گی۔ تمہیں میرے لیے نہیں، عمار کے لیے یا اس آنے والی کے لیے کوئی وظیفہ پڑھنا ہے۔ کچھ کرنا ہے، اور جلدی کرنا ہے۔ میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔''

''تیری تو عادت ہے، ذرا سی بات پر ہی گھبرا جاتی ہے۔ ابھی کچھ ہوا نہیں ہے اور ہائے، ہائے کر رہی ہے۔ کیا اپنی ماں پر بھروسا نہیں ہے؟ مجھے بتا، وہ کب آ رہی ہے؟''

''وہ پرسوں رات دس بجے یہاں پہنچنے والی ہے۔''

''تُو فکر نہ کر۔ اس ٹرین کا ایسا حادثہ ہوگا کہ وہ موقع پر ہی اللہ کو پیاری ہو جائے گی۔''

''اماں! خدا کا واسطہ ہے کچھ سمجھا کرو۔ لندن سے کوئی ٹرین نہیں آتی۔ وہ ہوائی جہاز میں آئے گی۔''

''ہاں...... ہاں...... اتنا تو میں بھی جانتی ہوں، کوئی جاہل نہیں ہوں۔ وہ میرے وظیفے سے بچنے کے لیے جہاز میں آئے گی۔ تُو فکر نہ کر میں اس جہاز کو نیچے گرا دوں گی۔''

''تم خواہ مخواہ کسی کو مارنے کی بات کیوں کر رہی ہو؟ اس ایک لڑکی کی وجہ سے کیا ہوائی جہا کے تمام مسافروں کو مار ڈالو گی؟ کیا آج کل شیطانی جادو ٹونے کرنے لگی ہو؟''

وہ ذرا ہچکچاتے ہوئے بولی۔ ''میں کالا جادو...... کرتی تو نہیں ہوں...... لیکن بیٹی! کبھی کبھی اس کا سہارا بھی لینا پڑتا ہے۔ ورنہ میں تو تعویذ اور وظیفوں پر ہی تکیہ کرتی ہوں۔''

''میں رابی کی موت نہیں چاہتی۔''

''یہ رابی کون ہے؟''

''ابھی تو بتایا ہے، عمار کی کزن ہے، لندن سے آ رہی ہے۔''

''تو پھر اسے آنے دے، ذرا صبر سے کام لے۔ اپنی ماں پر بھروسا کر۔ وہ تیرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی۔ اُلو کی ایک عادت ہوتی ہے، وہ جس شاخ پر بیٹھتا ہے۔ ساری رات اسی پر بیٹھا رہتا ہے۔ وہاں سے اُڑ کر کسی دوسری شاخ پر نہیں جاتا۔ عمار بھی تیری ہی ڈال پر بیٹھا رہے گا۔''

اماں اس کی ڈھارس بندھا رہی تھی لیکن وہ اندر سے مطمئن نہیں ہو رہی تھی۔ وہ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صرف اپنی اماں پر ہی بھروسا کرتی تھی لیکن آج ایسا لگ رہا تھا کہ عمار اس کے ہاتھوں سے نکل جائے گا تو اماں بھی اسے واپس نہیں لا سکے گی۔

وہ گھبرا کر بولی۔ ''اماں! میں جانتی ہوں۔ تم مجھے کسی مصیبت میں نہیں دیکھ سکتی۔ اس آنے والی کا رستہ ضرور روکو گی مگر میری تسلی کے لیے کچھ تو کہو کہ تم کیا کر رہی ہو؟ اور مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

''میں جو کروں گی، اسے پہلے سے بتایا نہیں جاتا۔ ایسا کرنے سے عمل کا اثر زائل ہو جاتا ہے اور تُو مجھ سے کیا پوچھ رہی ہے کہ تجھے کیا کرنا چاہیے اتنا زبردست وظیفہ تجھے یاد کرایا تھا۔ شادی کی پہلی رات سے میاں پر حکمرانی کرتی آ رہی ہے۔ معلوم ہوتا ہے وہ وظیفہ پڑھنا تُو بھول گئی ہے؟''

''اماں! کیا کروں؟ پچھلے ایک برس سے فرصت ہی نہیں ملی۔ پاؤں بھاری ہوئے تو خوشی بھی ہوئی اور خوف بھی طاری رہا کہ زچگی کے وقت کیا ہوگا؟ نو ماہ تک کبھی طبیعت گرتی رہی کبھی سنبھلتی رہی۔ تمہارا نواسا ہوا تو دن رات اسی کی خدمت میں لگی رہتی ہوں۔ ان حالات میں وظیفہ پڑھنا بالکل یاد ہی نہیں رہا۔''

''ٹھوکر لگتی ہے تو بھولا ہوا سبق یاد آ جاتا ہے۔ اب فون بند کر اور وہ وظیفہ پڑھنا شروع کر دے۔ یہ اطمینان رکھ کہ اماں تجھ سے غافل نہیں ہے۔ اول تو تیری کوئی سوکن نہیں آئے گی اور اگر آئے گی تو اس دنیا سے چلی جائے گی۔''

رابطہ ختم ہو گیا۔ وہ فون بند کرتے ہی وظیفہ پڑھنے لگی پھر یاد آیا کہ یہ وظیفہ میاں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پڑھا جاتا ہے۔ وہ تیزی سے چلتی ہوئی الماری کے پاس آئی۔ اس نے اسے کھول کر ایک البم نکالی۔ اسے کھول کر دیکھا پھر اس میں سے عمار کی ایک بڑی سی تصویر نکال کر البم واپس رکھ دی۔ اس تصویر کو لے کر وہ ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔

پھر اپنے میاں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر وظیفہ پڑھنے لگی۔ پڑھتے پڑھتے رک گئی۔ اسے شبہ ہوا کہ اس نے ایک لفظ غلط پڑھا ہے۔ اس نے پھر پڑھنا شروع کیا پھر سوچا۔ ''نہیں ...... ایسے نہیں ...... ویسا تھا ......''

اس نے ویسا پڑھا تو پھر الجھ گئی۔ اطمینان نہیں ہو رہا تھا کہ صحیح پڑھ رہی ہے۔ وہ تصویر کو ایک طرف رکھ کر اٹھ گئی پھر وہاں سے چلتی ہوئی الماری کے پاس آئی۔ اسے کھول کر تین برس پرانی ایک ڈائری نکالنے لگی۔ اس میں وہ وظیفہ لکھا ہوا تھا۔

وہ صوفے پر آ کر بیٹھ گئی۔ اسے کھول کر پڑھنے لگی تو ایک ذرا پریشان ہوگئی۔ واقعی اس سے غلطیاں ہو رہی تھیں۔ اب سے پہلے بھی ضرورت کے وقت اماں کی ہدایت پر یونہی وظیفہ پڑھتی رہی تھی۔ اس وقت بھی یہی غلطیاں ہوتی رہی ہوں گی۔ اگرچہ اس کی یادداشت کمزور نہیں تھی مگر وہ الفاظ ایسے ثقیل اور ناقابلِ فہم تھے کہ وہ یاد کرنے کے باوجود انہیں بھولتی رہی ہوگی۔

اس نے وظیفے کو اچھی طرح ذہن نشین کرنے کے بعد ڈائری کو دوبارہ الماری میں رکھ دیا۔ کیونکہ وہ ان الفاظ کو دیکھ دیکھ کر وظیفہ پورا نہیں کر سکتی تھی۔ اماں کی ہدایت کے مطابق وظیفہ پڑھتے وقت صرف اپنے سامنے والے کی آنکھوں میں دیکھنا ہوتا ہے۔

وہ دوبارہ اپنی جگہ آ کر بیٹھ گئی۔ عمار کی تصویر اٹھا کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دل ہی دل میں وظیفے کا ورد کرنے لگی۔

عمار کی آنکھیں بڑی پُرکشش تھیں۔ سہاگ کی پہلی رات اس سے آنکھیں ملا کر وظیفہ پڑھتے وقت وہ ذرا گڑبڑا رہی تھی۔ پہلی بار ایک ایسے اجنبی سے آنکھیں ملا رہی تھی جو اپنوں سے بھی زیادہ اپنا بننے آیا تھا۔ کچھ شرم و حیا تھی، کچھ گھبراہٹ سی تھی، کچھ دل میں چور تھا اور دل تھا کہ جذبوں کے جنگل میں ناچتا ہوا مور تھا۔ ایسی ہلچل میں نہ جانے اس نے کس حد تک وہ وظیفہ درست پڑھا تھا جب عمار نے تابعداری سے پانی لا کر پیش کیا۔ تب ایک گونہ اطمینان ہوا کہ درست ہی پڑھا ہوگا۔

عمار کمرے میں آیا تو اسے دیکھتے ہی دروازے پر رک گیا۔ وہ اسے قدموں کی آہٹ سے پہچان لیا کرتی تھی لیکن اس وقت محویت کا یہ عالم تھا کہ آگے بڑھ کر استقبال کرنے والی نے سر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔

اس نے تعجب سے سوچا۔ ''یہ کس کی تصویر ہے؟ جسے اس قدر ڈوب کر دیکھا جا رہا ہے۔''

وہ دبے قدموں چلتا ہوا، صوفے کے پیچھے آیا پھر اپنی تصویر پر نظر پڑتے ہی خوشی سے کھل گیا۔ وہ اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ وہ نہیں ہوتا تب بھی وہ اسے دیکھتی رہتی تھی۔ اس کی محبت میں ایسے ڈوبی رہتی تھی، جیسے عبادت کر رہی ہو۔ آج اس نے عبادت کی حدوں کو چھونے والی محبت دیکھ لی تھی۔ مسرتوں سے مالا مال ہوگیا تھا۔

وہ پیچھے کھڑا ہوا تھا۔ اس نے بے اختیار جھک کر اس کی گردن کو چوم لیا۔ وہ ایک دم سے چونک کر چیخ پڑی۔ اس کے ہاتھ سے تصویر چھوٹ گئی۔ دل میں چور تھا، اس کی سمجھ میں یہی آیا کہ چوری پکڑی گئی ہے۔ وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''میں ہوں...... ڈر کیوں گئیں؟ بائی داوے...... میری تصویر تمہیں سحر زدہ کر رہی تھی یا تم مجھ پر سحر پھونک رہی تھیں؟''

وہ اسے دیکھ کر اپنے دھڑکتے ہوئے سینے پر ہاتھ رکھ کر گہری گہری سانسیں لے رہی تھی پھر بولی۔ ''آپ کب آئے؟''

''تم میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسم اعظم پڑھ رہی تھیں پھر کیسے نہ آتا؟''

وہ گھبرا کر بولی۔ ''آں...... نہیں...... میں تو کچھ نہیں پڑھ رہی تھی۔''

وہ اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنی چوری چھپانے کے لیے اس کے بازو میں منہ چھپا لیا پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا۔ اس نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ''آپ کے لیے ایک خوش خبری ہے۔''

''اچھا؟ کیا خوش خبری ہے؟''

''آپ کی منگیتر آ رہی ہے۔''

اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا پھر کہا۔ ''میری شادی ہو چکی ہے۔ میں باپ بن چکا ہوں، پھر میری منگیتر کہاں سے آ گئی؟''

وہ اس سے ذرا الگ ہوتے ہوئے بولی۔ ''شادی سے پہلے ایک منگیتر تھی۔ جو آپ سے بچھڑ گئی تھی وہ پرسوں رات دس بجے کی فلائٹ سے یہاں پہنچنے والی ہے۔''

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''اچھا...... تو تم رابی کی بات کر رہی ہو۔ ابھی وہ ایک گھنٹا ہوا پہلے مجھ سے ای میل کے ذریعے باتیں کر رہی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ پرسوں آ رہی ہے۔''

وہ اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''وہ آپ سے فون پر بھی باتیں کیا کرتی ہے؟''

''ہاں...... کبھی کبھی کرتی ہے۔''

''مگر آپ نے تو مجھے کبھی نہیں بتایا۔''

''میری جان! کوئی خاص بات ہوتی تو میں ضرور بتاتا۔ دن رات بے شمار ماڈلنگ کرنے والیوں سے ای میل اور فون کے ذریعے میرا رابطہ رہتا ہے۔ اس بیچ میں وہ بھی چلی آتی ہے۔ اگر اس کے فون کالز یا ای میل کی کوئی اہمیت ہوتی تو میں تم سے ضرور ذکر کرتا۔''

''ایسا بھی تو ہوتا ہے کہ بہت زیادہ اہمیت ہو تو اسے رازداری سے چھپا لیا جاتا ہے؟''

''تمہارے لہجے میں بھرپور طنز چھپا ہوا ہے۔ میں تمہیں بھرپور محبتیں دے رہا ہوں، ہمارا ایک پیارا سا بیٹا ہے۔ کیا تمہیں مجھ پر بھروسا نہیں ہے؟ کیا اب سے پہلے میں نے کوئی ایسی حرکت کی ہے جو تمہارے دل میں بے اعتباری پیدا کرے؟''

اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ انکار میں سر ہلایا۔ وہ بولا۔ ''جب میری محبت کا، میری

وفاداری کا اور دیوانگی کا ریکارڈ بالکل درست ہے، اس میں کوئی داغ دھبا نہیں ہے تو پھر یہ بے اعتباری کیسی؟"

وہ منہ پھلا کر بولی۔ "آپ نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا کہ اس کے ساتھ بچپن سے دوستی ہے؟"

"میں نے اپنے بچپن کا کبھی کوئی قصہ نہیں سنایا۔ اگر ماضی کی کوئی بات ہمارے درمیان ہوتی تو میں اس کا ذکر بھی ضرور کرتا اور پھر بچپن تو گزر چکا ہے۔ کیا اب میں جوان ہو کر، سمجھ دار ہو کر اس کے ساتھ کوئی بچپنے والی حرکت کروں گا؟"

"میں کچھ نہیں جانتی۔ آپ پرسوں اسے ریسیو کرنے ائیر پورٹ نہیں جائیں گے۔"

"یہ تو تم ان پڑھ عورتوں جیسی بات کہہ رہی ہو۔ ماشاءاللہ تم تو تعلیم یافتہ ہو، ذرا سوچ سمجھ کر بولو۔ اخلاق اور تہذیب کا تقاضا ہے کہ ہم گھر آنے والے مہمان کا استقبال کریں۔ وہ میری سگی خالہ کی بیٹی ہے۔ مجھے اسے ریسیو کرنے جانا ہی ہوگا اور تم بھی میرے ساتھ چلو گی۔"

اس نے پہلی بار ایک حاکم کے انداز میں اپنا فیصلہ سنایا۔ اگرچہ وہ فیصلہ اس کی مرضی کے خلاف تھا لیکن ایک حاکم کی حیثیت سے اس کا لہجہ بہت اچھا لگا اور یہ بات بھی اچھی لگی کہ تنہا نہیں جائے گا اسے بھی ساتھ لے جائے گا۔

☆======☆======☆

خواہش نے پہلی بار ائیر پورٹ کی وزیٹرز لابی میں رابی کو دیکھا۔ وہ کوئی غیر معمولی حسین لڑکی نہیں تھی۔ عام سی شکل وصورت والی تھی۔ چونکہ لندن سے آئی تھی۔ اس لیے لندن کا لباس اور اس کا مغربی انداز اسے یہاں کی لڑکیوں سے منفرد بنا رہا تھا اور جب کوئی چیز الگ سی دکھائی دیتی ہے تو اس میں خواہ مخواہ کشش پیدا ہو جاتی ہے۔

رابی میں بھی کچھ اسی طرح کی کشش تھی۔ عمار کو اس کی طرف کھنچا جانا چاہیے تھا لیکن وہ اسے دیکھتے ہی کھنچی چلی آئی۔ دونوں باہیں پھیلا کر چیختے ہوئے بولی۔ "ہیلو عمار! وہاٹ اے ہینڈسم مین! تم نے اپنی تصویر ای میل کے ذریعے بھیجی تھی۔ میں تب ہی سمجھ گئی تھی کہ بہت اسمارٹ ہو گئے ہو۔"

وہ اس کے قریب آ کر دونوں باہیں گلے میں ڈال کر لپٹ گئی۔ عمار نے فوراً ہی خود کو اس کی گرفت سے آزاد کراتے ہوئے کہا۔ "رابی! کیا کر رہی ہو؟ یہ لندن نہیں، پاکستان ہے۔ کراچی ہے۔ ذرا سہولت سے ملو۔ ورنہ سب تماشا سمجھ کر دیکھیں گے۔ ہوٹنگ کریں گے۔"

پھر وہ خواہش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "ان سے ملو یہ میری وائف خواہش

ہیں۔''

خواہش تو یہ تماشا دیکھ کر سکتے میں آ گئی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ کوئی اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے میاں سے یوں آ کر لپٹ جائے گی۔ یہ سرِعام ایسی ہے۔ اسے جلوت میں حیا نہیں ہے تو خلوت میں کیا کرتی ہوگی؟

یہ سوچ کر دل ڈوب رہا تھا کہ وہ بے لگام ہے۔ پتا نہیں بہت پہلے جب عمار سے ملتی رہی تھی تو اس کا یہی انداز رہا ہوگا؟

رابی نے خواہش کی طرف پلٹ کر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔''ہائے خواہش! میں تمہیں بھابی وابی نہیں کہوں گی۔ میں وہاں کے دستور کے مطابق کسی کو بھیا اور بھائی جان نہیں کہتی۔ ہم کزن ہیں، ایک دوسرے کا نام لیتے ہیں۔ اسی طرح میں تمہارا بھی نام لیا کروں گی۔ مائنڈ نہ کرنا۔ میں بہت اسٹریٹ فارورڈ ہوں۔''

خواہش گم صم کھڑی ہوئی تھی۔ جیسے سکتے کے عالم میں ہو۔ اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ نہیں بڑھایا۔ عمار نے آگے بڑھ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔''کہاں گم ہو؟ دیکھو رابی تم سے ہاتھ ملانا چاہتی ہے۔''

خواہش نے سر اٹھا کر اپنے میاں کو شکایت بھری نظروں سے دیکھا۔ وہ جھینپ کر بولا۔

''رابی! تم میری خواہش کے احساسات اور جذبات کو نہیں سمجھتی ہو۔ تم بھی مائنڈ نہ کرنا، یہ بھی اسٹریٹ فارورڈ ہے۔ جو بات ہو، وہ منہ پر کہہ دیتی ہے۔ کہہ نہیں پاتی تو اظہار کر دیتی ہے۔ یہ تم سے ہاتھ نہیں ملائے گی۔''

رابی نے حیرانی سے پوچھا۔''ایسی کیا بات ہوگئی ہے؟''

''تمہارے لیے کوئی بات نہیں ہے لیکن جو حق صرف خواہش کو ملنا چاہیے۔ اس حق کو تم یہاں آتے ہی چھیننے کی کوشش کر رہی ہو۔ آئندہ مجھ سے دور رہا کرنا۔''

وہ بولی۔''عمار! کیا تم میری انسلٹ نہیں کر رہے ہو؟''

''نہیں۔ میں تمہیں یہاں کے آداب سکھا رہا ہوں۔''

''تمہاری بچپن کی یہ عادت نہیں گئی ہے۔ تم شروع سے ہی بہت لڑاکا ہو۔ ملتے ہی جھگڑا شروع کر دیا۔''

''اور تمہاری بھی عادت نہیں گئی۔ جھگڑا خود شروع کرتی ہو اور الزام مجھے دیتی ہو۔ اب چلو یہاں سے۔''

وہ خواہش اور رابی کے درمیان چلتا ہوا ایئرپورٹ کی عمارت سے باہر آ گیا۔ رابی نے

اس کی کار کو دیکھ کر خوش ہوتے ہوئے کہا۔ ''اوہو...... یہ تو بالکل نئے ماڈل کی کار ہے؟ کب لی......؟''

وہ اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر اگلی سیٹ کا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔ خواہش نے عمار کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ اس کے خاموش اعتراض کو سمجھ گیا۔ وہ کھڑکی پر جھک کر بولا۔ ''رابی! میں نے دستور کے مطابق تمہارے لیے دروازہ نہیں کھولا اور تم بیٹھ گئیں؟ باہر آؤ۔ میں مہمان کے لیے دروازہ کھولنے کی رسم ادا کرنا چاہتا ہوں۔''

وہ خوش ہو کر باہر آئی اور دروازے کو بند کر کے کھڑی ہو گئی۔ عمار نے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ ''آؤ...... بیٹھو......''

اچانک ہی رابی کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ وہ اپنی انسلٹ محسوس کر رہی تھی۔ اس نے خواہش کی طرف دیکھا پھر عمار سے کہا۔ ''تم بچپن ہی سے مکار ہو۔ کیا سیدھی طرح سے نہیں کہہ سکتے تھے کہ مجھے پچھلی سیٹ پر بیٹھنا چاہیے۔''

کیا تمہارے پاس اتنی سی عقل نہیں ہے؟ کہ میرے ساتھ صرف میری وائف بیٹھ سکتی ہے۔ اس کی موجودگی میں کسی اور کو میرے ساتھ بیٹھنے کا حق نہیں پہنچتا۔''

خواہش دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھی۔ اسے اپنا حق جتانے یا منوانے کی ضرورت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ کیونکہ اس کے کچھ بولنے سے پہلے ہی عمار اس کی حمایت کرنے لگتا تھا۔ وہ خوش ہو کر سوچنے لگی۔ ''یہ سارا کمال اس وظیفے کا ہے۔''

رابی پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر دروازے کو زور سے بند کرتے ہوئے بولی۔ ''گھر چلو۔ میں آنٹی سے شکایتیں کروں گی۔''

خواہش کو رابی کے رویے سے جس قدر مایوسی ہوئی تھی، اسی قدر عمار کا رویہ اس کے دل میں اعتماد پیدا کر رہا تھا۔ اس کا سر فخر سے تن گیا تھا۔ وہ بڑے فاتحانہ انداز میں اپنے میاں کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھ کر گھر پہنچی۔ وہاں بڑے شکوے شکایتیں ہوئیں۔ اب اسے کسی کی پرواہ نہیں تھی۔ اگرچہ ساس نے دبی زبان سے رابی کی حمایت کی۔ اسے سمجھایا بھی کہ یہاں کے طور طریقے الگ ہیں۔ اس لیے اسے محتاط رہنا چاہیے پھر خواہش کو بھی سمجھایا کہ وہ چند دنوں کے لیے آئی ہے۔ اس کی بے باکی اور زندہ دلی کو نظر انداز کرنا چاہیے۔ وہ ایسے ماحول کی پروردہ ہے۔ جہاں بے باکی کو برا نہیں سمجھا جاتا۔ ورنہ وہ دل کی بری نہیں ہے۔

ادھر سے اماں نے سمجھایا۔ ''بیٹی! ساس کی باتوں میں نہ آنا۔ جب تک سات سمندر پار سے آنے والی واپس نہ جائے اس وقت تک داماد جی کے سر پر سوار رہنا۔ میں یہاں صبح شام

آنگن میں کھڑی ہو کر آسمان کی طرف منہ کر کے وظیفے پڑھتی رہتی ہوں اور پھر ٹھیک تیرے گھر کی طرف اور داماد جی کے آفس کی طرف پھونکیں مارتی رہتی ہوں۔''

''اماں! ایک تمہارا ہی دم دلا سا ہے کہ کوئی میرے سر کا آنچل نہیں کھینچ سکتی۔ میں اچھی طرح سمجھ رہی ہوں، یہ تمہارے وظیفوں کا ہی نتیجہ ہے کہ عمار رابی کے منہ پر میری حمایت کرتے ہیں اور اس کے مقابلے میں ہمیشہ مجھے ہی اہمیت دیتے ہیں۔''

''داماد جی ہمیشہ اسی طرح تجھے اہمیت دیتے رہیں گے لیکن تجھے ایک احتیاط کرنی ہوگی۔ کبھی داماد جی کو اس کلموہی کے ساتھ تنہا نہ چھوڑنا۔''

اس کی ساس کی یہ بھرپور کوشش ہوتی تھی کہ وہ رابی کو اپنے ساتھ گھمانے پھرانے لے جایا کرے مگر وہ اب اپنے گھر اور اپنے پوتے کی دیکھ بھال کو زیادہ اہمیت دینے لگی تھی۔ اس نے سوشل ورکنگ کو بھی پوتے کی آمد کے بعد گڈ بائے کہہ دیا تھا۔

وہ کبھی کبھی عمار سے کہتی تھی کہ رابی جہاں جانا چاہتی ہے اسے لے جاؤ۔ ایسے وقت عمار خود ہی خواہش سے کہتا تھا کہ اسے بھی ساتھ چلنا ہوگا۔ ورنہ وہ تنہا رابی کے ساتھ نہیں جائے گا۔

اس کی یہ باتیں یقین دلاتی تھیں کہ اماں کے وظیفے کام دکھا رہے ہیں۔

ایک روز رابی نے ضد کی۔ ''میں مکلی کا قبرستان دیکھنے جاؤں گی۔ سنا ہے، وہ ایشیا کا سب سے بڑا قبرستان ہے۔''

وہ اپنے پاس ایک منی ویڈیو کیمرہ رکھتی تھی اور جہاں جاتی تھی۔ اس جگہ کی ویڈیو فلم بناتی رہتی تھی۔ اس نے اپنی آنٹی سے کہا۔ ''آپ بھی ساتھ چلیں۔ بڑا مزہ آئے گا۔''

مگر پوتے کی طبیعت کچھ خراب تھی۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ اسے ٹھنڈ سے بچایا جائے۔ وہ بولی۔ ''بیٹی! میں اپنے پوتے کو اس حال میں چھوڑ کر نہیں جاسکوں گی پھر کسی دن چلیں گے۔''

وہ بولی۔ ''آپ جانتی ہیں کہ پرسوں لیڈی ڈاکٹر سے میرا اپائنٹ منٹ ہے۔ شاید وہ لمبے عرصے تک ٹریٹمنٹ کے لیے بولیں گی پھر تو میں باہر نہیں نکل سکوں گی۔''

''تو پھر عمار اور خواہش کے ساتھ چلی جاؤ۔''

خواہش نے کہا۔ ''ممی! میرا بچہ بیمار ہے۔ آپ اپنے پوتے کو چھوڑ کر نہیں جاسکتیں پھر میں اپنے بیٹے کو کیسے چھوڑ کر جا سکتی ہوں؟ یوں بھی آپ تنہا پریشان ہو جائیں گی۔ گھر بار دیکھیں گی یا پوتے کو سنبھالیں گی؟ میں ان حالات میں کہیں نہیں جاؤں گی۔''

عمار نے اسے تنہائی میں سمجھایا۔ ''خواہش! میں تمہیں دل و جان سے چاہتا ہوں۔ بھرپور محبتیں دیتا ہوں، ہر لمحہ تمہارا اعتماد قائم رکھنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔ پلیز...... میری

ایک بات مان لو، مجھے اس کے ساتھ ٹھٹھہ جانے دو۔ ہم صبح جائیں گے اور شام تک واپس آ جائیں گے۔ اندھیرا پھیلنے سے پہلے ہی یہاں پہنچ جائیں گے۔"

وہ بولی۔ "رابی اتنی ضد کیوں کر رہی ہے؟ مکلی قبرستان جانا کیا ضروری ہے؟ کیا وہ ایک ماہ بعد نہیں جا سکتی؟"

"سمجھنے کی کوشش کرو۔ جب میں تمہاری ہر بات مانتا ہوں، تمہارا تابعدار بن کر رہتا ہوں تو باہر سے آنے والی کے سامنے اب مجھے اتنا بھی نہ جھکاؤ کہ وہ مجھے غلام سمجھنے لگے۔ کیا تمہیں میری انسلٹ کرنا اچھا لگے گا؟"

"میں انسلٹ نہیں کر رہی ہوں، اپنے حقوق کے مطابق آپ کو اس کے ساتھ تنہا جانے سے روک رہی ہوں۔ آخر آپ مجھے اپنی بات منوانے کے لئے آج اس قدر مجبور کیوں کر رہے ہیں؟ جب سے وہ آئی ہے، تب سے آپ میری حمایت کرتے آئے ہیں، مجھے اہمیت دیتے ہیں پھر آج بے جا ضد کیوں کر رہے ہیں؟ وہ کچھ روز بعد بھی تو جا سکتی ہے۔"

"نہیں جا سکتی۔ اس کی کوئی مجبوری ہے۔ پرسوں وہ ڈاکٹر سے ملے گی۔ اس کے بعد وہ کہیں سیر و تفریح کے لیے شاید ایک قدم بھی گھر سے باہر نہ نکالے۔"

"کیا وہ بیمار ہے؟"

"ہاں...... وہ پریشان ہے۔ بیمار ہے۔ زیادہ سے زیادہ آؤٹنگ کرنا چاہتی ہے۔ اگر اس کے ساتھ مجبوری نہ ہوتی تو میں کبھی تمہارے بغیر اس کے ساتھ نہ جاتا۔ اپنی بات نہ منواتا۔"

وہ سوچنے کے انداز میں اسے دیکھنے لگی۔ وہ اس کے قریب آ کر بڑی محبت سے بولا۔ "تم ہمیشہ اپنی باتیں منواتی آئی ہو۔ آج پہلی بار میری ایک بات مان لو۔ اگر نہیں مان سکتیں تو پھر تم کیسے توقع کر سکتی ہو کہ آئندہ میں تمہاری ہر بات مانتا رہوں گا۔ عام طور پر عورتیں شوہر کی دس باتیں مانتی ہیں تب کہیں جا کر اپنی ایک بات منواتی ہیں لیکن میں تو تمہاری ہزار باتیں مانتا ہوں۔ آج ایک بات منوا رہا ہوں تو کیا تم نہیں مانو گی؟"

وہ الجھ گئی۔ اس کے اختیار میں ہوتا تو وہ ابھی ہامی بھر لیتی، اسے رابی کے ساتھ جانے کی اجازت دے دیتی۔ وہ بڑی محبت سے سمجھا رہا تھا۔ اس کی باتیں خواہش کے دل میں اُتر رہی تھیں مگر وہ اماں کی ہدایت سے مجبور تھی۔ ماں نے کہا تھا کہ اسے کبھی تنہا رابی کے ساتھ وقت گزارنے کا موقع نہیں دینا۔

وہ بیڈ کے سرے پر بیٹھ گئی پھر بولی۔ "پلیز مجھے کچھ دیر کے لیے تنہا چھوڑ دیں۔"

"ہاں...... میرا بھی یہی خیال ہے، شاید تنہائی میں تم میری محبتوں کو سمجھ سکو؟"

وہ اسے کمرے میں تنہا چھوڑ کر چلا گیا۔ ایسے وقت اسے عمار پر بے انتہا پیار آ رہا تھا۔ وہ اس کا مان کر رہا تھا، اس سے اجازت طلب کر رہا تھا۔ ورنہ عام شوہروں کی طرح وہ حاکم بھی بن سکتا تھا۔ اس کی اجازت کے بغیر اپنی من مانی کر سکتا تھا۔

اس نے اماں کے موبائل فون کے نمبر پنچ کیے پھر رابطہ ہونے پر کہا۔ ''اماں! بڑی مشکل ہو گئی ہے۔ چاروں طرف سے ایسی مجبوریاں آئی ہیں کہ مجھے تمہاری ہدایت کے خلاف عمل کرنا ہوگا۔''

اماں نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ''کیا بات ہو گئی میری بچی مجھے بتا۔ میرے پاس ہر پریشانی کا حل ہے۔''

وہ اسے بتانے لگی۔ وہ تمام صورتِ حال سننے کے بعد بولی۔ ''تیری باتوں سے اندازہ ہو رہا ہے کہ اگر اس بار داماد جی کو دبایا گیا، یا جبراً تُو نے ان سے اپنی بات منوائی تو وہ آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑیں گے۔ یوں بھی دن ہی دن کا تو معاملہ ہے۔ تُو بے فکر ہو کر انہیں جانے کی اجازت دے دے۔ باقی مجھ پر چھوڑ دے، میں اپنے تعویذوں کے ذریعے سب سنبھال لوں گی۔ ایسا عمل کروں گی کہ وہ رابی تو کیا کوئی مس یونیورس بھی داماد جی کا دل اپنی طرف مائل نہیں کروا سکے گی۔''

وہ دل ہی دل میں رضا مند تھی۔ صرف اماں کے اشارے کی دیر تھی۔ اس نے فوراً ہی عمار کو اجازت دے دی۔ وہ خوش ہو کر بولا۔ ''آئی لو یو خواہش! تم نے میری بات رکھ لی۔ اب رابی کے سامنے میرا سر اونچا ہو جائے گا۔ وہ طعنے دیتی ہے کہ میں تمہارا غلام ہوں لیکن میں کہتا ہوں، یہ غلامی نہیں ہے، شوہر کی وفاداری اور محبت ہے۔ اسے غلط نام نہ دو۔''

دوسری صبح وہ رابی کے ساتھ کار میں بیٹھ کر روانہ ہوتے ہوئے بولا۔ ''اطمینان رکھو۔ ہم شام سے پہلے واپس آ جائیں گے۔''

وہ دونوں روانہ ہو گئے۔ خواہش پچھلے کئی دنوں سے محسوس کر رہی تھی کہ رابی پہلے کی طرح زندہ دل نہیں رہی ہے۔ اس کی شوخی اچانک ختم ہو گئی تھی اور وہ بہت سنجیدہ دکھائی دینے لگی تھی۔

ان دونوں کے جانے کے بعد ساس نے کہا۔ ''بیٹی! رابی دل کی بہت اچھی ہے۔ تم اس پر کسی طرح کا شبہ نہ کرنا۔ وہ اوپر سے جتنی خوش دکھائی دیتی ہے۔ اندر سے اتنی ہی پریشان ہے۔''

اس نے پوچھا۔ ''ممی! اسے کیا پریشانی ہے؟ وہ ڈاکٹر کے ٹریٹ منٹ کی بھی بات کر رہی تھی۔''

''ہاں۔ کل اس کی میڈیکل رپورٹس ملنے والی ہیں۔ ان کے بعد ہی فیصلہ کیا جائے گا کہ اس کا آپریشن لازمی ہے یا نہیں......؟''

خواہش نے ایک دم سے چونک کر ساس کو دیکھا پھر پوچھا۔ ''آپریشن......؟ کس سلسلے میں......؟''

ساس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا پھر نظریں جھکا کر کہا۔ ''ہاں......لیکن کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہو سکتا ہے آپریشن کی نوبت ہی نہ آئے۔''

''آخر بات کیا ہے؟''

''بیٹی! اس کا معاملہ اسی پر چھوڑ دو۔ ویسے کوئی خاص بات نہیں ہے۔ لو! اپنے بیٹے کو سنبھالو۔ میں ذرا کچن کی طرف جا رہی ہوں۔ اس کے لیے منقوں کا پانی بنا کر لاتی ہوں۔''

وہ کچن کی طرف چلی گئی اور وہ اپنے بیٹے کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ اسے گود میں لے کر مسکرانے لگی۔ اسے چومنے لگی۔ ایسا لگ رہا تھا، جیسے عمار ننھا سا ہو گیا ہو اور اس کے دونوں بازوؤں میں سما گیا ہو۔ اس کی دھڑکنوں سے لگ رہا ہو، مسکرا رہا ہو۔ وہ بچہ ہاتھ پاؤں ہلا رہا تھا، ماں کی گود کی حرارت محسوس کر کے خوش ہو رہا تھا۔

وہ تھوڑی دیر تک بہلتی رہی لیکن اس کا دھیان بار بار عمار اور رابی کی طرف بھٹکتا رہا۔ دل میں طرح طرح کے خیالات آ رہے تھے۔ ایک طرف ماں کی باتیں ڈھارس بندھا رہی تھیں کہ وہ ایسا عمل کرے گی کہ رابی تو کیا کوئی مس یونیورس بھی عمار کو اپنی طرف مائل نہیں کر سکے گی۔

لیکن دوسری طرف یہ سوچ ہلکان کر رہی تھی کہ نہ جانے رابی عمار سے کیسی کیسی باتیں کرے گی؟ کیسی ادائیں دکھائے گی؟ انہیں اپنی طرف مائل کرنے کے نہ جانے کون سے ہتھکنڈے استعمال کرے گی؟

وہ کافی دیر تک ایسے دوغلے خیالات میں الجھی رہی۔ صبر کرتی رہی، آخر صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اس نے عمار کے موبائل پر رابطہ کیا۔ دوسری طرف سے اس نے کہا۔ ''ہیلو......میں تمہارے فون کا انتظار کر رہا تھا۔ یہ سمجھ رہا تھا کہ تم میری طرف سے فکر مند ہو گی۔''

''کیا مجھے فکر نہیں کرنی چاہیے؟''

''بھئی کیسی فکر؟ ابھی جا رہے ہیں، شام تک لوٹ آئیں گے۔''

''ابھی آپ کہاں ہیں؟''

''یوں سمجھو کراچی شہر سے باہر نکل آئے ہیں۔ چوکھنڈی کے قبرستان سے آگے نکل رہے ہیں۔ ڈرائیونگ کرتے وقت فون پر طویل گفتگو نہیں کرنی چاہیے۔ یہ تم ہی کہا کرتی ہو ناں؟''

''ہاں......میں فون بند کر رہی ہوں۔ آدھے گھنٹے بعد رابطہ کروں گی۔''

''آدھے گھنٹے بعد نہیں ایک گھنٹے بعد رابطہ کرنا......''

رابطہ ختم ہو گیا۔ اسے ذرا اطمینان ہوا کہ اس نے عمار پر ایک گھنٹے بعد رابطہ کرنے کی پابندی عائد کر دی ہے۔ اب وہ اس کی معلومات کی حد میں رہے گا۔ کہیں ادھر اُدھر نہیں ہو سکے گا لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ شوہر کو اپنی انگلی پکڑ کر چلاؤ تو وہ چلنے لگے۔ کبھی کبھی ایسے حالات پیش آتے ہیں کہ انگلی ہاتھ سے چھوٹ جاتی ہے۔

جب اس نے ایک گھنٹے بعد رابطہ کیا تو عمار کی دھیمی دھیمی سی آواز سنائی دی۔ جبکہ وہ ادھر سے چیخ چیخ کر بول رہا تھا۔ ''خواہش! بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ اس موبائل فون کی بیٹری ڈاؤن ہو رہی ہے اور میں اس کا چارجر گھر میں بھول آیا ہوں۔ ٹھٹھہ شہر پہنچ کر کسی پی سی او سے فون کروں گا۔''

وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر اچانک رابطہ ختم ہو گیا۔ اس کا دل ڈوبنے لگا۔ یہ عجیب رکاوٹ پیدا ہو گئی تھی۔ جب تک وہ گھر واپس نہ آتا اس وقت تک اس سے اپنی مرضی کے مطابق باتیں نہیں ہو سکتی تھیں۔ وہ کسی پی سی او کا محتاج ہو کر رہ گیا تھا۔

دوپہر ایک بجے اس نے فون پر اسے مخاطب کیا۔ ''خواہش! ہم ٹھٹھہ پہنچ گئے ہیں۔ تم خیریت سے ہو؟ ہمارا منا کیسا ہے؟ ممی کیا کر رہی ہیں؟''

''ہم سب خیریت سے ہیں، آپ جلدی واپس آئیں۔''

''ابھی تو ہم ٹھٹھہ پہنچے ہیں۔ میں نے جو وعدہ کیا ہے، اس کے مطابق میں اندھیرا ہونے سے پہلے ہی تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔''

''ٹھیک ہے ..... مگر آپ ہر ایک گھنٹے بعد مجھ سے رابطہ کرتے رہیں۔''

''یہ کراچی جیسا شہر نہیں ہے۔ یہاں ہر جگہ پی سی او نہیں ہیں پھر بھی کوشش کروں گا۔''

رابطہ ختم ہو گیا۔ وہ انتظار کرنے لگی۔ دو گھنٹے گزر گئے پھر تین گھنٹے گزر گئے۔ چار بج گئے پھر پانچ بج گئے۔ اس نے کوئی فون نہیں کیا۔ وہ پریشان ہو کر کبھی بیڈ روم میں جاتی تھی کبھی ڈرائنگ روم میں آتی تھی، کبھی ساس سے کہتی تھی۔ ''دیکھیں! آپ کے صاحب زادے کتنے لاپرواہ ہیں؟ پانچ بج گئے ہیں۔ وہ نہ فون کر رہے ہیں، نہ واپس آ رہے ہیں۔''

''شاید وہ واپس آ رہا ہوگا۔ اس لیے فون نہیں کر رہا ہے۔''

وقت گزرتا جا رہا تھا مگر عمار کی طرف سے کوئی خبر نہیں مل رہی تھی۔ اس دوران میں خواہش نے اماں سے بھی رابطہ کیا تھا۔ وہ اسے تسلیاں دیتی رہی تھی لیکن دبے لفظوں میں پریشانی بھی ظاہر کرتی رہی تھی۔

خواہش کا دل ہولنے لگا تھا۔ شام کے سات بج چکے تھے۔ ساس صاحبہ کو بھی فکر لاحق

ہوئی۔ وہ دونوں پریشان ہوکر بالکونی میں آ کر کھڑی ہوگئیں۔ اندھیرا پھیل چکا تھا اور وہ اندھیرا ہونے سے پہلے آنے کا وعدہ کر کے جانے والا اب تک لوٹ کر نہیں آیا تھا۔

رات کے آٹھ بجے فون کی گھنٹی سنائی دی۔خواہش نے لپک کر ریسیور اٹھایا۔اسے کان سے لگایا تو دوسری طرف سے عمار کی آواز سنائی دی۔ وہ ایک دم سے برسنے لگی۔آنسو بہاتے ہوئے بولی۔ ''کہاں ہیں آپ...... کیوں میرا خون خشک کر رہے ہیں؟ آپ تو اندھیرا ہونے سے پہلے یہاں آنے والے تھے؟ کہاں گیا آپ کا وعدہ......؟ آپ کو کچھ اندازہ ہے کہ یہاں ممی اور میں کس قدر پریشان ہو رہی ہیں؟ آپ کم از کم ایک فون کال تو کہیں سے کر دیتے؟''

وہ دوسری طرف سے بولا۔ ''پلیز خواہش! گرجنے برسنے سے پہلے یہ تو سن لو کہ ہم کن حالات سے گزر رہے ہیں؟''

''کن حالات سے گزر رہے ہیں؟ کیا قیامت آ گئی ہے؟''

''ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے۔ایک ٹرک والے نے میری کار کو ٹکر ماری ہے۔ میں اس وقت ایک پی سی او سے تمہیں فون کر رہا ہوں۔''

وہ ایک دم سے پریشان ہوکر ساس کو دیکھنے لگی پھر ذرا سنبھل کر بولی۔ ''اگر آپ پی سی او سے بات کر رہے ہیں تو پھر یقیناً خیریت سے ہوں گے پھر یہاں کیوں نہیں آ رہے ہیں؟ اب مجھے گھبراہٹ ہو رہی ہے۔ پلیز...... جلدی آنے کی کوشش کریں۔''

ساس اس سے پوچھ رہی تھی کہ کیا بات ہوگئی؟ وہ کیوں اس قدر پریشان ہو رہی ہے؟ وہ اسے بتانے لگی۔ ساس نے پوری بات بھی نہیں سنی، ریسیور اس کے ہاتھ سے لے کر روتے ہوئے رانی کا اور بیٹے کا حال پوچھنے لگی۔ کچھ دیر بعد اس نے ریسیور خواہش کی طرف بڑھا دیا۔

وہ اسے کان سے لگا کر بولی۔ ''پھر آپ کب آ رہے ہیں؟ پلیز...... جلدی آ جائیں۔ ہم دونوں بہت پریشان ہو رہے ہیں۔''

وہ بولا۔ ''میں بھی یہاں بہت پریشان ہوں۔ جلدی کیسے آؤں؟ میری تیس لاکھ کی گاڑی ہے۔ٹکر کی وجہ سے خراب ہوگئی ہے۔ تھانے والوں نے ٹرک ڈرائیور کو پکڑ رکھا ہے۔ ٹرک کا مالک آئے گا۔اس سے ہرجانہ وصول کیا جائے گا۔تب ہی میں آؤں گا۔''

''آخر کتنی دیر لگے گی؟''

''پولیس اور تھانے کے چکر میں صبح بھی ہوسکتی ہے۔ یہ میرے اختیار میں تو نہیں ہے۔ ٹرک کا مالک آ کر ہرجانہ ادا کرے گا۔ گاڑی کی مرمت ہوگی۔ تب ہی تو میں گاڑی ڈرائیو کر

ے آ سکوں گا۔''

وہ پریشان ہو کر کچھ سوچنے لگی پھر بولی۔ ''اچھا...... مگر آپ پلیز آدھے آدھے گھنٹے بعد فون کرتے رہیں۔ مجھے بتاتے رہیں کہ وہاں کیا ہو رہا ہے؟''

''میں تمہاری پریشانی کو سمجھ رہا ہوں لیکن جان! یہ بھی تو سوچو کہ وہاں معاملات نمٹاؤں گا یا ہر آدھے گھنٹے بعد تمہیں فون کرنے پی سی او آؤں گا۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ مجھے جیسے جیسے موقع ملے گا۔ میں فون کرتا رہوں گا۔''

رابطہ ختم ہو گیا۔ اس کی پریشانیاں بڑھ گئیں۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ حالات یوں اچانک بدل جائیں گے۔ عمار اتنی دیر کے لیے اس سے دور ہو جائے گا۔

ساس اپنے کمرے میں جا کر جائے نماز پر بیٹھ گئی۔ بیٹے اور بھانجی کی خیریت کے لیے دعائیں مانگنے لگی۔ خواہش کو بھی یہی کرنا چاہیے تھا لیکن اس کے دل میں کھد بد ہو رہی تھی اور اندر ہی اندر یہ آگ بھڑک رہی تھی کہ رابی اتنی رات کو عمار کے ساتھ ہے۔ نہ جانے وہ کہاں اور کیسے وقت گزار رہے ہوں گے۔

جیسے جیسے رات گزر رہی تھی، ویسے ویسے اندیشے ابھر رہے تھے۔ وہ سوچنے لگی۔ ''انہوں نے کھانا کسی ہوٹل میں کھایا ہوگا۔ کیا رات بھی کسی ہوٹل میں گزاریں گے؟''

یہ ایسا سوال تھا جو خواہش کو پاؤں کے تلوے سے لے کر سر کی چوٹی تک سلگا رہا تھا۔ وہ تڑپ کر ساس کے کمرے میں آئی پھر بولی۔ ''ممی! میں ابھی وہاں جاؤں گی۔''

ساس نے حیرت سے پوچھا۔ ''کہاں جاؤ گی؟''

''ٹھٹھہ جاؤں گی۔ وہ پریشان ہو رہے ہوں گے۔ ایسے وقت مجھے ان کے ساتھ رہنا چاہیے۔''

''پاگل ہوئی ہو۔ اتنی رات کو وہاں جاؤ گی پتا نہیں وہ جگہ یہاں سے کتنی دور ہے؟''

''میں تنہا نہیں رہوں گی۔ میرے ساتھ ڈرائیور اور چوکیدار ہوگا۔''

''نہیں۔ میں تمہیں اتنی رات کو کہیں جانے کی اجازت نہیں دوں گی۔ عمار اور رابی بچے نہیں ہیں۔''

وہ مجبور ہو کر عمار کے فون کا انتظار کرنے لگی۔ اس نے اماں سے رابطہ کرنا چاہا مگر پھر سوچنے لگی کہ پہلے عمار کی کوئی خیر خبر مل جائے پھر ماں سے باتیں کرے گی۔ اس نے ابھی تک اماں کو یہ بھی نہیں بتایا کہ عمار کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ دل ایسا پریشان تھا کہ بس میاں صاحب کی واپسی چاہتا تھا۔ یوں بھی اماں وظیفہ پڑھ رہی تھی۔

وہ فون کے قریب ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ تقریباً ایک بجے اس کا فون آیا۔ وہ بولا۔ ''ٹرک کے مالک سے سمجھوتا ہو گیا ہے۔ اس نے ہرجانہ ادا کر دیا ہے۔ اب گاڑی مرمت کے لیے گیراج میں گئی ہے۔ اتنی رات کو اس گیراج میں کوئی کاریگر نہیں ہے۔ اس لیے صبح ہی اس کی مرمت ہو سکے گی۔''

''تو پھر آپ رات کہاں گزاریں گے؟''

''یہاں قریب ہی ایک ہوٹل ہے۔ رات وہیں گزارنی ہو گی۔''

اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس نے تڑخ کر پوچھا۔ ''کیا آپ رابی کے ساتھ ہوٹل کے کمرے میں رات گزاریں گے؟''

''خواہش! میں اتنا نادان نہیں ہوں۔ میں نے اپنے لیے دوسرا کمرا لیا ہے۔ کیا تم مجھ پر اعتماد کرو گی؟''

وہ روہانسی ہو کر بولی۔ ''اعتماد تو کرنا ہی ہو گا۔''

''مجھے تم سے یہی امید تھی۔ میری بھرپور کوشش ہو گی کہ جلد از جلد کل گاڑی کی مرمت ہو جائے اور میں تمہارے پاس پہنچ جاؤں۔ منے کو میری طرف سے پیار کرنا۔ ممی کو تسلی دے دو۔ یہاں سب خیریت ہے۔''

اس نے فون بند کر دیا۔ وہاں سب خیریت تھی مگر یہاں پریشانی شروع ہو گئی تھی۔ اس نے ساس کو جا کر اطلاع دی۔ وہ بھی مطمئن ہو گئی۔ ایک وہی رہ گئی تھی جس کا سکون غارت ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے کمرے میں آ کر فوراً ہی اماں سے رابطہ کیا۔ اسے عمار کے تمام حالات بتائے پھر کہا۔ ''اماں! کچھ کرو...... وہ رابی اپنے مقصد میں کامیاب ہو رہی ہے۔ حالات بھی اس کا ساتھ دے رہے ہیں۔ میرے اندر تو یہ سوچ سوچ کر ہول اٹھ رہا ہے کہ وہ کم بخت ایک ہوٹل میں عمار کے ساتھ رات گزارے گی۔ میں کیا یہاں سے دیکھ رہی ہوں کہ وہ دو الگ کمروں میں ہیں یا ایک ہی کمرے میں ہیں؟''

اماں نے کہا۔ ''تو فکر کیوں کرتی ہے میں ابھی دوسرا وظیفہ شروع کرتی ہوں۔ اگر وہ ایک کمرے میں ہوں گے تو اس کا کمرا الگ ہو جائے گا۔ اس کی نیند اڑ جائے گی، وہ صبح تک سو نہیں سکے گی، کروٹیں ہی بدلتی رہ جائے گی۔''

''اماں! کیا غضب کرتی ہو؟ وہ صبح تک جاگتی رہے گی تو عمار کے پیچھے پڑی رہے گی۔ اسے جلدی سے دوسرے کمرے میں لے جا کر سلا دو۔''

''تو یوں بول ناں۔ میں ابھی نیند والا وظیفہ شروع کرتی ہوں۔ تو مجھے اس کے خلاف

آنچھ کرنے نہیں دیتی۔ ورنہ میں تو ایسا عمل کرتی کہ وہ وہاں سے زندہ واپس نہیں آتی۔"

"نہیں اماں! میں کسی کی جان کی دشمن نہیں ہوں۔ خدا کے لیے ایسا کوئی عمل نہ کرنا۔ بس میرے عمار کو کورے کاغذ کی طرح واپس لے آؤ۔"

"تو پریشان نہ ہو۔ میں نے ابھی ایک وظیفہ ختم کیا ہے۔ اب دوسرا شروع کر دوں گی۔ دونوں اپنا اپنا اثر دکھائیں گے۔"

اس نے رابطہ ختم کر دیا۔ اماں سے بات کر کے دل ذرا سنبھل گیا تھا۔ دوسرے دن عمار واپس آیا۔ خواہش گھور گھور کر ان دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ جیسے ان کے حلیے سے پچھلی رات کی ایک ایک بات پوچھ رہی ہو۔ وہ بھری بیٹھی تھی۔ وہ بیڈ روم میں آ کر تمام حالات اور مجبوریاں بتانے لگا۔

وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔ "حالات نے کیا مجبور کیا؟ پہلے موبائل فون بیکار ہو گیا پھر گاڑی بیکار ہو گئی۔ پھر تم نے اور پولیس کے چکر میں الجھ گئے۔ کیا پولیس والوں نے آپ سے یہ نہیں پوچھا کہ آپ ایک لڑکی کے ساتھ ہوٹل میں رات کیوں گزار رہے ہیں۔"

وہ ذرا تیز لہجے میں بولا۔ "میں تم سے بحث نہیں کروں گا۔ صرف اتنا کہوں گا، مجھ پر بھروسا کر سکتی ہو تو کرو۔ میں تمہارا ہوں، تمہارا ہی رہوں گا۔ میں نے رابی کو ہاتھ تک نہیں لگایا ہے پلیز جاہل عورتوں کی طرح لڑائی جھگڑا نہ کرو۔ اگر دل صاف نہیں ہوا ہے تو بیڈ روم سے چلی جاؤ۔ جب اندر کا غبار نکل جائے تو چلی آنا۔"

وہ فریش ہونے کے لیے واش روم میں چلا گیا۔ وہ ایک صوفے پر بیٹھ کر رونے لگی۔ اگر وہ جھگڑا کرتی اور بات بڑھاتی تو وہاں اس کی حمایت میں بولنے والا کوئی نہیں تھا۔ سب عمار کی مجبوری کو سمجھتے، اسی کی حمایت کرتے۔

اس نے پھر عمار سے جھگڑا نہیں کیا...... لیکن منہ پھلا کر رہی۔ ایک دن گزر گیا۔ دوسرا دن گزر گیا۔ آخر وہ کب تک ناراض رہتی؟ اس نے آہستہ آہستہ سمجھوتا کر لیا کہ وہ موجودہ حالات میں عمار پر بھروسا کرے گی اور اب جھگڑا نہیں کرے گی۔

ایک روز وہ ڈرائننگ روم سے نکل کر کوریڈور سے گزرتی ہوئی اپنے بیڈ روم کی طرف آ رہی تھی کہ رابی کے کمرے کے سامنے گزرتے ہوئے ٹھٹک گئی۔ کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور وہاں سے رابی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ ریسیور کان سے لگائے باتیں کر رہی تھی۔ کہہ رہی تھی۔ "نہیں عمار! میں اس بچے کو ضرور جنم دوں گی۔ تم نے وعدہ کیا تھا، اگر کوئی بات نہ بن سکی اور بچے کو جنم دینا پڑا اس آنے والے بچے کو تمہارا ہی نام ملے گا۔"

یہ ایسی بات تھی کہ خواہش کا سر چکرانے لگا۔ دل اتنی تیزی سے دھڑک رہا تھا جیسے حلق

میں آ کر اپنی دھڑکنوں سے اس کی سانسیں روک رہا ہو۔ عمار اس وقت آفس میں تھا اور رابی اس سے فون کے ذریعے بڑے اہم اور خفیہ معاملات طے کر رہی تھی۔

بات اتنی بڑھ چکی تھی کہ وہ عمار کے بچے کی ماں بننے والی تھی اور یہ اپنے بھولے پن سے یہی سمجھ رہی تھی کہ ان دونوں کے درمیان کوئی ناجائز تعلق نہیں ہے۔ جبکہ وہاں ایسے کسی تعلق کی انتہا ہو گئی تھی۔

وہ تیزی سے چلتی ہوئی اپنے کمرے میں آئی۔ ادھر سے اُدھر ٹہلنے لگی۔ سوچنے لگی کہ کیا کرنا چاہیے؟ کیا عمار سے شکایت کرنی چاہیے؟ لیکن کیا شکایت کرنے سے شوہر راہِ راست پر آ جاتے ہیں؟ وہ تو اور ضدی ہو جاتے ہیں۔ راز کھل جاتا ہے تو ڈنکے کی چوٹ پر کہتے ہیں کہ سوکن لے آئیں گے۔

اس کا ذہن کام نہیں کر رہا تھا۔ بس اماں یاد آ رہی تھی۔ اس نے اسی وقت ڈرائیور کو بلایا اور گاڑی میں بیٹھ کر اماں کے پاس پہنچ گئی۔ جب اماں نے سنا کہ داماد جی چور [illegible] تے ایک بچے کے باپ بن رہے ہیں تو وہ اپنا سینہ پیٹ کر بولی۔ ''ارے [illegible] یہ تو حد [illegible] پا [illegible] سر سے گزر چکا ہے آج وہ اس بچے کو اپنا نام دے کر اپنے گھر میں رکھیں گے اور کل اس کلم [illegible] کو اپنی بیوی بنا کر اس گھر میں لے آئیں گے۔ تُو ان کا کیا بگاڑ لے گی؟ تیری ساس بھی اپنے بیٹے کی حمایت کرے گی اور کوئی کسی مرد کو دوسری شادی سے نہیں روک سکتا۔''

''اماں! سوکن آنے سے پہلے میں اپنی جان دے دوں گی۔ بیٹی کی جان بچانا چاہتی ہو تو اس سوکن کو یہاں سے بھگا دو۔ میں پہلے منع کرتی تھی کہ اسے کوئی نقصان نہ پہنچاؤ لیکن اب کہتی ہوں، اسے مار ڈالو...... ختم کر دو......!''

یہ کہتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ماں نے اس کے آنسو پونچھ کر اسے تھپکتے ہوئے کہا۔ ''میری بچی! فکر نہ کر۔ رو رو کر ہلکان ہونے سے بات نہیں بنے گی۔ جب سے وہ انگریز کی اولاد یہاں آئی ہے، تب سے سوچ رہی ہوں کہ اسے کس طرح ہمیشہ کے لیے دور کر دوں؟ پھر میری سمجھ میں یہی بات آئی کہ اپنا مرد اپنے بس میں رہے اور اپنی عورت کا اُلو بنا رہے تو پھر کوئی دوسری عورت اسے اُلو نہیں بنا سکتی۔''

وہ روتے ہوئے بولی۔ ''میں تو انہیں اپنا دیوانہ بنائے رکھنا چاہتی ہوں۔ اب اگر اُلو بنا کر رکھنا پڑے گا تو میں اس کے لیے بھی راضی ہوں مگر کچھ تو کرو اماں!''

''میری بچی! میں بہت کچھ کر چکی ہوں۔ ایک بنگالی بابا سے اُلو کا گوشت لے کر آئی ہوں۔''

خواہش نے حیرانی سے پوچھا۔''اُلو کا گوشت؟''

''ہاں۔ یہ میرا آزمودہ نسخہ ہے۔ جوانی میں تیرا باپ مجھ پر سوکن لانے والا تھا۔ میں نے اُلو کا گوشت پیس کر اس کے کباب بنا کر اسے کھلائے تو وہ دن ہے اور آج کا دن ہے اس نے کبھی دوسری شادی کا نام بھی نہیں لیا۔ میرا تابعدار بنا رہا اور تم دیکھتی ہی ہو کہ وہ کیسے میرے آگے پیچھے گھومتا ہے؟''

اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔''کیا تم یہ چاہتی ہو کہ میں عمار کو بھی اُلو کا گوشت کھلاؤں؟''

''مجبوری ہے، کھلانا ہی ہوگا۔ نہیں تو پچھتائے گی۔ تُو پریشان کیوں ہو رہی ہے؟''

''اماں! سوچنے سے ہی عجیب لگتا ہے۔ وہ مجھے اس قدر چاہتے ہیں، مجھ پر بھروسا کرتے ہیں اور میں انہیں دھوکے سے اُلو کا گوشت کھلاؤں؟''

''اری اگر وہ تجھے چاہتے ہیں تو پھر کیوں ٹسوے بہا رہی ہے؟ کیوں یہاں آ کر فریاد کر رہی ہے؟ جا ان کی غلامی کر۔ وہ تیرے تو کبھی غلام نہیں بنیں گے۔ تجھ پر سوکن لے آئیں گے اور اس سوکن کی گود میں ان کا بچہ پہلے سے ہی موجود ہوگا۔''

اس کا دل ڈانواڈول ہو رہا تھا۔ وہ عمار کو کوئی ایسی چیز کھلانا نہیں چاہتی تھی جس سے کراہیت محسوس ہوتی ہو مگر سہاگ کی سلامتی کا مسئلہ تھا۔ وہ مجبور تھی۔ سوکن کو روکنا چاہتی تھی۔ وہ ہچکچاتی ہوئی بولی۔''اماں! تم جو کہو گی، میں وہ کروں گی۔ میں انہیں ضرور یہ گوشت کھلاؤں گی۔''

اماں جلدی سے اُٹھ کر فریزر میں سے ایک پلاسٹک کی چھوٹی سی تھیلی لے آئی۔ اس میں آدھا پاؤ کے قریب پسا ہوا گوشت تھا۔ اس نے کہا۔''میں ابھی اس میں بہترین مرچ مصالحہ لگاتی ہوں اور کباب بنا کر تجھے دیتی ہوں۔ انہیں لے جا کر داماد جی کو کھلا دے پھر تیل دیکھ اور تیل کی دھار دیکھ......''

وہ گوشت لے کر کچن کی طرف چلی گئی۔

☆======☆======☆

خواہش نے عمار کو یہ نہیں بتایا تھا کہ اس نے چھپ کر رالی کی فون والی گفتگو سن لی ہے۔ جب عمار اس سے چھپا رہا تھا تو وہ بھی یہ بات چھپانا چاہتی تھی۔ اسے اُلو کا گوشت کھلانے سے پہلے جھگڑا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ایسا کرنے سے بات بگڑ سکتی تھی۔ وہ ناراض ہو سکتا تھا اور پھر شاید گھر کا کھانا کھانے کے بجائے باہر کا کھانا کھانے جا سکتا تھا۔ وہ اس کی ناراضگی مول لے کر کوئی رسک نہیں لینا چاہتی تھی۔

شام کو عمار گھر آیا تو وہ اس کی گردن میں بانہیں ڈال کر بولی۔ ''آج میں نے آپ کی پسندیدہ ڈش تیار کی ہے۔''

وہ ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ممی اور رابی کہاں ہیں؟''

''وہ دونوں بیڈ روم میں ہیں۔ کہیں جانے کی تیاری کر رہی ہیں۔ آپ ان کی چھوڑیں۔ میری سنیں۔ میں نے کچھ کہا ہے۔''

ہاں بتاؤ کون سی ڈش تیار کی ہے؟''

وہ شوخی سے بولی۔ ''بتا دوں ؟ چلیں بتا ہی دیتی ہوں۔ آج میں نے آپ کے لیے شامی کباب بنائے ہیں۔ کھائیں گے تو میرے دیوانے ہو جائیں گے۔''

''یہ بات ہے تو پھر آج رات کا کھانا جلدی کھانا پڑے گا۔''

وہ عمار کو دیکھ رہی تھی۔ وہ اس کے ہاتھ کے بنے ہوئے شامی کباب کھانے کے لیے بے چینی ظاہر کر رہا تھا۔ ایسے وقت وہ اسے بہت معصوم لگ رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اس کی معصومیت کو اور اس کے اعتماد کو دھوکا دے رہی ہے۔

یکبارگی اس کا دل چاہا۔ وہ ان شامی کباب کو اٹھا کر گھر سے باہر پھینک دے لیکن پھر رابی کا چہرہ نگاہوں کے سامنے آ گیا۔ وہ عمار کے پہلو میں دلہن بنی بیٹھی ہوئی تھی اور ساس کی گود میں منے کے بجائے رابی کا بچہ کھیل رہا تھا۔

اس نے ایک دم سے جھرجھری لی۔ عمار نے پوچھا۔ ''کیا ہوا؟''

وہ اس سے نظریں چراتے ہوئے بولی۔ ''کچھ نہیں ...''

ایسے ہی وقت رابی اور اس کی ساس وہاں آ گئیں۔ ساس نے کہا۔ ''ہم جا رہے ہیں۔ بھابی جناب سے ملاقات ذرا طویل ہو جائے گی۔ ہمیں دیر ہو سکتی ہے۔ تم دونوں پریشان نہ ہونا۔ عمار! میں موبائل سے رابطہ کرتی رہوں گی۔''

خواہش تو چاہتی یہی تھی کہ اس کی چوری پکڑنے والا کوئی نہ ہو۔ اس نے ان دونوں کے جانے کے بعد ملازمہ کو بھی چھٹی دے دی۔

رات کے آٹھ بجے تو اس نے بچے کو سلانے کے بعد عمار سے پوچھا۔ ''کھانا گرم کروں؟''

وہ ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ چینل بدلتے ہوئے بولا۔ ''ہاں لیکن یہیں بیڈ روم میں ہی لے آؤ۔''

اس نے کچن میں آ کر شامی کباب فرائی کیے۔ سالن گرم کیا پھر ایک ٹرالی میں کھانے کی ڈشیں سجا کر اپنے بیڈ روم کی طرف آنے لگی۔ وہ ٹرالی کو دھکیلتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔

دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ وہ بار بار چور نظروں سے کباب کی پلیٹ کو دیکھ رہی تھی۔ ایک دل کہہ رہا تھا کہ وہ اچھا نہیں کر رہی ہے۔ ایک قابلِ اعتماد بیوی شوہر کو دھوکا نہیں دیتی مگر دوسرا دل کہہ رہا تھا کہ شوہر کو راہِ راست پر لانا بیوی کا حق ہے۔

وہ دھڑکتے دل کے ساتھ کھانے کی ٹرالی لے کر کمرے میں آئی۔ عمار واش روم میں تھا۔ وہ کھانے کے برتن سینٹر ٹیبل پر چننے لگی۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ عمار کے سامنے شامی کباب کی پلیٹ رکھی ہوئی تھی۔ خواہش چپ چپ سی تھی۔ شاید احساسِ جرم اندر سے کچوکے لگا رہا تھا۔ عمار نے ایک کباب اپنی پلیٹ میں رکھا پھر اس کا ایک نوالہ بنا کر کھانے لگا۔ ایسے ہی وقت خواہش نے اچانک اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس نے پوچھا۔ ''کیا ہوا؟''

وہ ایک دم سے چونک گئی۔ اپنی غلطی کا احساس کرتے ہوئے بات بنا کر بولی۔ ''آپ نے شاید بسم اللہ نہیں پڑھی ہے؟''

''تم بھی عجیب ہو۔ میں بسم اللہ اعلانیہ نہیں دل میں پڑھتا ہوں۔''

وہ مسکرا کر سر جھٹک کر کھانے لگا۔ خواہش چور نظروں سے اس کے ہر نوالے کو دیکھ رہی تھی۔ وہ بولا۔ ''کباب تو بہت مزے دار بنے ہیں۔ تم بھی کھاؤ ناں......''

عمار نے ایک کباب اٹھا کر اس کی پلیٹ میں رکھ دیا۔ وہ انکار کرتی رہی۔ وہ دوسرا کباب اٹھا کر اپنی پلیٹ میں رکھتے ہوئے بولا۔ ''کھاؤ کھاؤ...... ہر اچھی چیز شیئر کرنی چاہیے۔''

وہ مزے لے لے کر کھا رہا تھا۔ خواہش نے اپنی پلیٹ میں رکھے ہوئے کباب کو ناگواری سے ایک کنارے کر دیا اور سالن سے روٹی کھانے لگی عمار کی توجہ اس کی طرف نہیں تھی۔ وہ ٹی وی دیکھ رہا تھا اور بڑی لگن سے کھانا کھا رہا تھا۔ خواہش نے اپنی پلیٹ کا کباب اس کی پلیٹ میں رکھتے ہوئے کہا۔ ''دو کبابوں سے کیا ہوگا؟ یہ تیسرا بھی کھائیں۔ میں اپنے لیے اور فرائی کر لوں گی۔ مجھے تو یہ سن کر خوشی ہو رہی ہے کہ آپ کو میرے ہاتھ کے بنے ہوئے کباب بہت پسند آئے ہیں۔''

''تم کھا کر دیکھو۔ میں خواہ مخواہ تعریف نہیں کر رہا ہوں۔''

''نہیں...... آپ پیٹ بھر کر کھائیں۔ مجھے بھروسا ہے آپ کی تعریف جھوٹی نہیں ہے۔''

وہ تیسرے کباب کو بھی مزے لے لے کر کھانے لگا۔ خواہش کو نہیں معلوم تھا کہ اُلو کا گوشت اس قدر لذیذ ہوتا ہے یا پھر یہ اماں کے مصالحوں کا کمال تھا۔ جو بھی تھا، بہر حال وہ تینوں کباب میاں صاحب کے حلق سے اُتر گئے۔

اسی رات خواہش بڑے اطمینان سے گہری نیند سوتی رہی۔ اس نے خواب میں دیکھا کہ عمار سچ مچ اُلو بن گیا ہے اور ایک شاخ پر بیٹھا ہوا ہے، اسے پکار رہا ہے۔ وہ اس کے قریب جا کر پوچھتی ہے۔ ''بولیں کیا بات ہے؟''

وہ شکایت بھرے لہجے میں بولتا ہے۔ ''خواہش! یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔ تم نے مجھے اُلو بنا کر خود غرضی کی شاخ پر بٹھا دیا ہے۔ اب تم تمام عمر ایک اُلو کے ساتھ رہو گی۔ شوہر کے ساتھ نہیں رہ سکو گی۔ شوہر تو وہ ہوتا ہے جو بیوی سے بے وفائی نہیں کرتا۔ اگر وہ وفادار رہتا ہے تو اسے اُلو نہیں سمجھنا چاہیے۔''

وہ بولی۔ ''میں آپ کو کبھی اُلو نہیں سمجھوں گی پلیز۔ انسان کے روپ میں آ جائیں۔''

''کیسے آ جاؤں؟ تم نے تو اسی لیے مجھے اُلو کا گوشت کھلایا تھا کہ میں اُلو بن کر رہوں۔ لہٰذا بن چکا ہوں۔ اب تم ساری زندگی ایک باوقار محبت کرنے والے شوہر کو ڈھونڈتی رہو گی مگر تمہیں ایک اُلو ہی ملے گا۔''

اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے دیکھا۔ عمار بستر پر نہیں تھا۔ وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ واقعی اُلو بن کر اُڑ گیا ہے اور کہیں جا کر کسی شاخ پر بیٹھ گیا ہے۔

اس نے دیوار گیر گھڑی میں وقت دیکھا۔ صبح کے پانچ بج رہے تھے۔ اس نے بیڈ سے اُتر کر کمرے سے باہر آ کر دیکھا۔ وہ کومن روم میں تھا۔ مصلے پر کھڑا نماز پڑھ رہا تھا۔ اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر اطمینان کی سانس لی۔ اس کا عمار سچ مچ اُلو نہیں بنا تھا۔ انسان ہی تھا۔

اس نے نماز سے فارغ ہو کر اسے دیکھا پھر پوچھا۔ ''آج بڑی جلدی اٹھ گئیں؟ ویسے صبح خیزی اچھی ہوتی ہے۔ میرے ساتھ مارننگ واک کے لیے چلو گی؟'' وہ اسے آزمانا چاہتی تھی۔ اس نے کہا۔ ''اگر میں انکار کروں اور آپ کو بھی نہ جانے دوں تو آپ میری بات مانیں گے؟ واک پر جائیں گے یا نہیں؟''

''تم منع کرو گی تو نہیں جاؤں گا۔''

یہی اُلو ہونے کی دلیل تھی۔ مارننگ واک صحت کے لیے لازمی ہے۔ صبح کی تروتازہ ہوا میں گہری گہری سانس لینے سے پھیپھڑے مضبوط ہوتے ہیں لیکن وہ ان خوبیوں کو بھلا کر اس کی بات مان رہا تھا۔ ایسی بے وقوفی تو اُلو ہی کرتے ہیں۔

رابی صبح دس بجے پھر کہیں گئی تھی۔ دن کے دو بجے واپس آ کر بولی۔ ''میں آج رات کی فلائٹ سے واپس جا رہی ہوں۔''

خواہش کی ساس نے کہا۔ ''بیٹی! تمہیں اس حالت میں نہیں جانا چاہیے۔ اگر عمار سے

اختلافات ہو گئے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم واپس چلی جاؤ۔''

خواہش کو یہ سن کر خوشی ہوئی کہ عمار سے اس کے اختلافات ہو گئے ہیں۔اس کا مطلب یہ تھا کہ اُلو کا گوشت اپنا اثر دکھا رہا تھا۔عمار نے اپنے ہونے والے بچے کی پرواہ کیے بغیر اسے لندن جانے پر مجبور کر دیا تھا۔

جب وہ رات کو ایئر پورٹ گئی تو عمار اسے چھوڑنے بھی نہیں گیا۔اس کی ممی اسے رخصت کرنے کے لیے گئی تھی۔خواہش نے دل کی خوشی کو دباتے ہوئے پوچھا۔''آپ کیوں نہیں گئے؟''

وہ منہ پھیر کر بولا۔''اس کی بات نہ کرو۔اس نے مجھے بہت مایوس کیا ہے۔''

وہ رابی سے بیزاری ظاہر کر رہا تھا۔خواہش کے دل میں پھول کھل رہے تھے۔اُلو ڈال پر بیٹھا بول رہا تھا۔''میں سچ کہتا ہوں،ایک تم ہی ہو،جس نے مجھے کبھی کسی معاملے میں مایوس نہیں کیا۔تم ہمیشہ مجھے خوشیاں دیتی رہتی ہو۔''

وہ اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔''مجھے کچھ بتائیں تو سہی آخر ہوا کیا ہے؟''

وہ ذرا دیر چپ رہا،سوچتا رہا پھر بولا۔''میں نے اب تک یہ بات تمہیں نہیں بتائی تھی۔جسے صرف میں اور میری ممی جانتی ہیں۔ہم نے چاہا تھا کہ یہ راز راز ہی رہے لیکن وہ اپنی حماقتوں سے اسے ظاہر کر دے گی۔''

وہ مسکرا کر بولی۔''یعنی آپ اور آپ کی ممی یہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ ایک ناجائز بچے کی ماں کہلائے؟''

اس نے ایک دم سے چونک کر اسے دیکھا پھر پوچھا۔''تم......تم کیسے جانتی ہو؟''

وہ بدستور مسکراتے ہوئے بولی۔''وہ چاہتی تھی کہ بچے کا تعلق اس گھر سے ہے تو وہ اسی گھر میں رہے اور اس بچے کو باپ کے طور پر آپ کا نام ملتا رہے۔''

اس نے شدید حیرانی سے پوچھا۔''کیا تم نے چھپ کر اس کی باتیں سنی ہیں؟''

اس نے ہاں کے انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔''کل جب آپ دفتر میں تھے اور وہ یہاں سے فون پر بول رہی تھی تو اس کے کمرے کی کھلی ہوئی کھڑکی سے میں نے اس کی باتیں سنی تھیں۔تب ہی مجھے علم ہو گیا کہ ٹھٹھہ جانا تو ایک بہانا تھا۔وہاں نہ آپ کا موبائل بیکار ہوا تھا،نہ گاڑی خراب ہوئی تھی۔اس لڑکی نے آپ کو بہکایا۔آپ بہک گئے اور نتیجہ سامنے آ گیا۔وہ آپ کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔''

''یہ کیا بکواس کر رہی ہو؟''

''دیکھیں......اب آپ خواہ مخواہ غصہ نہ دکھائیں۔ یہ بات کھل کر سامنے آ گئی ہے۔ آپ گنہگار ہیں۔''

دوسرے ہی لمحے میں تڑاخ کی ایک زوردار آواز کے ساتھ اس کے منہ پر ایک طمانچہ پڑا۔ اس کا سر دوسری طرف گھوم گیا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ عمار کی آواز کانوں میں گونج رہی تھی۔ ''تمہیں ایسی بات زبان پر لاتے ہوئے شرم سے مرجانا چاہیے۔ جب میں دوسری تیسری شادی کر سکتا ہوں تو پھر گناہ کیوں کروں گا۔ تم مجھے...... مجھے گناہگار کہہ رہی ہو؟ کیا تم نے کبھی مجھے کسی دوسری عورت کی طرف مائل ہوتے دیکھا ہے؟''

وہ کیا جواب دیتی؟ اس نے زندگی میں پہلی بار اپنے شوہر کے ہاتھ سے مار کھائی تھی۔ سر گھوم گیا تھا۔ دل گھوم گیا تھا۔ وہ ایک طمانچہ کھا کر شرمندہ ہو رہی تھی مگر میاں صاحب پر مرمٹی تھی۔ کیا مرد ایسے ہوتے ہیں؟ کبھی سر پر بٹھاتے ہیں اور کبھی پاؤں کی جوتی کی طرح پہن لیتے ہیں، کبھی دن رات اس کے لیے محنت کرتے ہیں اور کبھی دن رات اس سے محنت کراتے ہیں۔ اس کے باوجود محبت اور دیوانگی جاری و ساری رہتی ہے۔ اس میں کوئی فرق نہیں آتا۔ محبت اور نفرت کا چکر چلتا رہتا ہے مگر محبت کرنے والے دیوانے چکراتے نہیں ہیں۔ مرد ایسے ہوتے ہیں۔ ہاں مرد ایسے ہوتے ہیں۔ اُلو ایسے نہیں ہوتے......

خواہش نے ان لمحات میں اس اہم نکتے پر غور نہیں کیا کہ جب وہ اُلو بن چکا ہے تو پھر اس نے ہاتھ کیسے اٹھایا؟ اُلو شوہروں کے تو ہاتھ نہیں ہوتے۔ صرف سر ہوتا ہے۔ وہ بھی بیوی کے سامنے جھکانے کے لیے۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''تم پڑھی لکھی جاہل ہو۔ ابھی چار دن پہلے میں رابی کے ساتھ ٹھٹھہ گیا تھا۔ میں نے اس کے ساتھ ایک رات گزاری۔ دو دن بعد تم نے اس کی زبان سے یہ سنا اس کے پاؤں بھاری ہیں۔ یعنی دو ہی دنوں میں ہم نے منہ بھی کالا کیا اور بچہ بھی پیدا کرنے لگے۔ لعنت ہے تمہاری عقل پر......!''

اس بات نے اسے چونکا دیا۔ اس نے حسد اور جلن میں یہ حساب ہی نہیں کیا تھا کہ صرف دو تین دنوں میں ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟

وہ کہہ رہا تھا۔ ''تم جیسی بے وقوف بیوی کو کھل کر بات سمجھانی ہوگی۔ رابی لندن میں کسی سے محبت کرتی ہے۔ اس کے ساتھ تعلقات اتنی دور تک پہنچ گئے کہ وہ حاملہ ہو گئی اور یہاں چلی آئی۔

وہاں اپنے ماں باپ اور جوان بھائیوں کو یہ نہیں بتا سکتی تھی کہ وہ کنواری ماں بننے والی ہے۔''

وہ اپنے گال کو سہلا رہی تھی اور اس کی باتیں سن رہی تھی۔ وہ بولا۔ ''رابی اپنے بچے کو ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس کا ہرجائی عاشق اسے یقین دلا رہا تھا کہ وہ اپنے کاروباری

حالات سنبھالنے کے فوراً بعد اس سے شادی کرے گا...... فی الحال بچے کو ضائع کر دیا جائے لیکن یہاں آ کر رابی کے خیالات بدل گئے۔ اس کے اندر ممتا حاوی ہونے لگی۔ وہ بچے کو ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔''

وہ ذرا ٹھہر کر بولا۔ ''یہاں لیڈی ڈاکٹر سے کنسلٹ کیا گیا۔ اس نے بتایا کہ وقت بہت گزر چکا ہے۔ اب آپریشن کے ذریعے ہی بچے سے نجات حاصل ہو سکے گی۔''

خواہش یہ باتیں سن رہی تھی اور اسے یاد آ رہا تھا اس کی ساس نے بھی کہا تھا کہ دوسرے دن میڈیکل رپورٹ ملنے والی ہے۔ شاید رابی کا آپریشن ہوگا لیکن انہوں نے یہ تمام باتیں کھل کر نہیں بتائی تھیں۔

عمار کہہ رہا تھا۔ ''اب رابی یہ چاہتی تھی کہ بچہ بھی سلامت رہے اور بدنامی بھی نہ ہو۔ اسی لیے وہ مجھ سے اور میری ممی سے یہ ضد کر رہی تھی کہ اس کے آنے والے بچے کو میرا نام دیا جائے۔ میں اس بچے کا باپ کہلاؤں گا تو وہ بچہ ناجائز نہیں سمجھا جائے گا۔ معاشرے میں اسے عزت ملے گی۔ اسی لیے کل وہ فون پر مجھ سے اصرار کر رہی تھی کہ میں اس کے بچے کو اپنا نام دینے پر راضی ہو جاؤں۔''

خواہش نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ پوچھنا چاہتی تھی کہ کیا آپ راضی ہو گئے؟
اس کی یہ سوچ ہی غلط تھی۔ اگر وہ راضی ہو جاتا تو رابی کبھی یہاں سے نہ جاتی۔ وہ بولا۔
''میں نے اس سے صاف صاف کہہ دیا کہ میں اس بچے کو اپنا نام نہیں دوں گا۔ اس لیے کہ خواہش نے میرے ایک پیارے سے بیٹے کو جنم دیا ہے۔ آئندہ بھی وہ میرے بچوں کی ماں بنے گی۔ جب میں بیوی کے حقوق کسی کو نہیں دے سکتا تو ایک ماں کے حقوق بھی کسی کو نہیں دوں گا۔ جب تک میں زندہ ہوں۔ صرف وہی میری شریکِ حیات رہے گی اور وہی میری نسل کو آگے بڑھائے گی۔''

خواہش تڑپ کر آگے بڑھی اور اس سے لپٹ گئی۔ دہاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ وہ اسے تھپکنے لگا پھر اس کے آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔ ''ایک بہترین ازدواجی زندگی گزارنے کی صرف ایک ہی شرط ہے اور وہ یہ کہ میاں بیوی ایک دوسرے پر بھرپور اعتماد کریں۔ تمہارا اعتماد مجھ پر کمزور ہے پلیز۔ اس کمزوری کو دور کرو۔''

وہ شرم سے مری جا رہی تھی۔ اس وقت ایسی حالت تھی کہ وہ نظریں اٹھا کر اپنے عمار کو دیکھ بھی نہیں پا رہی تھی۔ جھکی نظروں سے صرف اس کے قدموں کو دیکھ سکتی تھی۔

☆=====☆=====☆

دوسرے دن وہ بڑی ناگواری سے اپنی اماں کے پاس آئی پھر کمرے میں آتے ہی اس کے سامنے اپنی ڈائری کو پھینکتے ہوئے بولی۔ ''یہ کیا الٹے سیدھے وظیفے بتاتی رہتی ہو؟ میرا اپنا ایک وجود ہے، ایک نام ہے، ایک شخصیت ہے۔ اگر وہ میرے نام اور میری شخصیت سے متاثر ہو کر مجھ سے محبت نہیں کرتے ہیں۔ صرف ان وظیفوں کی وجہ سے میرے سامنے جھکتے رہتے ہیں تو لعنت ہے ایسی ازدواجی زندگی پر۔ میں اپنے شوہر سے ایسی محبت نہیں چاہوں گی۔''

اماں نے حیران ہو کر پوچھا۔ ''اے میری بچی! تجھے ہوا کیا ہے۔ وہ کوئی الٹا وظیفہ تو نہیں پڑھوا رہا ہے؟''

''اماں! ذرا عقل سے سوچو اور بولو۔ میرا شوہر مجھے دل و جان سے چاہے اور میرا دیوانہ بن کر رہے تو یہ بہتر ہے یا وہ ایک بندھے ہوئے جانور کی طرح دُم ہلاتا رہے، وہ بہتر ہے؟ عورت کیا چاہتی ہے۔ مرد کی محبت، اس کا خلوص اور اعتماد چاہتی ہے اور اگر اسے یہ نہیں ملتا تو پھر وہ دنیا کی سب سے بدنصیب عورت ہے۔''

اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ''کیا تُو نے داماد جی کو اُلو کا گوشت نہیں کھلایا؟''

''کھلایا تھا اور دوسرے ہی دن طمانچہ کھا لیا۔ وہ اُلو نہیں ہیں۔ مرد ہیں...... مرد...... اور مرد وہ ہوتا ہے جو کبھی محبت سے اور کبھی جبر سے عورت کو زیر و زبر کرتا رہتا ہے۔''

اس کی ڈائری اماں کے سامنے پڑی ہوئی تھی۔ اس کے اوراق ہوا کی زد میں پھڑ پھڑا رہے تھے۔ اِدھر سے اُدھر ہو رہے تھے۔ اماں نے ایک نظر اس پر ڈالی۔ ایک صفحے پر نظر پڑتے ہی چونک گئی۔ اسے اٹھا کر پڑھنے لگی پھر اس نے بیٹی سے پوچھا۔ ''یہ کون سا وظیفہ ہے؟''

''یہ وہی وظیفہ ہے جو تم نے پہلی رات پڑھنے کو کہا تھا۔ اسے میں نے عمار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پڑھا تھا اور بعد میں بھی اکثر اسے پڑھتی رہی تھی۔''

''ہائے بیٹی! میں نے تجھ سے کہا کچھ تھا اور تُو نے لکھا کچھ ہے۔ یہاں ایک نہیں تین تین جگہ غلطیاں ہیں۔ ان کے باعث یہ وظیفہ غلط ہو گیا ہے تُو شروع سے ہی وہ وظیفہ غلط پڑھتی آ رہی ہے۔''

''تم نے جو لکھوایا تھا۔ میں نے وہی لکھا تھا۔''

''کیا میرا دماغ خراب ہوا تھا جو میں تجھے غلط وظیفہ لکھواتی؟ مجھے لکھنا آتا تو میں تجھ سے کبھی نہ لکھواتی، خود ہی لکھ کر دیتی۔''

خواہش آہستہ آہستہ جھاگ کی طرح کرسی پر بیٹھتی چلی گئی۔ یہ بات کھل کر سامنے آ گئی

تھی کہ اس نے پچھلے تین برسوں سے وظیفوں کے ذریعے عمار کو زیر نہیں کیا تھا۔ بلکہ وہ اسے اپنی دیوانگی سے اور محبت سے اسے زیر کرتا آرہا تھا۔

ایسے ہی وقت پرانے محلے کی ایک عورت بڑبڑاتی ہوئی کمرے میں آئی۔ وہ اس پسماندہ علاقے سے آئی تھی جہاں پہلے اماں رہا کرتی تھی۔ وہ آتے ہی ایک طرف بیٹھ کر دوپٹے سے پسینہ پونچھتے ہوئے بولی۔ ''اماں! تم نے کیا اتنے مہنگے اور بڑے علاقے میں مکان خرید لیا ہے؟ میں تین بسیں بدل کر یہاں آتی ہوں۔''

اماں نے پوچھا۔ ''ایسی کیا مار پڑی ہے۔ جو یوں پسینہ پسینہ ہو کر آئی ہو؟ کیا آج بس نہیں ملی؟''

''اماں! کچھ نہ پوچھو۔ وہ میرا شوہر سلیم میرے غلے سے پچیس ہزار چرا کر بھاگ گیا ہے۔''

پھر اس نے اماں کے قریب آ کر رازدارانہ انداز میں پوچھا۔ ''اماں! سچ بتاؤ۔ وہ جو تم نے فریزر میں گوشت رکھا تھا۔ وہ اُلو کا ہی گوشت تھا ناں؟''

اماں نے چونک کر اسے دیکھا پھر کہا۔ ''ہاں...... اُلو کا تھا...... لیکن تمہیں اس سے کیا لینا دینا؟''

''اسی کی وجہ سے مجھے لینے کے دینے پڑ گئے۔ تم نے چار روز پہلے مجھے وہ گوشت فریج سے نکال کر دکھایا تھا اور بتایا تھا کہ اس پر عمل کیا گیا ہے اور اسے تم اپنے داماد کے لیے لائی ہو اسے کھلایا جائے گا تو وہ ساری زندگی اُلو بن کر رہے گا۔''

''ہاں ہاں...... میں نے کہا تھا...... اور اب بھی ڈنکے کی چوٹ پر کہتی ہوں کہ یہ نسخہ ایسا ہے جو کبھی ناکام نہیں ہوتا۔ اپنا اثر ضرور دکھاتا ہے۔ اسے کھانے کے بعد میاں اکڑفوں دکھاتا ہے لیکن پھر کچھ دیر بعد ہی رام ہو جاتا ہے۔''

خواہش نے ماں کو دیکھا۔ وہ درست کہہ رہی تھی۔ عمار نے گوشت کھانے کے بعد اسے تھپڑ مارا تھا۔ اکڑفوں دکھائی تھی مگر جب وہ اس سے لپٹ کر رونے لگی تو وہ پگھل گیا تھا۔ رام ہو گیا تھا۔

وہ عورت کہہ رہی تھی۔ ''میں تمہیں صاف کہنے آئی ہوں کہ اُلو کا گوشت کھانے سے مرد کبھی اُلو نہیں بنتا۔ یاد ہے، میں نے کہا تھا کہ اماں میں تمہیں ایک ہزار روپے دوں گی، تم یہ گوشت مجھے دے دو۔ میں اپنے سلیم کو کھلاؤں گی مگر تم نے انکار کر دیا تھا۔''

اماں نے کہا۔ ''تو اور کیا میں اپنی بیٹی کا بھلا دیکھتی یا تمہارا؟''

''تم نے نہیں دیا تھا مگر میں اسی شام دوبارہ یہاں آئی تھی اور ایک پلاسٹک کی تھیلی میں دنبے کا گوشت چھپا کر لائی تھی۔ جب تم میرے لیے کچن میں چائے بنانے گئیں تو میں نے تم سے نظر بچا کر گوشت بدل دیا۔ اپنا لایا ہوا گوشت تمہارے فریج میں رکھ دیا اور اُلو کا گوشت نکال کر اپنے تھیلے میں چھپا لیا۔''

ماں بیٹی حیرانی سے اس کی باتیں سن رہی تھیں۔ اماں کا پارا ہائی ہو رہا تھا کہ وہ اسے اُلو بنا کر اُلو کا گوشت چرا کر لے گئی تھی۔

اماں نے ہاتھ نچاتے ہوئے کہا۔ ''تم تو بڑی دیدہ دلیر ہو۔ ایک تو چوری کی اور اوپر سے ہمیں طریقہ بھی بتا رہی ہو کہ کیسے چوری کی؟ لاؤ...... میرے ہزار روپے نکالو......''

وہ ایک جھٹکے سے اٹھتے ہوئے بولی۔ ''ارے کاہے کے ہزار روپے؟ وہ اُلو کا تو کیا؟ گدھے کا بھی گوشت نہیں تھا۔ میرے میاں پر تو اثر ہی نہیں ہوا۔ الٹا وہ میرے پچیس ہزار روپے چرا کر بھاگ گیا۔ میں تمہیں ایک ہزار روپے ضرور دوں گی مگر کوئی ایسا وظیفہ پڑھو کہ وہ میرے پچیس ہزار روپے لے کر واپس آ جائے۔ میں نے بڑی مشکل سے ایک ایک پائی جوڑی تھی اور وہ اسے لوٹ کا مال سمجھ کر لے گیا۔''

اماں نے پوچھا۔ ''تم اپنے پچیس ہزار واپس چاہتی ہو نا؟''

اس نے ہاں کے انداز میں سر ہلایا۔ ''اور تم یہ چاہتی ہو کہ تمہارا میاں بھی واپس آ جائے؟''

اس نے پھر سر ہلایا۔ وہ بولی۔ ''تو پھر ایک ہزار روپے نکالو میں ابھی تمہارے سامنے وظیفہ پڑھتی ہوں۔''

''نہیں...... پہلے وظیفہ پڑھو۔''

ان دونوں میں تُو تُو مَیں مَیں ہونے لگی۔ پہلے وہ اپنی رقم کو اور اپنے شوہر کو واپس چاہتی تھی۔ جبکہ اماں اس سے ہزار روپے اینٹھ لینا چاہتی تھی۔ خواہش کچھ الجھی ہوئی تھی۔ اسے ان کے جھگڑے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کا ذہن اُلو کے گوشت میں الجھا ہوا تھا۔

ایسے ہی وقت اماں کے موبائل کا بزر سنائی دیا۔ اس نے اسے آن کر کے کان سے لگایا پھر کہا۔ ''ہیلو...... کون......؟''

وہ دوسری طرف کی بات سن کر بولی۔ ''ارے تم سلیم ہو؟ تمہاری گھر والی یہاں میرے پاس بیٹھی جھگڑا کر رہی ہے لو...... اس سے بات کرو۔''

اس نے فون کو اس عورت کے کان سے لگایا۔ دوسری طرف سے سلیم کہہ رہا تھا۔ ''ثریا!

تم کہاں چلی گئی ہو؟ میں نے یہاں آ کر تمہیں تلاش کیا پھر سمجھ گیا کہ اماں کے پاس گئی ہو گی۔ اس کا فون نمبر میرے پاس تھا۔ اچھا ہوا۔ اب اس طرح تم سے بات ہو رہی ہے۔ بس گھر واپس چلی آؤ۔''

''تم کہاں مرنے چلے گئے تھے؟ میرے پچیس ہزار کہاں ہیں؟''

''اپنے پچیس ہزار کی پرواہ نہ کرو۔ میں تیس ہزار کما کر لایا ہوں اور تمہارے لیے ہی کما کر لایا ہوں۔ تم مجھے بے وفا اور ہرجائی سمجھتی ہو۔ ارے میں تو تمہارا غلام ہوں۔''

وہ خوش ہو کر بولی۔ ''بس میں ابھی آئی۔''

اس نے فون کو اماں کی طرف پھینکا۔ اپنے تھیلے میں ہاتھ ڈال کر ہزار کا ایک نوٹ نکالا۔ اسے اماں کی طرف پھینکتے ہوئے کہا۔ ''اماں! تمہارا جواب نہیں ہے۔ وہ واقعی اُلو بنا ہوا ہے۔ پچیس ہزار لے گیا تھا اب تیس ہزار لے کر آیا ہے۔''

وہ خوشی کے مارے تیزی سے چلتی ہوئی، بڑبڑاتی ہوئی اماں کے گھر سے چلی گئی۔ اماں نے ہزار کے نوٹ کو دیکھ کر فخر سے کہا۔ ''دیکھا...... کیسے بیٹھے بیٹھے ہزار روپے کما لیے؟''

خواہش نے گھور کر ماں کو دیکھا پھر کہا۔ ''تمہیں کچھ خیال بھی ہے؟ پہلے اس عورت سے اُلجھی ہوئی تھیں۔ اب ہزار روپے دیکھ کر خوش ہو رہی ہو۔ یہ بات تمہارے دماغ میں نہیں آ رہی کہ تم نے اپنے داماد کو اُلو کا گوشت نہیں کھلایا ہے۔ میں یہاں سے دنبے کا گوشت لے کر گئی تھی۔''

وہ اپنے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے حیرانی سے بولی۔ ''ارے ہاں۔ ادھر تو میرا دھیان ہی نہیں گیا۔ اصل گوشت تو وہ لے گئی تھی اور داماد جی کو ہم نے دو نمبر کا مال کھلایا ہے۔''

یہ بات اب اچھی طرح سمجھ میں آ گئی کہ وہ اب تک عمار کو اُلو نہیں بنا سکی تھیں۔ اس کے برعکس خود ہی اُلو بنتی آ رہی تھیں۔

وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اپنا پرس اٹھاتے ہوئے بولی۔ ''اماں! میں جا رہی ہوں۔ آئندہ جب بھی یہاں آؤں تو مجھ سے وظیفوں اور جادو ٹونے کی باتیں نہ کرنا۔ میں سمجھ گئی ہوں، میرے عمار مجھے دل کی گہرائیوں سے چاہتے ہیں اور ایسے محبت کرنے والے شوہروں کو اُلو بنانے والی عورتیں خود ہی اُلو بنتی رہتی ہیں۔''

وہ پلٹ کر تیزی سے چلتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔

☆======☆======☆

معتبر

اس کا نام مرجینا تھا۔ مرجینا میں ''مر'' بھی تھا اور ''جینا'' بھی۔ وہ اپنے نام کے مطابق مرمر کے جی رہی تھی۔ جب تک زندگی رہتی ہے، موت جیسے مصائب سے گزرنا ہی پڑتا ہے۔ بدترین حالات سے گزرتے وقت کہا جاتا ہے کہ نصیب ہی ایسے ہیں، یہ نہیں سمجھا جاتا کہ اعمال بھی ایسے ویسے ہیں۔

وہ محبت کی بھوکی تھی۔ والدین سے محبت نہیں ملی۔ وہ اس کے بچپن میں ہی مر گئے تھے۔ کبھی خالہ نے، کبھی پھوپھی نے پال پوس کر جوان کیا۔ بچپن میں اس کے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں تھا جس سے وہ خوش نصیبی کے چند لمحات حاصل کر لیتی۔ تعلیم ہو، ہنرمندی ہو اور تھوڑی سی ذہانت بھی ہو تو پھر محنت اور لگن سے اپنی زندگی سنواری جاسکتی ہے۔ اس نے مرکھپ کر انٹر پاس کیا تھا۔ اپنی ہم عمر سہیلیوں میں اٹھنے بیٹھنے کا موقع ملتا رہا تھا۔ تعلیم کے دوران میں ہی اس کی ایک سہیلی انیلا کو ایک خوبرو نوجوان سے عشق ہوا اور اس نے شادی کر لی۔

اس کی دوسری سہیلی رخسانہ نے بھی اپنی پسند سے شادی کر لی۔ وہ یونہی...... بیٹھی رہ گئی، سوچتی رہی کہ اس کی زندگی میں بھی کسی کو آنا چاہیے۔ یہی عمر ہوتی ہے کسی کو چاہنے کی اور کسی سے چاہے جانے کی، وہ بچپن سے دیکھتی آئی تھی کہ ہر عورت ایک مرد کے سہارے کی محتاج ہوتی ہے۔ جب کوئی اس کی زندگی میں آتا ہے تب ہی اسے ایک مضبوط سہارا ملتا ہے۔ تب ہی اس کا حال اور اس کا مستقبل سنورتا ہے۔

مرجینا ایسی گئی گزری نہیں تھی کہ کوئی اس کی طرف متوجہ نہ ہوتا۔ وہ تو اچھی خاصی قبول صورت تھی۔ جوانی کی کشش نے اسے خوب صورت بنا دیا تھا اور یہ سچی کہاوت ہے کہ گدھی پر جوانی آئے تو وہ بھی خوب صورت لگتی ہے اور وہ گدھی نہیں، انسان کی بچی تھی۔ پہلی نظر میں متاثر نہیں کرتی تھی۔ دھیرے دھیرے نظروں میں سماتی تھی۔ بڑی خاموشی سے دل میں اُترتی تھی۔

اس تیز رفتار کمپیوٹر کے دور میں کسی کو اتنی فرصت نہیں ملتی کہ وہ ٹھہر ٹھہر کر عشق کرے۔ محبت بھی بڑی تیزی سے ہوتی ہے۔ شام کو عشق ہوتا ہے، رات کو عشق کے مرحلے طے کیے جاتے ہیں۔ اس کے بعد ہی چاند چڑھتا ہے، دنیا دیکھتی ہے اور گود بھر جاتی ہے۔

وہ سوچتی تھی کوئی محبت کرنے والا نہ ملے، شادی کرنے والا ہی مل جائے، کوئی اس کا سہارا بن جائے۔ وہ کبھی پھوپی کے گھر میں رہتی تھی، کبھی خالہ کے ہاں دن گزارتی تھی، کبھی چچا یا ماموں کو کام والی کی ضرورت پڑتی تو اسے کچھ دنوں کے لیے لے جاتے تھے۔ جتنے سگے رشتے دار تھے، وہ سب ہی اس کے کام کاج سے خوش ہو کر اسے کھلاتے پلاتے اور اس کی ضرورتیں پوری کرتے تھے پھر اپنی ضرورتیں پوری ہونے کے بعد اسے کسی دوسرے سگے کے ہاں بھیج دیتے تھے۔ وہ بے پیندے کے لوٹے کی طرح اِدھر سے اُدھر لڑھکتی رہتی تھی۔

رمضان کے مہینے میں مرجینا کی ضرورت سب کو ہوتی تھی۔ سحری کے لیے الگ ہانڈیاں چڑھائی جاتی تھیں۔ دوپہر ہی سے افطار کے پکوان کی تیاری شروع ہو جاتی تھی۔ عید سے پہلے ایک ایک کمرے کی صفائی، پردوں اور چادروں کی دھلائی، گھر کے ہر فرد کے لیے نئے کپڑوں کی سلائی پھر افطار پارٹی اس کے بعد عید ملن پارٹی کے تقاضے اس قدر مصروف کر دیتے کہ صبح سے رات گئے تک سر کھجانے کی بھی فرصت نہیں ملتی تھی۔ اس ماہ میں مرجینا کے دم قدم سے ہی مشکلیں آسان ہوتی تھیں۔ پھوپی، خالہ، ماموں اور چچا کے درمیان لڑائیاں شروع ہو جاتی تھیں۔ ہر کوئی مرجینا کو اپنے گھر بلا کے رکھنا چاہتا تھا۔ جب لڑائیوں سے بات نہیں بنتی تھی تو پھر وہ ایک دوسرے سے سمجھوتا کرتے تھے کہ مرجینا ہر ہفتے کسی ایک کے گھر میں رہے گی پھر دوسرے ہفتے دوسرے گھر چلی جائے گی۔ اسی طرح چاروں سگوں کے گھر چار ہفتے گزارے گی۔ عید کے بعد جس گھر میں عید ملن پارٹی ہوگی اس گھر میں چلی جائے گی۔

گویا رمضان کے مہینے میں اسے چاروں گھروں کی صفائی کرنی پڑتی تھی۔ چاروں گھروں کے میلے کپڑے، چادریں اور پردے دھوتی...... پھر سحری اور افطار کے پکوان کے لیے کچن میں گھسی رہتی تھی۔ اتنی محنت تو کوئی باورچن اور دھوبن بھی نہیں کرتی ہوگی لیکن وہ بچپن ہی سے محنت و مشقت کی عادی ہو چکی تھی۔

وہ سوچتی تھی۔ میرے اپنے مجھے دن رات کام میں جتائے رکھتے ہیں لیکن میری ضرورتیں بھی پوری کرتے ہیں۔ چاروں گھروں سے مجھے عید کے نئے کپڑے مل جاتے ہیں۔ وہ میری پڑھائی پر اعتراض کرتے تھے۔ دن رات باتیں سناتے تھے مگر اسکول اور کالج کی فیسیں دیتے رہتے تھے۔ تعلیم حاصل کرنے کے لیے میں نے گالیاں بھی سنی ہیں، مار بھی

کھائی ہے۔ میرے اچھے دن اسی وقت آئیں گے جب میری شادی ہوگی اور کوئی مجھے دلہن بنا کر لے جائے گا۔ اپنے مرد کا سہارا ہی سب سے زیادہ محفوظ اور مضبوط ہوتا ہے۔

پھر اس کی زندگی میں احسان آ گیا۔ وہ اتنا باتونی تھا کہ باتوں ہی باتوں میں اسے اپنی طرف مائل کرتا چلا گیا۔ اس نے بتایا کہ وہ سرکاری ملازمت کرتا ہے۔ بی اے پاس کیا ہوا ہے اور ماہانہ پانچ ہزار روپے تنخواہ پاتا ہے۔ اس نے مرجینا سے پوچھا۔ ''تم کیا کرتی ہو؟''

اس نے کہا۔ ''ویسے تو میں انٹر پاس ہوں۔ آگے پڑھنا چاہتی ہوں لیکن تعلیم جاری رکھنے کے لیے میرا سر پرست کوئی نہیں ہے۔ بچپن میں ہی میرے والدین فوت ہو گئے تھے۔''

''اچھا تو تم اپنے چچا جان کے ساتھ رہتی ہو۔''

''نہیں...... یہاں ایک ہفتے کے لیے آئی ہوں۔ اگلے ہفتے خالہ جان کے پاس رہوں گی۔ اس کے ایک ہفتے بعد پھوپی جان کے پاس جاؤں گی۔ کبھی کسی کے ہاں ایک ہفتہ اور کبھی کسی کے ہاں دو ہفتے رہ جاتی ہوں، میرا کوئی مستقل ٹھکانا نہیں ہے۔''

''کوئی تمہیں اپنے پاس مستقل کیوں نہیں رکھ لیتا؟''

''سب ہی کو ایک ماسی، ایک باورچن اور ایک دھوبن کی ضرورت ہوتی ہے اسی لیے کوئی نہ کوئی مجھے اپنے گھر لے جا کر رکھ لیتا ہے پھر کسی دوسرے کو ضرورت ہوتی ہے تو وہ مجھے وہاں سے لے جاتا ہے۔''

''یعنی تم ان چار گھروں کے کام تنہا کرتی ہو؟ وہ بدلے میں تمہیں تنخواہ نہیں دیتے، کھانا کپڑا دیتے ہیں۔ میں کل ہی اپنی اماں کو تمہارا رشتہ مانگنے بھیجوں گا۔''

دوسرے دن احسان کی ماں رشتہ مانگنے پہنچ گئی۔ وہ بھی اپنے بیٹے کی طرح باتونی تھی۔ پٹاخے کی طرح بولتی تھی۔ وہاں آ کر بیٹھتے ہی اپنے بیٹے کی تعریفیں کرنے لگی۔ مرجینا کی چچی اور چچا نے کہا۔ ''یہ خوشی کی بات ہے کہ آپ کا بیٹا بہت قابل ہے اور بہت کماتا ہے۔ ویسے آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟''

وہ بولی۔ ''یہ لو...... اتنی دیر سے پوری رام کہانی سنا رہی ہوں پھر بھی آپ پوچھ رہے ہیں کہ شری رام کون تھے؟ بھئی میں اپنے بیٹے کے لیے مرجینا کا ہاتھ مانگنے آئی ہوں۔''

ان دونوں نے ایک ذرا فکر مند ہو کر ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا پھر چچا نے کہا۔ ''مرجینا کے صرف ہم ہی نہیں اور بھی تین سر پرست ہیں۔ ہم ان سب سے مشورہ کرنے کے بعد ہی آپ کو جواب دیں گے۔ آپ اپنے گھر کا پتا اور خاندانی شجرہ لکھ کر دے دیں۔''

وہ بولی۔ ''گھر کا پتا تو آسان ہے۔ آپ سرجانی ٹاؤن کے علاقے فور بی میں آ کر کسی

سے پوچھیں کہ پاپڑ والی خالہ کہاں رہتی ہے تو کوئی بھی آپ کو میرے گھر پہنچا دے گا۔ ہم تو پورے سرجانی ٹاؤن میں مشہور ہیں۔''

''ٹھیک ہے، ہم جلدی آ کر آپ سے ملیں گے۔''

''ہمارے بنائے ہوئے پاپڑ اور اچار اتنے پسند کیے جاتے ہیں کہ خریداروں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔ میں جلدی میں لانا بھول گئی۔ آپ گھر آئیں گے تو آپ کو کھلاؤں گی اور باندھ کر بھی دوں گی۔ آپ اپنے محلے والوں اور رشتے داروں کو کھلائیں گے تو ہمارے گاہکوں میں اضافہ ہوگا اور جب رشتے داری ہو جائے گی تو میں اپنے کاروبار کی ایک شاخ یہاں کھول لوں گی۔ خوب بات بنے گی، رشتے داری کی رشتے داری، کاروبار کا کاروبار......''

وہ بولتے ہوئے اور اپنے گھر آنے کی تاکید کرتے ہوئے چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی چچی جان نے رازدارانہ انداز میں میاں سے کہا۔''میں نے تو کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ اس کا بھی رشتہ آئے گا اور ہمیں اس کی شادی کرنی ہوگی۔ یہ اپنے گھر کی ہو جائے گی تو ہمارا کیا بنے گا؟''

چچا نے کہا۔''یہ بہت اہم معاملہ ہے۔ اس کی خالہ، پھوپی اور ماموں کو بلا کر اس مسئلے پر غور کرنا ہوگا۔ ہم تو جیسے اب تک سو رہے تھے۔ اس رشتہ مانگنے والی نے ہمیں جگا دیا ہے۔ ہمیں اس معاملے کو کسی طرح نمٹانا ہوگا۔''

باقی تین سگوں کو فون پر اطلاع دی گئی کہ مرجینا کا رشتہ آیا ہے۔ ہم سب کو مل بیٹھ کر سوچنا ہے، سمجھنا ہے کہ اس لڑکی کو کس گھاٹ اتارا جائے۔

دوسرے دن وہ چاروں ایک چھت کے نیچے یکجا ہو گئے۔ مرجینا کو گھر کے کام سے لگا دیا اور کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر کے اس مسئلے پر بحث کرنے لگے۔ پھوپی نے کہا۔''میں بیمار رہتی ہوں۔ گھر کا تمام کام تنہا نہیں کرسکتی۔ بیٹیاں تو کالج جاتی ہیں یا تفریح کے لیے اُڑتی پھرتی ہیں، کوئی ڈھنگ کی ماسی نہیں ملتی۔ مرجینا کی شادی میری بربادی ہوگی۔''

ماموں نے کہا۔''گھر کے چھوٹے موٹے کام تو اس کی ممانی کسی طرح سنبھال لیتی ہیں لیکن بڑے بڑے کاموں کو مرجینا ہی نمٹاتی ہے۔''

خالہ نے کہا۔''دیکھا جائے تو ہم اس لڑکی کے عادی ہو گئے ہیں۔ اس کے سوا کسی کا کام پسند ہی نہیں آتا۔''

چچی نے کہا۔''میں نے کوکنگ کا کورس کیا ہوا ہے، میرا پکوان بہت ہی لذیذ ہوتا ہے

لیکن یہ کم بخت مجھ سے بھی زیادہ لذیذ کھانے پکاتی ہے اور گھر کو تو ایسے صاف ستھرا رکھتی ہے کہ اسٹور روم کا کاٹھ کباڑ بھی سلیقے سے رکھا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ یہ تو ہماری مجبوری بن گئی ہے۔''

چچا نے کہا۔''کیا ہم اسے شادی کے بغیر بٹھائے رکھیں گے؟ کبھی نہ کبھی تو اس کا گھر بسانا ہوگا؟''

پھوپی نے کہا۔''گھر بسانا بچوں کا کھیل تو نہیں ہے۔ اس کی شادی میں کم سے کم خرچ کرو تب بھی ایک لاکھ روپے ضرور ہوں گے۔''

چچی نے کہا۔''ہم چار ہیں۔ ہمیں پچیس پچیس ہزار روپے دینے ہوں گے۔ یہ کوئی معمولی رقم تو نہیں ہے۔ میں کتنے برسوں سے سونے کا ایک سیٹ بنوانا چاہتی ہوں لیکن پچیس ہزار جمع نہیں کر پا رہی ہوں۔''

ماموں نے کہا۔''بھئی میرا کاروبار تو بہت ہی مندا جا رہا ہے۔ پچیس ہزار تو دور کی بات ہے میں پچیس روپے بھی نہیں نکال پاؤں گا۔''

چچا نے کہا۔''ہم نے آج تک مل بانٹ کر اس کی پرورش کی ہے، اس کی تعلیم میں بھی ہم سب نے تھوڑی تھوڑی رقم لگائی تو وہ ہمیں بوجھ نہیں لگی لیکن شادی میں تو یکمشت رقم لگانی ہوگی۔ یہ ہمارے لیے ممکن نہیں ہے۔''

پھوپی نے ناگواری سے کہا۔''کیا ضروری ہے اس کی شادی کی جائے؟ کتنی ہی لڑکیاں بیٹھے بیٹھے بوڑھی ہو جاتی ہیں مگر ان کی شادی نہیں ہوتی۔ اس کی بھی نہیں ہوگی تو کوئی قیامت نہیں آ جائے گی۔''

''یہ جو رشتہ آیا ہے اسے ہم کسی طرح ٹال دیں گے لیکن اس کے بعد اور رشتے آئیں گے تو کیسے ٹالتے رہیں گے؟''

''ہاں...... یہ تو ہے، ہمیشہ نہیں ٹال سکیں گے۔ دوسرے رشتے دار باتیں بنائیں گے کہ لڑکی کو ہم نے اپنے مطلب کے لیے بٹھا رکھا ہے۔''

چچا نے کہا۔''ایک راستہ ہے۔ اس کی شادی بھی ہو جائے گی اور ہماری مشکل بھی آسان ہو جائے گی۔''

سب انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ انہوں نے کہا۔''کوئی ایسا لڑکا ہو جو گھر داماد بن کر رہے۔''

چچی نے کہا۔''آپ تو جب کریں گے بے تکی بات ہی کریں گے۔ کیا اس کا بوجھ کم ہے

کہ ایک گھر داماد کا بھی بوجھ اٹھائیں گے......؟''

''پہلے میری پوری بات سمجھ لو، مجھے دکان کا مال گاہکوں تک پہنچانے کے لیے ایک ملازم کی ضرورت ہے۔''

انہوں نے مرجینا کے ماموں سے کہا۔''آپ چاہتے ہیں کہ شام کو کوئی پارٹ ٹائم کرنے والا ملازم مل جائے۔''

خالہ نے کہا۔''مجھے تو ایسا بندہ چاہیے جو بچوں کو اسکول پہنچایا کرے اور واپس لے آیا کرے۔''

پھوپی کو بھی گھر کے باہر کے کام نمٹانے کے لیے ایک ملازم کی ضرورت تھی۔ چچا نے کہا۔''اگر ہم الگ الگ ملازم رکھیں گے تو ہم کو اپنی اپنی جیبوں سے انہیں ماہانہ تنخواہیں دینی ہوں گی لہٰذا الگ الگ چار ملازم کیوں رکھے جائیں ایک ہی کیوں نہ رکھا جائے؟ وہ مرجینا کی طرح چاروں گھروں کے کام نمٹا دیا کرے گا۔''

ماموں نے کہا۔''بات کچھ سمجھ میں آ رہی ہے۔ ہمارے گھر ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ ہم اس ملازم کے ڈیوٹی کے اوقات مقرر کر دیں گے کہ وہ کس گھر میں کتنے بجے سے کتنے بجے تک کام کرے گا۔''

خالہ نے پوچھا۔''کیا ایسا بندہ مل جائے گا؟''

''ایک نہیں ہزار ملیں گے۔ ملک میں بے روزگاری اتنی بڑھ گئی ہے کہ گریجویشن کرنے والے نوجوان ماہانہ ہزار دو ہزار کی ملازمتیں کر رہے ہیں۔ اگر ہم ایک ایک ہزار دیں تو چار ہزار میں ایک ملازم بھی مل جائے گا اور داماد بھی......''

''یعنی اسی ملازم کو داماد بنا کر رکھیں گے۔ اس طرح مرجینا بھی پرائے گھر نہیں جائے گی۔ وہ تو گھر کے کام سنبھالتی ہی ہے۔ داماد باہر کے کام سنبھالا کرے گا۔''

''واہ......اس سے اچھی منصوبہ بندی تو ہو ہی نہیں سکتی بشرطیکہ ایسا کوئی لڑکا مل جائے۔''

''ایک نہیں......درجنوں ملیں گے بلکہ میری نظر میں ایک بے وقوف سا نوجوان ہے۔ میں اسے شیشے میں اتاروں گا۔''

پھوپی نے کہا۔''یہ آئیڈیا بہت اچھا ہے۔ اس کی شادی مرجینا سے ہوگی، بچے ہوں گے تو یہ سارا بوجھ اٹھانے کے لیے اسے گھر داماد اور آفس داماد بن کر رہنا ہوگا۔''

دروازے پر دستک ہوئی۔ چچا نے اپنی جگہ سے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ ان کی ایک جوان بیٹی کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے ایک تہہ شدہ کاغذ باپ کو دیتے ہوئے کہا۔''یہ مرجینا آپی نے دیا

ہے۔''

وہ کاغذ دے کر چلی گئی۔ چچا نے ان سب کو وہ کاغذ دکھاتے ہوئے کہا۔''مرجینا نے کچھ لکھ کر بھیجا ہے۔''

وہ ایک صوفے پر آ کر بیٹھ گئے اور اسے کھول کر پڑھنے لگے۔''چچا جان! میں کچھ عرض کرنے کی جرأت کر رہی ہوں۔ جو خاتون میرا رشتہ مانگنے آئی تھیں، ان کے بیٹے کا نام احسان ہے۔ میں اسے جانتی ہوں۔ اگر آپ سب مناسب سمجھیں تو یہ رشتہ قبول کر لیں۔ آپ اپنے طور پر انکوائری کر کے ان کے بارے میں معلومات حاصل کر لیں۔ فقط آپ کی بیٹی، مرجینا۔''

پھوپی نے ناگواری سے کہا۔''اس لڑکی کے پر نکل رہے ہیں۔ کیسی بے حیائی سے اپنی شادی کی بات کر رہی ہے؟''

خالہ نے کہا۔''ہمارا زمانہ کچھ اور تھا، ہم بے زبان تھے۔ آج کل کی لڑکیاں بے لگام ہیں۔ یہ لڑکی احسان کی طرف جھکے گی تو ہمارے منصوبے کا کیا ہوگا؟''

''جب یہ معلوم ہو چکا ہے کہ وہ احسان کی طرف مائل ہے تو ہم بظاہر اس کی بات مان لیں گے لیکن در پردہ اس رشتے کی کاٹ کریں گے۔''

سب نے ماموں کو دیکھا وہ بولے۔''لڑکی جوان ہے، بالغ ہے، تعلیم یافتہ ہے، سوجھ بوجھ رکھتی ہے۔ اپنے لیے ایک گھر اور گھر والے کا خواب دیکھتی ہے۔ اس کی اس چھوٹی سی تحریر سے اس کے خیالات، احساسات اور جذبات بڑی حد تک معلوم ہو چکے ہیں۔''

چچا نے تائید کی۔''یہ اوپر سے خاموش اور ٹھنڈی دکھائی دیتی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کے اندر لاوا نہیں پکتا ہوگا۔ اگر ہم اس کی مرضی کے خلاف کوئی فیصلہ سنائیں گے تو یہ باغی ہو سکتی ہے۔ ابھی یہ چنگاری ہے اسے بھڑکانا نہیں چاہیے، حکمتِ عملی کی راکھ میں دبا دینا چاہیے۔''

پھوپی نے پوچھا۔''یہ احسان کی طرف مائل ہے اسے اس سے کس طرح دور رکھا جا سکتا ہے؟''

''پہلے تو ہم معلوم کریں گے کہ احسان کون ہے، کیا کرتا ہے؟ اور خاندان کیسا ہے؟''

چچی نے کہا۔''اس کی ماں اپنی باتوں سے تو بالکل گئی گزری لگ رہی تھی۔ پاپڑ اور اچار بیچتی ہے اس کی سماجی حیثیت کیا خاک ہوگی؟''

دوسرے دن اس کے ماموں اور چچا اس محلے میں گئے جہاں احسان رہتا تھا۔ شام کو

وہاں سے واپس آ کر انہوں نے مرجینا کو بلایا پھر کہا۔ ”بیٹی! یہاں بیٹھو اور ہماری بات سنو۔“

وہ سر پر آنچل رکھتے ہوئے ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔ ماموں نے کہا۔ ”ہم احسان کے محلے میں گئے تھے۔ کھوٹے اور کھرے کی پہچان بہت مشکل ہوتی ہے۔ خاص طور پر انسان کو پہچاننا تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔ وہ اوپر سے کچھ نظر آتا ہے اور اندر سے کچھ ہوتا ہے۔“

چچا نے کہا۔ ”ہم وہاں پہلے ایک پرچون کی دکان پر گئے تھے۔ وہاں ایک بڑے میاں بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم نے ان سے کہا کہ احسان کے بارے میں کچھ معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ کیا آپ اس کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہیں؟“

بڑے میاں نے کہا۔ ”احسان اپنے ماں باپ کے ساتھ چھ برس پہلے اس محلے میں آیا تھا۔ تب سے اس دو کمرے کے مکان میں رہ رہا ہے۔ اس کے باپ کا انتقال ہو چکا ہے۔ بہن کی شادی ہوئی تھی۔ تین برس بعد بیوہ ہو کر ماں کے پاس آ گئی۔ تب سے یہیں رہتی ہے۔ اس کی گود میں ایک بچہ ہے۔“

ماموں نے کہا۔ ”میں نے بڑے میاں سے پوچھا کہ احسان کیا کام کرتا ہے؟“

بڑے میاں نے کہا۔ ”پتا نہیں کیا کرتا ہے؟ یہی کہتا پھرتا ہے کہ سرکاری ملازم ہے لیکن ہم نے کبھی اسے نوکری پر جاتے نہیں دیکھا۔ وہ ادھر بس اسٹاپ پر ایک ہوٹل ہے۔ وہاں صبح شام بیٹھا چائے پیتا رہتا ہے اور دوستوں کے ساتھ گپیں ہانکتا رہتا ہے یا پھر کیبل والوں کے پاس جا کر انگریزی فلمیں دیکھتا رہتا ہے۔“

چچا نے پوچھا۔ ”جب وہ کماتا نہیں ہے تو کھاتا کہاں سے ہے؟“

”اس کی ماں اور بہن کام کرتی ہیں۔ گھروں میں جا کر برتن دھوتی ہیں، جھاڑو پونچھا لگاتی ہیں۔“

”ہم نے تو سنا ہے کہ وہ پاپڑ اور اچار بیچتی ہیں اور یہ کاروبار بہت چل رہا ہے۔“

بڑے میاں نے کہا۔ ”ان کے پاپڑ کھانے سے تو بہتر ہے کہ جھانپڑ کھا لیں۔ اس نے اپنے پاپڑ اور اچار میری دکان میں بیچنے کے لیے رکھے تھے جو بھی خریدار اسے لے جاتا رہا، منہ بناتا رہا اور شکایتیں کرتا رہا۔ میں نے انہیں بیچنا ہی چھوڑ دیا۔“

ایک گاہک آٹا خریدنے کے لیے آیا بڑے میاں نے کہا۔ ”یہ احسان کے پڑوسی ہیں۔“

پھر اس نے پڑوسی سے کہا۔ ”جبار بھائی! آپ انہیں بتایئے احسان کیا کام کرتا ہے؟“

وہ ناگواری سے بولا۔ ”وہ ہڈحرام کیا کرم کرے گا۔ دن بھر اِدھر سے اُدھر گھومتا پھرتا

ہے یا ہوٹل بازی کرتا رہتا ہے۔ دو مہینے پہلے اس کی ماں نے مجھ سے پچاس روپے ادھار لیے تھے۔ آج تک ادا نہیں کیے۔''

ماموں نے کہا۔''مرجینا! ہم تمہاری بہتری چاہتے ہیں۔ ہماری کوشش یہی ہوگی کہ تم کسی بڑے گھرانے میں بیاہ کر جاؤ۔ تمہیں کوئی اچھا کھانے کمانے والا لڑکا ملے۔ ہم نے اس محلے میں جگہ جگہ جا کر معلومات حاصل کی ہیں۔ کوئی اس کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتا ہے۔ تم خود ہی عقل سے سوچو، کیا ایسے آدمی کے ساتھ خوش رہ سکتی ہو؟''

وہ نظریں جھکا کر بولی۔''احسان نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ مرکاری ملازم ہے اور چھ ہزار روپے تنخواہ پاتا ہے۔''

''ٹھیک ہے ہم اس سے پوچھیں گے کہ وہ کس سرکاری ادارے میں ملازم ہے؟ پھر اس سرکاری ادارے میں جا کر انکوائری کریں گے۔ کل تک معلوم ہو جائے گا کہ وہ تم سے کتنا سچ بول رہا ہے؟''

بات دوسرے دن پر ٹل گئی۔ وہ دو گھنٹے بعد اپنی ایک سہیلی سے ملنے اسی محلے میں گئی۔ احسان رات آٹھ بجے اسے وہاں فون کرنے والا تھا۔ سہیلی نے پوچھا۔''کیا بات بن رہی ہے؟''

مرجینا نے کہا۔''مجھے تو بگڑتی نظر آ رہی ہے۔ میرے ماموں اور چچا، احسان کے محلے میں گئے تھے۔ وہاں اس کے بارے میں معلومات حاصل کیں اور ساری معلومات نگیٹیو ہیں۔ اس کے خلاف ہیں۔''

اس کے بزرگوں نے جو کچھ اسے احسان کے بارے میں کہا تھا۔ وہ سب اپنی سہیلی کو بتانے لگی۔ سہیلی نے سننے کے بعد کہا۔''بزرگوں کا فرض ہے کہ اچھا برا دیکھیں، سمجھیں، پرکھیں پھر اپنی اولاد کے لیے اچھے مستقبل کا فیصلہ کریں۔ تمہارے ماموں اور چچا تمہاری بہتری کے لیے یہ ساری انکوائری کر رہے ہیں۔''

''وہ تو ٹھیک ہے مگر مجھے یقین نہیں آ رہا ہے کہ احسان کام چور ہے۔ کوئی کام نہیں کرتا ہے اور مجھ سے جھوٹ بول رہا ہے۔ میں یہ بھی نہیں مانتی کہ اس کی ماں اور بہن گھر گھر جا کر ماسی کا کام کرتی ہیں۔''

''احسان سے تمہاری دلی وابستگی ہے اس لیے تمہارا دل اس کے خلاف نہ تو سننا چاہے گا اور نہ ہی تسلیم کرنا چاہے گا اسی لیے تو کہتے ہیں کہ محبت اندھی ہوتی ہے۔''

مرجینا نے کہا۔''تم نے بھی محبت کی ہے اور پھر شادی کی ہے کیا تمہاری محبت اندھی

نہیں کہلاتی ؟''

''نہیں ہرگز نہیں، میرے بزرگوں نے پہلے جاوید کے بارے میں ساری معلومات حاصل کی تھیں پھر میں نے جاوید سے اپنی بہت سی شرائط منوائی تھیں۔''

''کیا مجھے بھی شرائط منوانی ہوں گی؟''

''پہلے تو اپنے بزرگوں پر بھروسا کرو کہ وہ تمہاری بھلائی کے لیے یہ ساری معلومات حاصل کر رہے ہیں۔ اگر تمہیں ان پر اعتماد نہیں ہے تو تمہیں اپنے طور پر یہ ساری معلومات حاصل کرنی چاہئیں۔ تم اسے دو چار دنوں سے جانتی ہو جبکہ اسے جاننے کے لیے تمہیں اور بہت کچھ معلوم کرنا ہوگا۔ اس پر اندھا اعتماد کرو گی تو بہت پچھتاؤ گی، سر پکڑ کر روتی رہو گی۔ میری یہ بات اچھی طرح یاد رکھو کہ شادی کنواری لڑکی کی زندگی کا سب سے بڑا جوا ہوتی ہے۔ اس جوئے میں اگر وہ ہار گئی تو ساری زندگی ہارتی رہتی ہے اور اگر اس جوے کی پہلی بازی ہی جیت جائے تو پھر کامیاب ازدواجی زندگی گزارتی ہے۔''

فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا۔ دوسرے طرف سے احسان کی آواز سنائی دی۔ ''جی، میں احسان بول رہا ہوں اور مرجینا سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''

وہ خوش ہو کر بولی۔ ''میں ہی بول رہی ہوں۔''

''ہائے مرجینا! میں نے تمہیں دو دنوں سے نہیں دیکھا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے آنکھوں سے سارے نظارے گم ہو گئے ہیں جہاں دیکھتا ہوں تم ہی تم دکھائی دیتی ہو۔''

وہ خوشی سے بل کھانے لگی اور اس کی سحر انگیز باتوں میں گم ہونے لگی۔ رخسانہ نے اس کے بازو میں چٹکی لی تو وہ چونک گئی۔ ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ''یہ کیا کر رہی ہو؟''

''تمہیں نیند سے جگا رہی ہوں۔ وہ یقیناً سحر پھونک رہا ہوگا اور تم سحر زدہ ہو رہی ہو۔ کام کی باتیں کرو اس سے پوچھو کہ وہ کس سرکاری ادارے میں کام کرتا ہے۔ وہاں کا پتا اور فون نمبر معلوم کرو اور ابھی نوٹ کرو۔''

وہ ماؤتھ پیس سے ہاتھ ہٹا کر بولی۔ ''تم اپنی ہی کہے جا رہے ہو کچھ میری بھی سنو میں بہت ضروری باتیں کرنا چاہتی ہوں۔''

وہ رومانٹک انداز میں بولا۔ ''محبت سے زیادہ ضروری بات کوئی نہیں ہوتی۔''

''ہوتی ہے، میرے ماموں اور چچا تمہارے محلے میں گئے تھے۔ تمہارے بارے میں معلومات حاصل کرنے.....

وہ ایک دم سے چونک کر بولا۔ ''وہ کب گئے تھے؟ تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟''

''مجھے کیا پتا تھا کہ وہ کب جائیں گے؟ اور کب تمہارے بارے میں انکوائری کریں گے۔ انہیں معلوم ہوا کہ ہے کہ تم سرکاری ملازمت نہیں کرتے ہو بلکہ کہیں بھی نوکری نہیں کرتے ہو۔''

''یہ سب جھوٹ ہے، میرے کسی دشمن نے انہیں بھڑکایا ہوگا۔ انہیں چاہیے تھا کہ مجھ سے آ کر ملاقات کرتے۔''

''تم مجھے بتا دو کہ تم کون سے ڈپارٹمنٹ میں کام کرتے ہو۔ اس ڈپارٹمنٹ کا نام، فون نمبر اور پتا مجھے بتاؤ۔ میں نوٹ کر رہی ہوں۔''

وہ تھوڑی دیر تک چپ رہا پھر بولا۔ ''کیا تم میرے خلاف انکوائری کرنا چاہتی ہو؟''

''اس میں تمہارے خلاف انکوائری کی کیا بات ہے؟ میرے بزرگوں کا فرض ہے کہ وہ تمہارے بارے میں مکمل معلومات حاصل کریں۔''

''کیا تمہیں مجھ پر بھروسا نہیں ہے؟''

''میں تو تم پر اندھا اعتماد کرتی ہوں لیکن بزرگوں کو تو اپنا فرض ادا کرنا ہی ہے۔''

''بزرگوں کو جانے دو۔ تم مجھ سے ملاقات کرو۔ میں محبت سے تمہارا ہاتھ تھام کر جب اپنے بارے میں بتاؤں گا تو تم میری سچائی سے خوش ہو جاؤ گی۔''

''تم ابھی یہاں آ جاؤ، ملاقات ہو جائے گی۔''

''وہاں تو تمہاری سہیلی ہے۔ شاید اس کا شوہر بھی آ جائے۔ میں تم سے تنہائی میں ملنا چاہتا ہوں۔''

''میں نے تمہیں رخسانہ کے بارے میں بتایا ہے۔ یہ میری راز دار سہیلی ہے۔ اس لیے تو یہاں فون پر تم سے باتیں ہو جاتی ہیں۔ تم یہاں آ ؤ گے تو ہمیں تنہائی میں ملنے کا موقع ضرور ملے گا۔''

''نہیں مرجینا! میں ان سب لوگوں سے دور گھر کی چار دیواری سے باہر الہ دین پارک میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ مجھے بتاؤ کل شام کس وقت وہاں آ ؤ گی؟''

''بڑی مشکل ہے، میں بتا چکی ہوں کہ مجھ پر کتنی پابندیاں عائد کی جاتی ہیں۔ میں شاید نہ آ سکوں۔''

اس کی سہیلی رخسانہ نے اشارہ دیا۔ اس نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ ''ہاں، بولو کیا کہنا چاہتی ہو؟''

وہ بولی۔ ’’ہاں...... اگر وہ یہاں نہیں آنا چاہتا تو اس سے کہو کہ فون پر اپنے ڈپارٹمنٹ کا نام، پتا اور فون نمبر بتائے یا پھر نہ بتانے کی وجہ بتائے۔ اگر وہ ٹال مٹول کرے تو سمجھ لو کہ وہ تم سے حقیقت چھپا رہا ہے۔‘‘

مرجینا نے فون پر کہا۔ ’’تم میری مجبوریوں کو نہیں سمجھ رہے ہو۔ میں نے ماموں اور چچا سے وعدہ کیا ہے کہ تمہارے ڈپارٹمنٹ کا نام اور پتا معلوم کر کے انہیں بتاؤں گی۔ اب گھر جاؤں گی تو انہیں کیا جواب دوں گی؟ بہتر ہے تم مجھے فون پر بتا دو۔‘‘

’’میری سمجھ میں نہیں آتا ہے، تم کیوں ضد کر رہی ہو؟ کیا تمہاری سہیلی تمہیں سکھا پڑھا رہی ہے؟‘‘

’’اس بات کا تعلق رخسانہ سے نہیں ہے۔ میرے گھر کے بزرگوں سے ہے۔ مجھے وہاں جا کر انہیں جواب دینا ہے، پلیز بتا دو۔‘‘

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ وہ ہچکچاتا رہا پھر اس نے کہا۔ ’’دیکھو! بات اصل میں یہ ہے کہ میں تمہیں دکھ دینا نہیں چاہتا تھا۔ ایک ہفتے پہلے مجھے ملازمت سے برخاست کر دیا گیا ہے۔ اس کی وجوہات کیا ہیں؟ یہ میں تمہیں بعد میں تفصیل سے بتاؤں گا۔ فی الحال میں بے روزگار ہوں لیکن اگلے ہفتے تک مجھے اس سے اچھی ملازمت مل جائے گی۔‘‘

’’یہ بات تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتائی؟‘‘

’’بتا دیتا تو تمہیں صدمہ ہوتا کہ میری نوکری چھوٹ گئی ہے۔ میں بے روزگار ہوں، پریشان ہوں۔ میں اپنے ساتھ تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔‘‘

’’اوہ احسان! تم کتنے اچھے ہو۔ اپنی پریشانیوں کو بھول کر میری پریشانیوں کا خیال کرتے ہو۔ تم ایک ہفتے پہلے تک جہاں ملازمت کرتے تھے وہاں کا نام پتا بتا دو تاکہ میرے ماموں اور چچا کو یقین ہو جائے کہ تم ملازمت کرتے رہے ہو۔‘‘

’’میں نہیں چاہتا کہ تمہارے بزرگ وہاں جائیں کیونکہ وہاں مجھ پر فراڈ کا الزام لگا کر نوکری سے نکالا گیا ہے جبکہ میں نے کوئی فراڈ نہیں کیا تھا۔ مجھ پر جھوٹا الزام لگایا گیا تھا لیکن تمہارے ماموں اور چچا اس کو جھوٹ نہیں مانیں گے، مجھے ہی فراڈ مانیں گے۔‘‘

وہ پریشان ہو کر بولی۔ ’’یہ تو عجیب سی الجھن ہو گئی ہے۔ میں اپنے بزرگوں کو کیسے سمجھاؤں گی۔‘‘

’’تم ان کی پرواہ نہ کرو، ابھی وہ مجھے جھوٹا اور فریبی سمجھیں گے لیکن میں نے فیصلہ کر لیا ہے میں ملازمت نہیں کروں گا کوئی بہت بڑا بزنس کروں گا اور جب بزنس شروع کروں گا تو

تمہارے بزرگوں کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ جائیں گی۔ یہ بتاؤ تم مجھ سے کب مل رہی ہو؟''

''کل تم اسی وقت یہاں فون کرو پھر میں بتاؤں گی۔ اچھا، اللہ حافظ!''

اس نے فون بند کر دیا پھر رخسانہ کو بتانے لگی کہ احسان کے ساتھ کیسی ٹریجڈی ہوئی ہے۔ ایک ہفتہ پہلے اس پر فراڈ کا الزام لگا کر اسے نوکری سے نکال دیا گیا ہے۔ ''میرے نصیب ہی خراب ہیں۔ اب ماموں اور چچا وہاں جا کر انکوائری کریں گے تو احسان کو فراڈ سمجھیں گے یہ کبھی یقین نہیں کریں گے کہ وہ بے چارہ بے قصور تھا۔''

رخسانہ نے جل کر کہا۔ ''اور تم بے چاری اس پر یقین کر رہی ہو۔''

''رخسانہ تم نہیں سمجھتیں وہ بہت مجبور اور پریشان ہے۔''

''میں نہیں سمجھتی اور تم بہت سمجھ رہی ہو۔ محلے کے لوگ کہہ رہے ہیں کہ وہ برسوں سے نوکری نہیں کر رہا ہے۔ یونہی آوارہ گردی کرتا رہتا ہے اور تم صرف اس ایک آدمی پر یقین کر رہی ہو۔ ساری دنیا کو جھٹلا رہی ہو۔''

''میں الجھ گئی ہوں، سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں کس پر بھروسا کروں؟''

''اپنے بزرگوں پر بھروسا کرو، مجھ پر بھروسا کرو۔ میں نے بھی محبت کی تھی مگر اندھی محبت نہیں کی تھی۔ جاوید کا سوچ سمجھ کر انتخاب کیا تھا۔ تمہیں بھی میں اندھی نہیں بننے دوں گی۔ اگر سوچ سمجھ کر اسے دانائی سے پرکھنا چاہتی ہو تو میرے پاس آیا کرو اور فون پر اس سے باتیں کیا کرو، ورنہ میں تمہاری راز دار سہیلی بن کر نہیں رہوں گی۔ میں تمہاری دشمن نہیں ہوں۔ جاؤ اور جا کر عقل سے فیصلے کرو، دل کی باتوں میں نہ آؤ۔''

وہ گھر واپس آئی تو چچا، چچی، ماموں، ممانی، پھوپی اور خالہ سب ہی اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ چچا نے پوچھا۔ ''کیا اس نے اپنے ڈپارٹمنٹ کا پتا اور فون نمبر بتایا ہے؟''

وہ سر جھکا کر انہیں بتانے لگی۔ ''اسے فراڈ کے جھوٹے الزام میں نوکری سے برخاست کر دیا گیا ہے۔ وہ آئندہ ملازمت نہیں کرے گا بلکہ بہت بڑا بزنس کرے گا۔''

''وہ تمہیں سبز باغ دکھا رہا ہے اور تم دیکھ رہی ہو مگر ہم تمہاری طرح نادان نہیں ہیں، ہم نے دنیا دیکھی ہے۔''

ماموں نے کہا۔ ''پورا محلہ اس کے خلاف بول رہا ہے۔ جس ڈپارٹمنٹ میں وہ کام کرتا تھا۔ وہاں سے اسے فراڈ کے الزام میں نوکری سے نکال دیا گیا ہے۔ اور تم پھر بھی نہیں سمجھ رہی ہو کہ وہ صحیح بندہ نہیں ہے۔''

وہ عاجزی سے بولی۔ ''میں آپ لوگوں سے التجا کرتی ہوں۔ آپ اسے اپنی سچائی اور ایمانداری ثابت کرنے کا موقع دیں۔ وہ جلد ہی ایک بڑا کاروبار شروع کرنے والا ہے۔''

پھوپی نے کہا۔ ''کاروبار کے لیے کثیر سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کی ماں اور بہن ماسی کا کام کرتی ہیں۔ ان کے پاپڑ اور اچار فروخت نہیں ہوتے ہیں۔ ان کی آمدنی کا دوسرا ذریعہ نہیں ہے پھر وہ بزنس کیسے کرے گا؟''

چچا نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''اس سے بحث نہ کی جائے۔ یہ کہتی ہے کہ اسے موقع دیا جائے تو ہم اس کی سچائی اور ایمانداری ثابت کرنے کا موقع اسے ضرور دیں گے۔''

ماموں نے کہا۔ ''لیکن جب تک ہماری نظروں میں وہ غلط ہے تب تک تم گھر سے باہر نہیں جاؤ گی اور نہ ہی اس سے ملو گی۔ اس سے فون پر بھی بات نہیں کرو گی۔''

خالہ نے پاس آ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''بیٹی! اس وقت ہم تمہیں دشمن دکھائی دے رہے ہوں گے لیکن آنے والا وقت تمہیں سمجھائے گا کہ ہم تمہاری بہتری کے لیے تم پر پابندیاں عائد کر رہے ہیں۔''

اسے یوں بھی بہت زیادہ آزادی حاصل نہیں تھی۔ کہیں جانے کے لیے اجازت طلب کرنی پڑتی تھی۔ اب تو اور زیادہ سختی کر دی گئی تھی۔ جانے کی اجازت نہیں دی جا رہی تھی۔ وہ رخسانہ کے پاس جانا چاہتی تھی۔ چچی نے رخسانہ کو بلا کر کہا۔ ''بیٹی! تم یہاں آ کر ہی مرجینا سے مل لیا کرو۔''

رخسانہ نے کہا۔ ''میں تو خود یہی چاہتی ہوں۔ اپنے اوپر کوئی الزام نہیں لوں گی۔ میں نے اسے سمجھایا ہے کہ عقل سے کام لے۔ تمام بزرگ اس کی بہتری چاہتے ہیں۔ اس شخص سے جمعہ جمعہ آٹھ دن کی ملاقات ہے اس پر اندھا اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔''

سہیلی نے بھی ایسے وقت ساتھ چھوڑ دیا تو وہ حوصلہ ہار گئی۔ دل پر جبر کر کے سوچنے لگی۔ ''صبر کرنا چاہیے، احسان اپنی سچائی اور ایمان داری ثابت کرے گا تو پھر وہ اسے داماد بنانے سے انکار نہیں کریں گے۔''

لیکن وہ دن نہیں آیا۔ ہفتے اور مہینے گزرنے لگے۔ وہ پلٹ کر نہیں آیا۔ فرہاد کو اپنے عشق کی سچائی ثابت کرنے کے لیے پہاڑ کاٹ کر دودھ کی نہر نکالنی پڑی تھی۔ آج کے دور میں عاشقوں کو صرف اسی طرح آزمایا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی محبوبہ کے لیے کس طرح حلال کی روزی اور روٹی حاصل کر سکتے ہیں۔ اگر وہ کامیاب ہوتے ہیں تو پھر وہ سچے ورنہ احسان کی طرح منہ چھپاتے پھرتے ہیں۔

ایک دن چچا اور چچی نے کہا۔ ''ہم نے تمہارے لیے ایک بہت اچھا لڑکا پسند کیا ہے۔ بالکل اکیلا ہے نہ ساس کا جھگڑا نہ نند کا جھگڑا۔ تم آزادی کے ساتھ ازدواجی زندگی گزارتی رہو گی۔''

اتنے دنوں میں احسان کے عشق کا بخار اُتر گیا تھا۔ وہ تو ایک اچھا اور سچا محبت کرنے والا جیون ساتھی چاہتی تھی۔ چچا اور چچی اس کی یہ آرزو پوری کر رہے تھے۔ چچی نے کہا۔ ''لڑکا بہت اچھا ہے۔ اس کا نام محبوب ہے۔ تمہارے چچا کے دفتر میں کام کرتا ہے۔''

اسے ایک محبوب کی آرزو تھی اور اس لڑکے کا نام بھی محبوب تھا۔ وہ اندر سے مطمئن ہو رہی تھی۔ چچا نے کہا۔ ''جس طرح تم کبھی ہمارے گھر میں رہتی ہو، کبھی ماموں کے گھر چلی جاتی ہو۔ کبھی پھوپی تمہیں بلالیتی ہیں اور کبھی خالہ کے گھر جا کر رہتی ہو۔ اسی طرح محبوب میری فیکٹری کا مال ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچایا کرے گا۔ تمہارے ماموں کو ضرورت ہوگی تو وہ ان کا کام کیا کرے گا۔ تمہاری پھوپی کے بچوں کو صبح اسکول پہنچایا کرے گا اور دوپہر کو لے آیا کرے گا۔ تمہاری خالہ کے گھر کا بھی اوپری کام کرے گا۔''

وہ حیرانی سے یہ باتیں سننے لگی، چچی نے کہا۔ ''تمہیں جس طرح کسی چیز کی کمی نہیں ہوتی ہے۔ تینوں وقت کا کھانا کسی بھی گھر سے مل جاتا ہے پہننے کے لیے اچھے کپڑے ملتے ہیں۔ ہم سب مل کر جس طرح تمہیں جیب خرچ کے لیے ایک ہزار روپے دیتے ہیں اسی طرح محبوب کو بھی ایک ہزار روپے دیا کریں گے۔ اسے بھی کھانا کپڑا ملتا رہے گا۔''

وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ چچا اور چچی نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں نفرت دیکھی وہ زبان سے کچھ نہ بولی۔ چپ چاپ وہاں سے چلتے ہوئے دوسرے کمرے میں آ گئی۔ وہاں اس کی چچازاد بہن نے پوچھا۔ ''کیا امی اور ابو نے محبوب کے بارے میں آپ سے باتیں کی ہیں؟''

''ہاں، میں سوچ رہی ہوں جو باتیں مجھ سے کہی گئی ہیں کیا تم سے کہی جا سکتی ہیں؟ کیا تمہارے لیے ایسا داماد پسند کیا جا سکتا ہے؟''

وہ ناگواری سے بولی۔ ''میرے لیے کیوں ایسا داماد آئے گا؟ اللہ میرے سر پر میرے ماں باپ کا سایہ سلامت رکھے۔ میں تمہاری طرح یتیم اور یسیر تو نہیں ہوں کہ جس نے جہاں چاہا وہاں پھینک دیا۔''

وہ چچازاد بہن غصے سے بڑبڑاتی ہوئی وہاں چلی گئی۔ وہ کمرے میں تنہا رہ گئی، سوچنے لگی۔ ''یہ کیسی زندگی گزر رہی ہے؟ اور کیسی گزرنے والی ہے؟'' ہر لڑکی کی طرح اس کے دل

میں بھی چاہے جانے کی خواہش تھی۔ کوئی اس کی زندگی میں آئے اور اسے بھرپور پیار دے اسے صرف اپنا بنا کر رکھے اور اس کا اپنا بن کر رہے۔

ایسی خواہش کے ساتھ یہ خواب بھی تھے کہ۔ ''اس کا چاہنے والا خوب کمائے اور ہر ماہ اپنی کمائی اس کے ہاتھ پر لا کر رکھے۔ اس کے لیے ایک گھر بنائے اسے اور اپنے بچوں کو تحفظ دے لیکن چچا جان جس محبوب کو اس کی زندگی میں لانا چاہتے تھے۔ وہ پہلے ہی ان کا غلام تھا۔ یہ گھر کے اندر کنیز بن کر رہے گی اور وہ باہر غلامی کرتا رہے گا۔ اس کی کوئی مضبوط ملازمت نہیں ہوگی۔ کوئی ترقی پا کر آمدنی بڑھانے والا ذریعہ نہیں ہوگا۔ اس کی طرح اس کا شوہر اور بچے بھی چچا، ماموں، خالہ اور پھوپی کے محتاج رہیں گے۔''

کمرے سے باہر چچی کے چیخنے اور چلانے کی آواز سنائی دی۔ وہ اپنے میاں سے کہہ رہی تھیں۔ ''یہ لڑکی ہمارا کھاتی ہے اور ہم پر ہی غراتی ہے۔ اس کی یہ مجال کہ میری بیٹی کو محبوب سے شادی کرنے کو کہہ رہی ہے۔''

چچا نے کہا۔ ''خواہ مخواہ غصہ نہ دکھاؤ۔ ہم اسے بھی تو یہی کہہ رہے ہیں۔ آخر وہ بھی تو میرے بھائی کی بیٹی ہے۔ یتیم ہوئی تو کیا ہوا؟ غصہ برداشت کرو۔ میں نہیں چاہتا کہ مرجینا یہاں سے چلی جائے۔''

لیکن وہ اپنا بیگ اٹھا کر وہاں سے ماموں کے گھر آ گئی۔ وہاں ڈرائنگ روم میں ماموں کے سامنے ایک قد آور نوجوان کھڑا ہوا تھا۔ اس کے ظاہری حلیے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ تعلیم یافتہ نوجوان ہے۔ ماموں نے مرجینا کو دیکھتے ہی کہا۔ ''آؤ بیٹی! ابھی تمہارا ہی ذکر ہو رہا تھا۔ یہ محبوب ہے ہمارے ہاں کام کرتا ہے۔''

مرجینا نے پہلے بھی اس کا نام سنا تھا لیکن اب نام کے ساتھ اسے دوبدو دیکھ کر دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ محبوب بھی اسے دیکھ کر متاثر ہو گیا۔ وہ اسے بڑی اپنائیت سے دیکھ رہا تھا۔ وہ اس سے نظریں چرا نے لگی۔ ممانی نے آ کر کہا۔ ''آؤ مرجینا! تم سے ضروری باتیں کرنی ہیں۔''

وہ ممانی کے ساتھ دوسرے کمرے میں آئی پھر بولی۔ ''ابھی چچا اور چچی نے مجھے محبوب کے بارے میں بہت کچھ کہا ہے۔ کیا آپ بھی یہی سب کچھ کہنا چاہتی ہیں؟''

''ہاں...... تم نے اسے دیکھا ہے، بتاؤ ہمارا انتخاب کیسا ہے؟ چراغ تو کیا سورج بھی لے کر ڈھونڈو گی تو ایسا خوبرو جیون ساتھی نہیں ملے گا۔''

اس نے دل میں تسلیم کیا کہ ممانی درست کہہ رہی ہیں۔ محبوب ایسا ہے کہ کسی بھی لڑکی کا

آئیڈیل بن سکتا ہے۔ ممانی نے کہا۔ ''تم اس کے ساتھ بہت خوش رہو گی کیونکہ یہ بالکل تنہا ہے۔ اتنی بڑی دنیا میں اس کا اپنا کوئی سگا نہیں ہے۔ یہ اپنی ساری توجہ ساری محبتیں تمہیں دیا کرے گا۔''

ممانی کی یہ بات دل کو لگ رہی تھی۔ وہ تو خود یہی چاہتی تھی کہ کوئی ایسا جیون ساتھی ہو جو اس کا اپنا ہو اور صرف اسے ہی اپنی تمام محبتیں دیتا رہے۔

وہ ممانی سے نظریں چراتے ہوئے بولی۔ ''میں اس رشتے سے انکار بھی کر سکتی ہوں اور اقرار بھی کر سکتی ہوں۔'' وہ ایک ذرا توقف سے بولی۔ ''چچا اور چچی جان نے اس رشتے کی بات کی تھی۔ میں نے محبوب کو دیکھا نہیں تھا اس لیے مجھے غصہ آ گیا۔ میں ان سے جھگڑا کر کے آئی ہوں لیکن اب جھگڑا نہیں کروں گی۔''

ممانی نے خوش ہو کر اسے دیکھا، وہ بولی۔ ''لیکن میں کوئی فیصلہ سنانے سے پہلے محبوب سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔''

''ہاں ہاں بیٹی! ضرور باتیں کرو۔ تم یہاں کمرے میں رہو میں اسے بھیجتی ہوں۔''

وہ کمرے سے چلی گئیں۔ تھوڑی دیر بعد محبوب کمرے کے دروازے پر آیا اور بولا۔ ''کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟''

مرجینا نے اسے دیکھا، جواب نہیں دیا سر جھکا لیا۔ وہ اندر آتے ہوئے بولا۔ ''میں خاموشی کو رضامندی سمجھ رہا ہوں۔ میرا نام محبوب احمد ہے۔ میں گریجویٹ ہوں، میں نے بی کام کیا ہے۔''

اس نے چونک کر اسے دیکھا اور پوچھا۔ ''تم گریجویٹ ہو اور یہاں ان کی غلامی کر رہے ہو؟''

''مجبوری ہے، کہیں ملازمت نہیں ملتی۔ مجھ سے بھی زیادہ تعلیم یافتہ لوگ نوکری کے لیے مارے مارے پھرتے ہیں۔ مجھے جو یہاں ملازمت ملی ہے، وہ بہتر ہے۔''

اس نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔ ''کیا ایک ہزار روپے ماہانہ میں تمہارا گزارہ ہو جاتا ہے؟''

''بے شک ہو جاتا ہے اس لیے کہ یہ میرا جیب خرچ ہے۔ باقی میں تینوں وقت ان کے یہاں کھاتا ہوں۔ مجھے پہننے کے لیے کپڑے بھی مل جاتے ہیں اور ضرورت کی دوسری چیزیں بھی مل جایا کرتی ہیں۔ خالی پیٹ اور خالی جیب رہنے سے تو یہ جاب بہتر ہے۔''

''غلام اپنی پسند سے اور اپنی مرضی سے زندگی نہیں گزار سکتا۔ انہوں نے تمہیں حکم دیا

کہ مجھ سے شادی کرو اور تم شادی کے لیے تیار ہو گئے۔''

''مجھے غلط نہ سمجھو، میں اپنے ذاتی معاملات میں آزاد ہوں۔ انہوں نے مجھے حکم نہیں دیا۔ سچ بات تو یہ ہے کہ میں تمہیں چھپ چھپ کر دیکھتا رہا ہوں اور دل ہی دل میں چاہتا رہا ہوں۔ کبھی حوصلہ ہی نہیں ہوا کہ تمہارے سامنے آ کر دل کی بات کہوں۔''

محبوب کی ان باتوں نے اسے مسرتوں سے مالا مال کر دیا۔ اس کی اہمیت بڑھا دی کہ وہ اسے چاہتا ہے، اس کی آرزو کرتا ہے۔ وہ یہی تو چاہتی تھی۔

وہ بولی۔''کیا شادی کے بعد بھی ہمارا یہی مستقبل ہوگا؟ میں گھر میں کنیز بنی رہوں گی اور تم باہر غلام بنے رہو گے۔ تم اپنی تعلیمی صلاحیتوں کے مطابق ترقی نہیں کرو گے اور نہ ہی ہماری آمدنی میں اضافہ ہوگا۔ ہماری کوئی بچت نہیں ہوگی، کوئی مکان نہیں ہوگا۔ ہم اپنی ایک الگ دنیا نہیں بسا سکیں گے؟''

وہ مسکرا کر بولا۔''ایک گھریلو عورت کو جتنی ذمے داریوں سے سوچنا چاہیے تم اسی طرح سوچ رہی ہو اور سمجھ رہی ہو۔ میں بھی خواب میں ایک شاندار کوٹھی دیکھتا ہوں۔ ایک مہنگی کار میں اپنی شریکِ حیات کے ساتھ گھومتا پھرتا ہوں۔ اپنے بے شمار ملازمین کے لیے لاکھوں روپے کا چیک لکھ کر اپنے منیجر کو دیتا ہوں۔''

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔''تمام خواب کبھی پورے نہیں ہوتے لیکن کچھ کی تعبیر مل سکتی ہے۔ اگر تدبیر کی جائے اور اس تدبیر پر عمل بھی کیا جائے۔''

''کیا تم جو تدبیر سوچتے ہو اس پر عمل کرتے ہو؟''

''میں تمہارے اس سوال کا جواب کیسے دوں؟ کچھ باتیں، کچھ راز ایسے ہوتے ہیں جو اپنوں کو بتائے جاتے ہیں۔ جب تم میری شریکِ حیات بن جاؤ گی تو میں تمہارے اس سوال کا جواب دوں گا۔''

''اور جب تک مجھے ایک بہترین مستقبل کی ضمانت نہیں ملے گی اس وقت تک میں اس گھر میں کنیز بن کر رہنے کے لیے شادی نہیں کروں گی۔''

''شادی کے لیے تمہارے مطالبات کیا ہیں؟''

''یہ میں کہہ چکی ہوں۔ ایک آزاد اور خودمختار زندگی، اس زندگی میں کوئی تیسرا مداخلت کرنے والا نہ ہو، کوئی حکم چلانے والا نہ ہو اور میرے جیون ساتھی کی کمائی کا ذریعہ آمدنی ایسا ہو کہ ہمارا مستقبل شاندار ہوتا چلا جائے۔''

''میں وعدہ کرتا ہوں، تم جو چاہتی ہو وہی ہوگا۔ میں تمہاری یہ تمام خواہشات پوری

کروں گا۔''

''میں تمہارے وعدے پر کیسے اعتبار کروں۔تم تو یہاں بہت ہی پستی میں رہ کر زندگی گزار رہے ہو؟''

''میں شادی سے پہلے تمہیں بتانا نہیں چاہتا تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں بتانا ہی ہوگا ورنہ تم راضی نہیں ہوگی، کیا میں امید کروں کہ تم ابھی سے اور اسی لمحے سے میری ہم راز بن کر رہوگی اور جو میں کہوں گا وہ بات اپنے بزرگوں سے نہیں کہوگی؟''

محبوب نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ وہ اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔''میں وعدہ کرتی ہوں، تمہاری ہم راز بن کر رہوں گی اور تمہاری کوئی بات کسی سے نہیں کہوں گی۔''

محبوب نے محتاط نظروں سے دروازے کی طرف دیکھا۔دروازہ بند تھا۔کوئی آس پاس سننے والا نہیں تھا۔اس نے دھیمی سرگوشی کے سے انداز میں کہا۔''میں جھکنے والوں میں سے نہیں ہوں لیکن زمین پر سونے کا سکہ پڑا ہو تو اسے اٹھانے کے لیے جھک جاتا ہوں۔اسی طرح یہاں تمہارے بزرگوں کے سامنے جھکا ہوا ہوں اور یہ جانتا ہوں کہ یہ کس طرح چور بازاری سے دولت کما رہے ہیں۔میں بھی کچھ چور راستے جانتا ہوں اور ان کا تابعدار بن کر کچھ مال کما رہا ہوں۔''

''کیا مال کماتے رہنے کے لیے ساری زندگی ہم ان کے غلام بن کر رہیں گے؟''

''نہیں...... ابھی تو میں ماہانہ پندرہ بیس ہزار روپے حاصل کر لیتا ہوں۔زیادہ حاصل کرنے کے لیے راستے بھی ہموار کر رہا ہوں۔ جب ہمارے پاس لاکھوں روپے ہو جائیں گے تو ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔''

مرجینا نے اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا پھر سر جھکا لیا۔وہ بولا۔''میں پہلے بے ایمان نہیں تھا لیکن میں نے بڑی بڑی ٹھوکریں کھائی ہیں۔میری بے روزگاری نے میری بیمار ماں کو اور بوڑھے باپ کو مار ڈالا تب میں نے فیصلہ کیا کہ پوری طرح ایمان دار بن کر رہنے سے میں بھی مر جاؤں گا۔زندہ رہنے کے لیے تھوڑی سی ایمانداری اور تھوڑی سی بے ایمانی ضروری ہے۔میں بالکل فرشتہ بن کر زندگی نہیں گزار سکتا لہٰذا آئندہ کبھی بے ایمانی کا موقع ملا تو بس اس حد تک بے ایمانی کروں گا کہ اپنے پیروں پر باوقار انداز میں کھڑا رہ سکوں اور زندگی کی تمام ضروریات پوری کر سکوں لہٰذا آج میں یہی کر رہا ہوں۔اپنی اصلیت بتا دینے کے بعد تم سے اتنا ہی چاہوں گا کہ مجھ سے نفرت نہ کرو، محبت کرو۔''

مرجینا نے اپنا دوسرا ہاتھ بھی اس کے ہاتھوں میں دے دیا۔

☆======☆======☆

ایک فطری خواہش کہ ہمیں کوئی چاہنے والا ملے تو وہ چاہنے والا مرجینا کو مل گیا۔ ان کی شادی ہو گئی۔ ایک مرد ہی ایک عورت کا بہت بڑا اور مضبوط سہارا ہوتا ہے۔ اس سہارے کی تلاش میں آنکھیں بند کر کے وہ احسان کی طرف جا رہی تھی۔ پہلے اس کی سہیلی رخسانہ نے اسے سمجھایا تھا لیکن اس کی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اب محبوب کو پا کر یہ تسلیم کر رہی تھی کہ کسی مرد کو قبول کرنے سے پہلے اسے اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔

اس نے زندگی میں پہلی بار جرأت کی تھی۔ ایک مرد سے تنہائی میں مل کر صاف صاف معاملات طے کیے تھے کہ وہ کیا کماتا ہے، کیا کھاتا ہے اور اپنی عورت کو کیا کھلائے گا؟ اور کیسے اس کا مستقبل سنوارے گا؟ یوں محاسبہ کر کے محبوب کی ایک کمزوری اس کے ہاتھ آ گئی تھی کہ وہ چور راستے سے بھی کچھ کما رہا ہے اور واقعی اس کا مستقبل سنوار سکتا ہے۔

محبوب نے اسے اپنا ہم مزاج اور ہم راز بنا کر اس کا اعتماد حاصل کیا تھا۔ شادی تو سب ہی لڑکیاں کرتی ہیں لیکن ایسا جیون ساتھی جو اپنی پسند، اپنے مزاج اور اپنی خواہش کے مطابق ہو صرف ذہین لڑکیاں ہی حاصل کر پاتی ہیں۔ وہ بہت خوش تھی پہلے سے زیادہ محنت سے چچا، ماموں، خالہ اور پھوپی کی خدمت کر رہی تھی۔

محبوب صبح چھ بجے ڈیوٹی پر جاتا تھا۔ پھوپی کے بچوں کو اسکول پہنچاتا تھا پھر خالہ کے گھر کا اوپری کام کرتا تھا۔ اس کے بعد دفتر کا وقت ہو جاتا تو چچا کے پاس چلا جاتا۔ وہاں کبھی چچا کے آفس میں، کبھی ماموں کے آفس میں ضرورت کے مطابق آتا جاتا رہتا۔ ان کا کام کرتا رہتا پھر شام کو گھر واپس آ جاتا تھا۔ مرجینا اگر پھوپی کے گھر رہتی تو وہ رات کو پھوپی کے گھر کھانا کھاتا تھا۔ اگر چچا کے گھر رہتی تو رات کا کھانا چچا کے گھر کھاتا تھا پھر وہ دونوں میاں بیوی اپنے دو کمروں کے مکان میں آ جاتے تھے۔ وہ بڑے پیار ومحبت سے ازدواجی زندگی گزار رہے تھے۔

وہ جب تک جاگتے رہتے پیار ومحبت کی باتیں کرتے رہتے اور اپنے بہتر مستقبل کے منصوبے بناتے رہتے تھے۔ محبوب ہر رات اسے کبھی سو اور کبھی دو سو اور کبھی ہزار کے نوٹ لا کر دیتا تھا اور اسے بتاتا تھا کہ وہ کس طرح ہیرا پھیری کر کے یہ رقم لاتا ہے۔ اگر اسی طرح آمدنی رہی تو ہر ماہ کبھی دس ہزار کبھی پندرہ ہزار ان کے پاس جمع ہوتے رہیں گے۔

اس نے ایک بینک میں مرجینا کا اکاؤنٹ کھولا تھا۔ وہاں وہ چور آمدنی یا بچت بچا کر

رکھتے تھے۔ محبوب نے شادی سے پہلے تیس ہزار کی بچت کی تھی۔ اب ہر ماہ دس پندرہ ہزار روپے کا اضافہ ہوتا تھا۔ چچی نے شادی کے دن اسے ایک پتلی سی چین دی تھی۔ ممانی نے ایک انگوٹھی پہنائی تھی۔ پھوپی نے کانوں کے دو چھوٹے بُندے بنوا دیئے تھے اور خالہ نے ایک چھوٹی سے نتھ پہنائی تھی۔ اس طرح اس کے پاس سونے کے معمولی سے زیور تھے۔ اس نے کبھی سونا نہیں پہنا تھا۔ اب جی چاہتا تھا پھوپی، ممانی اور خالہ کی طرح سونے سے لدی رہے۔

سونا پہن کر ہر عورت اپنے مرد کی کمائی پر فخر کرنا چاہتی ہے۔

وہ مجبور تھی۔ اپنے شوہر کی چور کمائی پر فخر نہیں کر سکتی تھی جبکہ چچا اور موموں وغیرہ کی بھی چور آمدنی تھی لیکن وہ بڑی حکمتِ عملی سے چور بچت کر رہے تھے۔ کوئی بھی ان پر انگلی نہیں اٹھا سکتا تھا۔

وہ بڑے صبر و تحمل سے اچھے دنوں کا انتظار کر رہی تھی۔ اگر محبوب کی آمدنی کا یہ سلسلہ رہتا تو وہ لوگ چند برسوں میں لاکھوں روپے جمع کر لیتے پھر وہ اس رقم سے کوئی کاروبار کر سکتا تھا۔ اسے سونے سے بھی لاد سکتا تھا اور اس کے لیے کار اور کوٹھی بھی خرید سکتا تھا۔ اچھے دنوں کے خواب دیکھنا اچھی بات ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حرام کی کمائی کبھی نہیں پھلتی لیکن بڑی بڑی کوٹھیوں والوں کو دیکھ کر یہ کہاوت جھوٹی پڑ جاتی ہے۔ نہ وہ قانونی گرفت میں آتے ہیں نہ ان پر آسمانی آفات نازل ہوتی ہیں۔

ہو سکتا ہے ایسے بڑے لوگ اندر ہی اندر کسی روحانی کرب میں مبتلا ہوں۔ کسی مسلسل بیماری کے عذاب میں رہتے ہوں اور ان کی کچھ ایسی پریشانیاں ہوں جو باہر سے نظر نہ آتی ہوں لیکن دولت کی چکاچوند دکھائی دیتی ہے کہ عالی شان کوٹھی ہے، مہنگی کاریں ہیں اور لاکھوں کروڑوں کا بینک بیلنس ہے۔

ایک روز مرجینا اپنی سہیلی رخسانہ سے ملنے گئی۔ اس نے بڑی گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا پھر کہا۔ ''شادی کے بعد تم گلاب کی طرح کھل گئی ہو، بہت خوش ہو، معلوم ہوتا ہے، میاں تم سے بہت محبت کرتا ہے۔''

''ہاں...... میں اپنے میاں پر جتنا فخر کروں کم ہے۔ وہ مجھے اپنی جان سے زیادہ چاہتے ہیں۔''

رخسانہ نے کہا۔ ''دیکھو...... اپنے بزرگوں پر بھروسا کرنے سے تمہیں کتنا بڑا انعام مل رہا ہے۔ اگر تم ان کی بات نہ مانتیں اور محبت میں اندھی ہو کر احسان کی طرف جاتیں تو ایسی

خوشیاں کبھی نصیب نہیں ہوتیں۔‘‘

’’میں مانتی ہوں، تم مجھے بہت اچھے مشورے دے رہی تھیں لیکن بہت بری لگ رہی تھیں۔ جذبات میں بہتے ہوئے ایسا لگ رہا تھا جیسے تم بھی میری دشمن ہوگئی ہو۔ میری بات کا برا نہ ماننا اب تو میں ساری دنیا سے کہہ سکتی ہوں کہ تم میری بہترین سہیلی ہو۔‘‘

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ’’میں نے سنا ہے کہ تمہارے میاں تمہارے چچا جان کے آفس میں کام کرتے ہیں۔‘‘

’’ہاں، کبھی چچا جان کے آفس میں اور کبھی ماموں جان کے آفس میں ان کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ وہاں پہنچ جاتے ہیں پھر صبح پھوپی کے بچوں کو اسکول پہنچاتے ہیں اور دوپہر کو اسکول سے گھر لے آتے ہیں خالہ کے گھر کا اوپری کام کرتے ہیں۔‘‘

رخسانہ حیرانی سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھ رہی تھی پھر بولی۔ ’’یہ کیسی ملازمت ہے؟ جب دو گھروں کے کام کرتے ہیں اور دو دفتروں کا کام کرتے ہیں تو پھر تنخواہ تو بہت زیادہ ہوگی؟‘‘

وہ بولی۔ ’’ہاں...... بہت زیادہ ہے انہیں ایک ہزار روپے ماہانہ ملتے ہیں۔‘‘

رخسانہ تقریباً چیخ کر بولی۔ ’’کیا......!‘‘

’’تم حیران ہو رہی ہو، مجھے بھی ایک ہزار روپے ملتے ہیں کیونکہ میں گھر کے اندر کے کام سنبھالتی ہوں اور میرے میاں گھر کے باہر کے تمام کام سنبھالتے ہیں۔ وہ ہمیں یہ دو ہزار اس لیے دیتے ہیں کہ اپنے گھر میں کھلاتے پلاتے ہیں اور کپڑے سلواتے ہیں۔ ہماری رہائش کے لیے انہوں نے دو کمروں کا مکان دے رکھا ہے۔‘‘

’’لیکن مرجینا! یہ تمہارے شوہر کی تعلیمی صلاحیتوں کے مطابق نہیں ہے یہ تو ایسا ہے جیسے گھر کا کوئی ملازم ہو جو باہر کا کام کر رہا ہو اور تم کنیز کی طرح چاروں گھروں میں کام کرتی ہو۔‘‘

مرجینا نے بڑے دکھ سے کہا۔ ’’تم کہا کرتی تھیں کہ بزرگوں پر بھروسا کرنا چاہیے۔ وہ میری بہتری کے لیے سوچتے ہیں۔ اب حقیقت تمہارے سامنے ہے۔ میرے ماں باپ ہوتے تو یہ بزرگ میرے ساتھ انصاف کرتے اور یہ میرے لیے قابل احترام ہوتے لیکن یہ سب خودغرض ہیں۔ احسان تو کیا کسی گھر سے بھی میرا اچھا رشتہ آتا تو یہ کبھی مجھے شادی کر کے دور نہ بھیجتے۔ انہوں نے اپنے ہی ایک ملازم سے میری شادی کروائی تاکہ شادی کے بعد میں بھی اسی گھر میں رہوں اور ان کا سارا کام ایک ملازمہ کی طرح کرتی رہوں۔‘‘

”یہ تو خودغرضی کی انتہا ہے، وہ چاہیں تو تمہارے شوہر کی تعلیمی صلاحیتوں کے مطابق ایک اچھی ملازمت ایک اچھا عہدہ دے سکتے ہیں۔“

”لیکن وہ ایسا نہیں کریں گے۔ ہمیشہ ہم میاں بیوی کو اپنے دباؤ میں رکھیں گے۔ وہ یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہمارے ملک میں بے روزگاری کینسر کی طرح پھیلی ہوئی ہے۔ بے شمار گریجویٹ ملازمت کے لیے مارے مارے پھرتے ہیں۔ اس بے روزگاری نے محبوب کو بری طرح کچل ڈالا تھا جسے پوری روٹی نہ ملے وہ آدھی روٹی پر گزارہ کر لیتا ہے۔ جسے آدھی بھی نہ ملے اور ایک لقمہ ملے تو وہ لقمہ بھی ڈوبتے کے لیے تنکے کا سہارا ہوتا ہے۔ ہمارا بھی یہی حال ہے ہم یہ ملازمت چھوڑ کر جائیں گے تو ٹوٹ جائیں گے۔“

رخسانہ اگرچہ اس کی راز دار سہیلی تھی لیکن اس نے اسے یہ نہیں بتایا کہ محبوب کی ایک چور آمدنی بھی ہے۔ وہ اپنے شوہر کی سبکی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ عزت بنائے رکھنے کے لیے شوہر کی ایمان داری کا بھرم رکھنا ضروری تھا۔

چند ماہ کے بعد ہی اس کے پاؤں بھاری ہو گئے۔ نو ماہ بعد وہ ماں بن گئی۔ اس نے ایک بیٹی کو جنم دیا۔ محبوب بہت خوش تھا۔ بیٹی کو چومتے ہوئے بولا۔ ”اس کا نام نورالعین رکھا جائے ہم اسے عینی کہہ کر پکارا کریں گے۔“

انہوں نے ایک سال کے بعد اپنی بچت کا حساب کیا تو ایک لاکھ چالیس ہزار روپے جمع ہو چکے تھے۔ مرجینا بہت خوش تھی۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کے پاس کبھی لاکھ روپے ہو سکتے ہیں۔ محبوب نے عینی کو چوم کر کہا۔ ”ہماری بیٹی خوش بخت ہے۔ یہ ہمیں لکھ پتی بنا رہی ہے۔ اللہ نے چاہا تو اگلے دو چار برس میں ہمارے پاس پانچ لاکھ روپے سے بھی زیادہ ہوں گے۔“

چار برس گزر گئے۔ ان کے پاس تقریباً چھ لاکھ روپے جمع ہو گئے تھے۔ وہ عینی کو اچھے سے اچھا مہنگا لباس پہناتے تھے۔ اس کی ساری خواہشات پوری کرتے تھے۔ جب وہ چار برس کی ہو گئی تو انہوں نے اسے انگلش میڈیم اسکول کی نرسری کلاس میں داخل کروایا۔ اس کے چچا، ماموں، خالہ اور پھوپی دیکھ رہے تھے کہ عینی کی پرورش بڑے شاہانہ انداز میں ہو رہی ہے۔ آخر یہ اتنی رقم کہاں سے لا کر خرچ کرتے ہیں۔

جب انہوں نے اسے نرسری کلاس میں داخل کیا تو پھوپی نے پوچھا۔ ”اتنے مہنگے اسکول میں کیسے پڑھاؤ گی؟ اس کی فیس اور دوسرے اخراجات کہاں سے پورے کرو گی؟“

مرجینا نے کہا۔ ”آپ مجھے ہر ماہ ایک ہزار روپے دیتی ہیں اور محبوب کو بھی ماہانہ ایک

ہزار روپے ملتے ہیں۔ ہم پچھلے پانچ برسوں سے یہ رقم جمع کرتے آ رہے ہیں۔ ہمارے پاس اتنا تو ہے کہ ہم اپنی بچی کو اچھا کھلا پلا سکتے ہیں، اچھا پڑھا لکھا سکتے ہیں۔''

چچا نے محبوب سے کہا۔''سنا ہے تمہاری بیٹی اسکول کی گاڑی میں آتی جاتی ہے اور اس گاڑی کے ماہانہ چھ سو روپے دیئے جاتے ہیں پھر فیس بھی مہنگی ہے۔ کتابیں بھی مہنگی ہیں۔ تقریباً ماہانہ ہزار روپے کا خرچ ہے۔ تم یہ خرچ کیسے برداشت کرو گے؟''

''آپ مجھے ہزار روپے دیتے ہیں۔ اسی میں گزارہ کر رہا ہوں۔ آپ سے یہ درخواست کرنا چاہتا ہوں کہ اب میری تنخواہ میں اضافہ کر دیں۔ بچی بڑی ہوتی رہے گی۔ اس کے اخراجات بڑھتے رہیں گے۔''

چچا نے ناگواری سے کہا۔''اتنے مہنگے اسکول میں پڑھانا ضروری تو نہیں ہے۔ اپنی اوقات میں رہ کر بچی کی پرورش کرو۔''

محبوب نے ان سے بحث نہ کی، خاموش رہا۔ وہ کاروباری ماحول میں رہتا تھا اور یہ دیکھتا رہتا تھا، سمجھتا رہتا تھا کہ آئندہ اس کے پاس لاکھوں روپے جمع ہو جائیں گے۔ تو وہ کیا کاروبار کرے گا؟ کچھ اس طرح کہ اس کی رقم کبھی نہ ڈوبے اور اچھا منافع بھی حاصل کرتا رہے۔

پانچ برس اور گزر گئے۔ پچھلے نو برسوں میں انہوں نے تقریباً پندرہ لاکھ روپے جمع کر لیے تھے۔ مرجینا نے کہا۔''اب مجھ سے صبر نہیں ہوتا۔ سونے کے زیور پہننے کے لیے میرا دل مچلتا رہتا ہے۔ اب میں اس عمر میں نہیں پہنوں گی تو کیا بوڑھی ہونے کے بعد پہنوں گی؟''

محبوب نے سمجھایا۔''تمہیں اپنی بیٹی کی خاطر صبر کرنا ہوگا۔ اپنے شوق کو مار لو ہمارے پاس جو رقم ہے پہلے وہ کاروبار میں لگائی جائے گی۔ اس سے جو منافع حاسل ہوگا اس سے ہم سب سے پہلے اپنا ایک چھوٹا سا مکان خریدیں گے۔ اتنے مہنگے شہر میں پہلے اپنا ایک مکان ہونا چاہیے۔''

وہ بڑے دکھ سے بولی۔''کیا مشکل ہے کہ میں کوئی قیمتی لباس بھی نہیں پہن سکتی۔ عینی آٹھ برس کی ہو چکی ہے۔ اس کے لیے میں اچھی سینڈلیں اور لباس وغیرہ خریدتی ہوں تو چچا، ماموں، پھوپی اور خالہ سب ہی سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہیں۔''

''اسی لیے تو سمجھاتا ہوں کہ محتاط رہو۔ وہ لوگ ہماری ٹوہ میں رہتے ہیں۔ وہ یہ تو جانتے ہیں کہ شادی کے بعد میں نے تمہارے لیے بینک میں ایک اکاؤنٹ کھولا تھا لیکن وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے کہ ماسی بن کر رہنے والی کے اکاؤنٹ میں لاکھوں روپے جمع ہو چکے ہیں اور یہ

کبھی انہیں معلوم نہیں ہونا چاہیے۔''

''آخر تم کب اپنا کاروبار شروع کرو گے؟''

''میں خود بے چین ہوں، کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ خوب سوچ سمجھ کر کسی کاروبار میں رقم لگاؤں گا۔ ذرا دو چار برس اور گزر جانے دو۔''

''بیٹی اگلے چھ سات برس میں جوان ہو جائے گی۔ ایسا کچھ کرو کہ اس کے جوان ہونے سے پہلے ہی ہم ایک اچھی عزت دار زندگی گزار سکیں تا کہ اچھے خاندانوں سے اس کے لیے رشتے آ سکیں۔''

''میں بیٹی کی خاطر ہی تمہیں محتاط رہنے کو کہتا ہوں۔ بیٹی کے لیے ایک مکان خریدیں گے۔ ایک اچھی اور عزت دار زندگی گزاریں گے۔ اس کے لیے تمہیں اپنی ذاتی خواہشات کو کچلنا ہوگا۔ مجھ سے وعدہ کرو کہ یہ رقم نہ تو میں اپنی ذات کے لیے خرچ کروں گا اور نہ ہی تم خرچ کرو گی۔ کبھی اپنے سائے سے بھی نہیں کہو گی کہ تمہارے پاس لاکھوں روپے جمع ہو چکے ہیں۔''

''میں اچھی طرح سمجھ گئی ہوں کہ یہ دنیا کتنی خود غرض ہے۔ جب میرے اپنے سگے مجھے خاک میں ملا کر رکھتے ہیں تو میں دوسروں سے کیا امید رکھوں۔ جب تک میری بیٹی اچھی طرح سمجھ دار نہیں ہو جائے گی میں اسے بھی نہیں بتاؤں گی کہ ہم کس طرح رقم جمع کر رہے ہیں۔ ویسے تم ان کی نوکری کیوں نہیں چھوڑ دیتے؟ اب تو تمہیں کسی دوسری جگہ بھی ملازمت مل سکتی ہے۔''

''مجھے کم از کم تین بڑی کمپنیوں سے اچھی آفرز مل رہی ہیں۔ کوئی چھ ہزار اور کوئی سات ہزار روپے ماہانہ تنخواہ دینا چاہتا ہے لیکن میں یہ ایک ہزار روپے کی جاب نہیں چھوڑوں گا۔ یہاں سے لاکھوں روپے کمانے کا جو چور دروازہ مجھے ملا ہے وہ شاید کہیں دوسری جگہ نہیں ملے گا۔''

ڈیڑھ برس کے بعد اچانک ہی بھید کھل گیا۔ چچا، ماموں، پھوپی اور خالہ نے ایک دن ان دونوں کو اپنے گھر بلوایا۔ وہاں ایک پولیس افسر بھی بیٹھا ہوا تھا۔ چچا نے گھور کر محبوب کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم بڑے ہی کمینے اور نمک حرام ہو۔''

محبوب نے کہا۔ ''پلیز...... آپ گالیاں نہ دیں۔ صاف اور سیدھی بات کریں۔''

''تم جس تھال میں کھاتے ہو اسی میں چھید کرتے ہو۔ تم میرے ہاں کام کرتے رہے اور چوری کرتے رہے۔ تم نے بڑی بڑی چوریاں کی ہیں۔ میرے پاس ثبوت ہیں۔''

”آپ کے پاس کیا ثبوت ہیں؟“

پولیس افسر نے ڈانٹ کے کہا۔”بکواس مت کرو۔ خاموش رہو۔ تم کوئی سوال نہیں کرو گے صرف جواب دو گے۔“

چچا نے اس پولیس افسر سے کہا۔”مجھے پچھلے کئی برسوں سے شبہ ہو رہا تھا کہ میری فیکٹری پروڈکشن میں کچھ گھپلا ہو رہا ہے۔ میری آمدنی میں کمی ہوتی جا رہی ہے۔“

ماموں نے کہا۔”میں نے بھی یہی محسوس کیا تھا کہ یہ میرے ساتھ بھی دغا بازی کر رہا ہے۔ ہم اس کی تاک میں رہنے لگے۔ یہ ہفتے دو ہفتے میں بینک جاتا رہتا ہے اور اپنی بیوی کے اکاؤنٹ میں رقم جمع کرتا رہتا ہے۔ بینک والوں نے ہمیں بتانے سے انکار کیا تھا اسی لیے ہم نے آپ کا تعاون حاصل کیا ہے۔ آپ نے انکوائری کی تو پتا چلا کہ اس کی بیوی کے اکاؤنٹ میں ستر لاکھ سات ہزار روپے اب تک جمع ہو چکے ہیں۔ اتنی رقم تو ہماری بیویوں کے اکاؤنٹ میں بھی نہیں ہے۔“

پولیس افسر نے محبوب سے کہا۔”تمہیں ماہانہ ایک ہزار ملتے ہیں اور تمہاری بیوی کو بھی ایک ہزار روپے دیئے جاتے ہیں۔ تمہاری آمدنی کا کوئی دوسرا ذریعہ بھی نہیں ہے پھر تمہاری بیوی کے اکاؤنٹ میں لاکھوں روپے کہاں سے آ گئے۔“

محبوب نے مسکرا کر کہا۔”اس چھوٹے سے سوال کا جواب دینے کے لیے ان لوگوں نے خواہ مخواہ آپ کو یہاں تک آنے کی زحمت دی ہے۔ میرے پاس وہ تمام پرائز بونڈز موجود ہیں جن سے میں پچھلے دس برسوں میں بھاری انعامات حاصل کرتا رہا ہوں۔“

اس نے مرجینا سے کہا۔”جاؤ اور گھر سے ان پرائز بونڈز کی فوٹو اسٹیٹ کاپی لے آؤ۔“

مرجینا وہاں سے چلی گئی۔ اس نے افسر سے کہا۔”میں قانون کا احترام کرتا ہوں۔ ان لوگوں کی طرح دو نمبری کام نہیں کرتا ہوں۔ مجھے آج سے آٹھ برس پہلے ایک بونڈ کے ذریعے تین لاکھ روپے ملے تھے، چھ برس پہلے دس لاکھ روپے ملے تھے اور اب دو برس پہلے مجھے پانچ لاکھ روپے ملے تھے۔ یہ سارے ثبوت میرے پاس موجود ہیں۔“

ماموں نے گرج کر کہا۔”تم جھوٹ بول رہے ہو۔ تمہارے پاس کوئی پرائز بونڈز نہیں تھے پھر کہاں سے آ گئے؟“

چچا نے کہا۔”میں یہ ہتھکنڈے اچھی طرح جانتا ہوں۔ انکم ٹیکس سے بچنے کے لیے بڑے بڑے بزنس مین انعام یافتہ بونڈز خرید لیتے ہیں اور انہیں اپنے کھاتے میں ڈال لیتے ہیں تا کہ انکم ٹیکس والوں کو دھوکا دے سکیں۔“

محبوب نے کہا۔ ''نہ ہی میں بزنس مین ہوں اور نہ ہی انکم ٹیکس کا کھاتہ رکھتا ہوں۔ ایسا فراڈ آپ لوگ ہی کرتے ہیں۔''

مرجینا پرائز بونڈز کی فوٹو کاپیاں لے آئی۔ محبوب نے ان سب کو افسر کے سامنے پیش کیا۔ افسر انہیں لے کر دیکھنے لگا۔ ان کے ساتھ ایک کاغذ پر پوری تفصیل درج تھی۔ یہ لکھا ہوا تھا کہ کس سال کے بونڈ سے کتنی رقم انعام کے طور پر حاصل کی گئی ہے۔

افسر نے وہ تمام بونڈز محبوب کو واپس کرتے ہوئے کہا۔ ''تم نے بڑا پکا کام کیا ہے۔ نہ تم پر چوری کا الزام لگایا جا سکتا ہے اور نہ ہی تمہیں حراست میں لیا جا سکتا ہے۔''

پھر افسر نے چچا اور ماموں کو دیکھ کر کہا۔ ''آپ نے مجھے خواہ مخواہ بلا کر میرا وقت ضائع کیا ہے۔ آپ کو چاہیے کہ پہلے محبوب کا محاسبہ کرتے۔ اس سے پوچھتے کہ اس نے اتنی رقم کہاں سے حاصل کی ہے؟''

وہ اٹھ کر جانے لگا۔ چچا اور ماموں اس کے پیچھے چلتے ہوئے بولے۔ ''یہ جھوٹا ہے بڑا بدمعاش ہے۔ اس نے چوری کی ہے؟''

وہ ڈانٹ کر بولا۔ ''شٹ اَپ...... پہلے آپ اسے چور ثابت کریں۔''

وہ ڈانٹ کر چلا گیا۔ چچا اور ماموں نے محبوب کو غصے سے دیکھا۔ وہ مسکرا کر بولا۔ ''غصہ تو مجھے آنا چاہیے تھا کہ مجھ پر جھوٹا الزام لگایا گیا۔ ایسا کرنے سے پہلے سمجھ لینا چاہیے تھا کہ الٹا جوتا سر پر پڑ سکتا ہے۔''

وہ گرج کر بولے۔ ''بکواس مت کرو، نکل جاؤ میرے گھر سے اور میرا وہ مکان بھی خالی کر دو۔''

''اتنی جلدی تو خالی نہیں کر سکتا۔ ایک ہفتے بعد خالی کر دوں گا۔ فی الحال تو...... نوکری پر تھوک کر جا رہا ہوں۔''

وہ مرجینا کا ہاتھ پکڑ کر ان کے ہاں سے نکل گیا۔ باہر آ کر اس سے بولا۔ ''تم گھر جا کر سامان باندھو، میں کرائے کا مکان تلاش کرنے جا رہا ہوں۔''

اس نے پوچھا۔ ''اب تو تم کاروبار شروع کرو گے؟''

''ابھی نہیں...... اگر میں نے کاروبار شروع کیا تو کاروبار کی رقم کھانے پینے اور پہننے اوڑھنے پر اور کرائے کے مکان پر خرچ ہو گی اور میں یہ نہیں چاہتا۔ مجھے کہیں نہ کہیں ملازمت مل جائے گی پھر ماہانہ تنخواہ سے گزارہ ہو گا۔ اس کے بعد میں ایک چھوٹے سے کاروبار کی ابتدا کروں گا۔''

وہ بہت سوچ سمجھ کر قدم اٹھانے کا عادی تھا۔ اس کی فطرت میں سچائی اور دیانت داری تھی لیکن حالات نے اسے اس قدر مجبور کر دیا تھا کہ وہ چچا اور ماموں جیسے لوگوں سے بے ایمانی کرنے لگا تھا۔ اس نے فراڈ کے ذریعے لاکھوں روپے جمع کیے تھے لیکن اب دل ہی دل میں توبہ کی تھی۔ اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر کہتا تھا کہ مجبوری کی حالت میں جو غلطی ہوگئی ہے اسے اس کا معبود معاف کر دے۔ وہ آئندہ ناجائز آمدنی پر لعنت کرتا رہے گا۔

وہ بہت قابل تھا۔ اگر چچا اور ماموں اس کی قابلیت سے فائدہ اٹھاتے اور اس کی صلاحیتوں کے مطابق اسے تنخواہ دیتے تو کم از کم دس ہزار روپے تنخواہ ضرور ملتی لیکن وہ سیدھی طرح اسے اتنی رقم نہیں دینا چاہتے تھے۔ اس لیے وہ چور راستے سے اپنی معقول تنخواہ وصول کرتا رہا۔

شریف اور ذہین افراد کو آدھی روٹی بھی دی جائے تو وہ گزارہ کر لیتے ہیں لیکن منہ سے لقمہ چھین لیا جائے تو پھر وہ چوری اور بے ایمانی پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ محبوب کو ایک کمپنی میں تیسرے دن ہی ملازمت مل گئی۔ ایک اچھے صاف ستھرے علاقے میں کرائے پر مکان بھی مل گیا۔ وہ مرجینا اور عینی کے ساتھ وہاں آ گیا۔ وہ پانچوں وقت کی نمازیں پڑھنے لگا تھا اور ہر نماز کے بعد صدق دل سے توبہ کرتا تھا۔ اللہ سے اپنے اس جرم کی معافی مانگتا تھا جسے وہ جبراً کرتا رہا تھا۔ ہر دعا کے آخر میں کہتا تھا۔ ''یا اللہ! جرم میں نے کیا ہے۔ مجھے سزا دے میری بیوی اور بیٹی کو اپنے قہر اور غضب سے محفوظ رکھ میرے مالک، آمین!''

کوئی بھی مجرم سزا سے نہیں بچ سکتا۔ سزا تو ضرور ملتی ہے۔ ایک ہفتے بعد ہی وہ کمپنی کی گاڑی میں کسی کام سے جا رہا تھا۔ وہ گاڑی حادثے سے دوچار ہوگئی اسے بری طرح چوٹیں آئیں۔ وہ لہولہان ہو گیا۔ فوراً ہی اسے اسپتال پہنچایا گیا۔ مرجینا کو خبر ملی تو وہ پریشان ہو کر عینی کے ساتھ اسپتال پہنچی۔ اس کی مرہم پٹی ہو چکی تھی لیکن ڈاکٹر مایوس تھے۔

مرجینا اس کے بیڈ کے قریب آئی تو وہ جیسے آخری سانسیں لے رہا تھا۔ اس نے اشارے سے قریب آنے کو کہا۔ وہ اس کے چہرے پر جھک گئی۔ اس کی سانسیں آہستہ آہستہ چل رہی تھیں۔ اس میں بولنے کی بھی سکت نہیں رہی تھی پھر بھی وہ بڑی مشکل سے کہہ رہا تھا۔ ''میرے بعد کسی مرد پر بھروسا نہ کرنا، کسی کو اپنی رقم نہ بتانا کسی کو بھی چند ہزار روپے دے کر آزماؤ گی تو اس کی اصلیت سامنے آ جائے گی۔ عینی تمہارے پاس میری امانت ہے، سب کچھ اس کے لئے ہے۔''

وہ آگے کچھ نہ کہہ سکا۔ بڑی مشکل سے رک رک کر اتنا بول رہا تھا پھر ایک دم سے چپ

ہو گیا۔ آنکھیں بند ہو گئیں۔ اس نے آواز دی۔ ''محبوب......!''

وہ خاموش رہا۔ اس نے اس کی ناک کے پاس ہاتھ رکھا۔ اس کے سینے کے اوپر سر رکھ کر دھڑکنیں سننے کی کوشش کی تو دھڑکنیں کچھ بولنے سے منکر تھیں۔ اس نے چیخ کر ڈاکٹر کو آواز دی۔ ایک نرس تیزی سے وہاں آئی پھر ڈاکٹر بھی چلا آیا۔ انہوں نے اس کی نبض دیکھی پھر مایوسی سے سر ہلایا۔

کوئی نہیں جانتا کس وقت، کس لمحے کی دعا قبول ہو جاتی ہے۔ اس کی دعا شرف قبولیت حاصل کر چکی تھی۔

☆======☆======☆

وہ اپنی بیٹی کے ساتھ تنہا رہ گئی۔ محبوب کے وجود کے بغیر گھر خالی ہو گیا تھا۔ اس نے کھڑکیاں اور دروازے اندر سے بند کر لیے۔ اپنی گیارہ سالہ بیٹی کو سمجھایا۔ ''عینی! میں یہاں عدت کے دن گزاروں گی۔''

عینی نے پوچھا۔ ''امی! یہ عدت کے دن کیا ہوتے ہیں؟''

''بیٹی، ایک بیوہ کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ شوہر کی وفات کے بعد چار ماہ دس دنوں تک کسی بھی غیر مرد کا منہ نہ دیکھے، کسی سے بات نہ کرے۔ یہاں صرف محلے پڑوس کی عورتیں آ کر مجھ سے مل سکتی ہیں۔ دودھ یا سبزی والے آئیں تو تم ضرورت کی چیزیں خرید لیا کرنا۔ تمہارا باپ کیا گیا ہے جسم سے جیسے جان نکل گئی ہے۔''

وہ عدت کے دن گزارنے لگی۔ تنہائی میں وہ بہت یاد آتا تھا اور اس کے پاس سوچنے اور فکر مند ہونے کے لیے بہت سی باتیں رہ گئی تھیں۔ سب سے بڑی فکر یہ تھی کہ اخراجات کیسے پورے ہوں گے؟

محبوب نے تاکید کی تھی کہ وہ لاکھوں روپے بیٹی کے لیے اور کاروبار کے لیے بچا کر رکھے جائیں۔ اگر ان میں سے گھریلو اخراجات کے لیے رقم نکالی جائے تو وہ رفتہ رفتہ کم ہوتی جائے گی۔ اگر آدمی کام نہ کرے اور بیٹھے بیٹھے کھاتا رہے تو قارون کا خزانہ بھی خالی ہو جاتا ہے اس لیے محبوب نے کاروبار شروع کرنے سے پہلے دوسری ملازمت حاصل کر لی تھی تاکہ ماہانہ تنخواہ سے گزارہ ہوتا رہے اور کاروبار والی رقم محفوظ رہے۔

اب عقل اسے سمجھا رہی تھی کہ اسے اپنے محبوب کے طریقہ کار پر عمل کرنا ہوگا۔ تب ہی گزارہ ہوگا۔ اسے بینک والی رقم کو ہاتھ بھی نہیں لگانا چاہیے۔ عدت کے دن گھر میں بیٹھ کر گزارنے کے لیے فی الحال آٹھ ہزار روپے تھے اور یہ ان ماں بیٹی کے لیے کافی تھے۔

تنہائی میں محبوب کی آخری باتیں یاد آتی تھیں۔ اسے یوں لگتا تھا جیسے اب بھی وہ سرگوشی کر رہا ہے۔ ''مرجینا! کسی مرد پر بھروسا نہ کرنا۔ اپنی رقم کا ذکر کسی سے نہ کرنا، کسی کو چند ہزار روپے دے کر آزماؤ گی تو اس کی اصلیت سامنے آجائے گی۔''

مرجینا کو اس کی بہت سی باتیں یاد آتی تھیں۔ اس کا لب ولہجہ، اس کی ہنسی، اس کے چلنے پھرنے کا انداز، اس کے طور طریقے اور پھر اس کا پچھتاوا یاد آتا تھا۔ وہ سر جھکا کر کہتا تھا۔ ''میں دھوکے سے رقم حاصل کر رہا ہوں، یہ اچھا نہیں کر رہا ہوں۔ اگرچہ میں چوروں کے گھر چوری کر رہا ہوں پھر بھی یہ چوری ہے۔ میری یہ حرکت ناقابلِ معافی ہے۔''

مرجینا کو اس کی شرمندگی یاد آتی تو وہ ہاتھ اٹھا کر اس کی مغفرت کے لیے دعائیں مانگنے لگتی تھی۔ وہ اسے بہت کچھ دے کر گیا تھا لیکن وہ اس کے لیے صرف دعائیں ہی مانگ سکتی تھی۔ یا پھر اس کی آخری نصیحتوں پر عمل کر کے اس کی روح کو سکون پہنچا سکتی تھی۔ محلے پڑوس کی عورتیں اس سے ملنے آتیں، اس کی خیریت پوچھتی تھیں۔ وہ ان سے کہتی تھی۔ ''اب میرا کوئی سہارا نہیں رہا۔ مجھے زندگی گزارنے کے لیے خود محنت کرنی ہوگی۔ آپ لوگوں سے گزارش ہے کہ جو بچے ٹیوشن پڑھنا چاہتے ہیں انہیں میرے پاس بھیج دیں۔ میں نے بارہ جماعتیں پاس کی ہیں، دسویں جماعت کے بچوں کو بھی تمام مضامین پڑھا سکتی ہوں۔''

عدت کے ایام پورے ہوتے ہی محلے کے بچے اس کے پاس پڑھنے کے لیے آنے لگے۔ پہلے دو چار بچے تھے پھر دس بارہ ہوئے پھر بیس پچیس آنے لگے۔ قریبی علاقے کے ایک اسکول میں اسے ملازمت بھی مل گئی۔ کسی حد تک فکر روزگار سے نجات حاصل ہوگئی۔ اتنی آمدنی ہونے لگی کہ وہ ماں بیٹی مکان کا کرایہ دے کر تین وقت کا کھانا کھانے لگیں۔ عزت آبرو سے گزارہ کرنے لگیں۔

ویسے زندگی اتنی آسان اور سہولت سے نہیں گزرتی کچھ نہ کچھ مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ خاص طور پر عزت سے زندگی گزارنے کے لیے بڑی آزمائش سے گزرنا پڑتا ہے۔ اگر عورت بھرپور صحت مند ہو اور بھری جوانی میں بیوہ ہو جائے تو اس کا بدن دور سے پکارنے لگتا ہے۔ مرد للچاتے ہوئے سوچتے ہیں کہ بے چاری ایک مرد سے محروم ہوگئی ہے اس کی محرومی ہمی دور کر سکتے ہیں۔ شاید یہ ہم پر مہربان ہو جائے۔

اس نے اسکول آتے جاتے وقت محسوس کیا کہ کچھ لوگ اسے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگے ہیں۔ وہ پھر چادر لپیٹ کر باہر نکلنے لگی۔ اپنے آپ کو اچھی طرح چھپانے لگی۔ بڑی مشکل یہ ہے کہ مرد حضرات کو کسی کل چین نہیں آتا ہے کچھ چھپاؤ تو تجسس پیدا ہوتا ہے کہ کیا

چھپایا جا رہا ہے۔ بے پردہ عورتوں کو تو دیکھا ہی جاتا ہے لیکن پردہ دار عورتوں کو اور زیادہ توجہ اور تجسس سے دریافت کرنے کے لیے دیکھا جاتا ہے۔

عورت کی اپنی عزت اپنے ہاتھ میں ہوتی ہے یا پھر مجازی خدا اس کا محافظ ہوتا ہے۔ للچائی ہوئی نظروں نے اسے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ وہ کمزور ہے۔ ایک محافظ کے بغیر پہاڑ جیسی زندگی نہیں گزار سکے گی۔ کسی سبزی والے یا پرچون والے سے بھی باتیں کرے گی تو اس پر شبہ کیا جائے گا۔ ایک حمایت کرنے والا مرد ہو تو بدنام کرنے والی تمام زبانیں چپ ہو جاتی ہیں۔

وہ صبح سات بجے اسکول پڑھانے کے لیے دوسرے علاقے میں جاتی تھی۔ اس علاقے کے ایک بس اسٹاپ پر اچانک ہی احسان سے سامنا ہو گیا۔ وہ اسے دیکھتے ہی بڑی محبت سے بولا۔ ''مرجینا! تم...... تم کہاں تھیں......؟ میرا خیال ہے کوئی گیارہ یا بارہ برس کے بعد دکھائی دے رہی ہو؟''

''ہاں...... بارہ برس گزر چکے ہیں۔''

''مجھے معلوم ہوا کہ تم بیوہ ہو چکی ہو۔ یہ خبر ملنے کے بعد میں نے تمہیں بہت تلاش کیا۔ تم کہاں رہتی ہو؟''

''جہاں بھی ہوں اپنی بیٹی کے ساتھ عزت آبرو کے ساتھ رہتی ہوں۔''

''کیا تم نے دوسری شادی کر لی ہے؟''

اس نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔ ''دوسری شادی آسان نہیں ہوتی ہے۔ بہت سوچنا پڑتا ہے۔ سمجھنا پڑتا ہے کہ پہلے جیون ساتھی جیسا کوئی ملے گا یا نہیں؟''

''اعتماد کرنا سیکھو تو ضرور ملے گا۔ مجھے تم سے شکایت ہے۔ تم نے مجھے اپنی سچائی اور ایمانداری ثابت کرنے کا موقع نہیں دیا۔ پتا نہیں کیوں اچانک مجھ سے بدظن ہو گئیں؟ اور کسی دوسرے سے شادی کر لی۔ تم نے میرے پیار کو ٹھکرا دیا مجھ سے بے وفائی کی۔''

''مجھے الزام نہ دو، میں نے تمہیں موقع دیا تھا۔ تمہارا فرض تھا کہ تم میرے بزرگوں کو مطمئن کرتے، اپنی سچائی اور ایمان داری کا یقین دلاتے لیکن تم نے ایسا کچھ نہیں کیا تھا۔''

''تمہارے بزرگوں کو پتا نہیں مجھ سے کیا عداوت تھی۔ خواہ مخواہ مجھے جھوٹا اور بے ایمان ثابت کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ انہوں نے تمہیں بہکایا ہے۔''

اس کی بات نے مرجینا کو سوچنے پر مجبور کیا کہ اس کے بزرگ واقعی اس کے دشمن تھے۔ احسان سے دور کر کے محبوب سے اس لیے شادی کرانا چاہتے تھے کہ وہ گھر سے باہر ان کا غلام

بن کر رہے گا۔ یہ تو اس کی خوش قسمتی تھی کہ محبوب نے اندر ہی اندر غلامی کی زنجیریں توڑ دیں تھیں اور بڑی رازداری سے اس کے لیے لاکھوں روپے کما تا رہا تھا۔

مرجینا نے احسان کو ہمدردی سے دیکھا۔ سوچا کہ اس کے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے وہ بولا ''میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں۔ تم اس بات سے اندازہ لگا سکتی ہو کہ میں نے اب تک شادی نہیں کی ہے۔ تمہارے بعد کوئی لڑکی مجھے متاثر نہ کر سکی اور نہ کرے گی۔''

مرجینا نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔ بس آ رہی تھی، وہ ادھر دیکھتے ہوئے بولی۔ ''بس آ گئی ہے مجھے جانا ہے۔''

وہ عاجزی سے بولا۔ ''رک جاؤ اسے جانے دو۔ دوسری بس آ جائے گی۔''

بس آئی ذرا رکی کچھ مسافر اُترے کچھ سوار ہوئے پھر وہ چلی گئی۔ مرجینا کے پیروں میں اَن دیکھی زنجیریں پڑ گئی تھیں وہ نہ جا سکی۔ احسان نے پوچھا۔ ''کیا اب بھی مجھ پر اعتماد نہیں کرو گی؟ کیا پہلے والی بے اعتمادی قائم ہے؟''

مرجینا نے انکار میں سر ہلایا۔ وہ خوش ہو کر بولا۔ ''خدا کا شکر ہے کہ اتنے برسوں کے بعد مجھ پر اعتماد کر رہی ہو۔ کیا مجھ سے شادی کرو گی؟''

اس اچانک سوال نے اسے گڑبڑا دیا۔ وہ بے اختیار بولی۔ ''ہاں......ناں......نہیں میں......میرا مطلب ہے راستہ چلتے کیسی باتیں کر رہے ہو؟''

''تمہیں دیکھ کر بھول گیا ہوں کہ یہ راستہ ہے۔ منزل سمجھ کر پوچھ رہا ہوں، بولو تو گھر آ کر تمہارا ہاتھ مانگوں۔''

وہ خاموش رہی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے جواب کیا دینا چاہیے۔ اگر وہ قبول ہے تو بھی اتنی جلدی ہاں نہیں کہنا چاہیے خوب سوچنا سمجھنا چاہیے۔ بیٹی گیارہ برس کی ہو چکی تھی۔ اچھی خاصی سمجھدار تھی۔ بات بات پر سوالات کرتی تھی۔ ''یہ کیا ہے؟ یہ کیوں ہے؟ آپ دو بجے اسکول سے واپس آ جاتی ہیں۔ آج تین کیوں بج گئے؟ آپ اکیلی بیٹھی کیا سوچتی رہتی ہیں؟ کیا ابو یاد آتے ہیں؟''

دوسری شادی کرنے سے پہلے اب بیٹی کے بارے میں سوچنا ضروری ہو گیا تھا۔ پتا نہیں وہ کسی دوسرے کو ایک باپ کی حیثیت سے اپنی ماں کے قریب دیکھنا پسند کرے گی یا نہیں؟ ابھی کچا ذہن ہے شاید وہ باپ کی جگہ کسی کو نہ دینا چاہے۔

وہ بولا۔ ''تم نے کوئی جواب نہیں دیا، کیا سوچ رہی ہو؟''

''میں اتنی جلدی جواب نہیں دے سکتی پھر کسی دن ملیں گے۔''

''کسی دن کیوں، آج کیوں نہیں؟ کیا اب بھی تم بزرگوں کے دباؤ میں ہو؟ کیا اب بھی تمہارے راستے میں کوئی رکاوٹ ہے؟''

''کوئی رکاوٹ نہیں ہے، میں خود مختار ہوں۔ اس کے باوجود اس اہم معاملے پر غور کرنا ضروری ہے۔''

''ٹھیک ہے، تم غور کرو۔ مجھے اپنے گھر کا پتا بتاؤ۔ میں کسی آ جاؤں گا۔''

''نہیں...... میں نہیں چاہتی کہ تم میرے گھر آؤ۔ میں بیوہ ہوں تم میرے گھر آؤ گے تو لوگ باتیں بنائیں گے۔ میں کسی طرح کی بدنامی نہیں چاہتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے، میں تمہیں بدنام نہیں کروں گا۔ تم کل یہیں مل سکتی ہو؟''

وہ پھر سوچنے لگی وہ بولا۔ ''پہلے تو تم اتنا نہیں سوچتی تھیں۔ مجھ پر اندھا اعتماد کرتی تھیں۔''

''حالات نے مجھے سوچنا اور سمجھنا سکھا دیا ہے۔ ٹھیک ہے کل میں اسی وقت یہاں ملوں گی۔''

وہ خوش ہو کر بولا۔ ''تھینک یو...... میں کل اسی وقت تمہارا یہاں انتظار کروں گا۔ ویسے تم نے بتایا نہیں کہ تم کیا کرتی ہو؟ تمہارا گزارہ کیسے ہوتا ہے۔''

اس نے سوچتی ہوئی نظروں سے احسان کو دیکھا۔ اس وقت اس کے کانوں میں ایک سرگوشی گونج رہی تھی۔ ''کبھی کسی مرد پر بھروسا نہ کرنا۔''

اس نے کہا۔ ''تم نے بارہ جماعتیں پاس کی ہیں کیا کہیں ملازمت کر رہی ہو؟''

وہ انکار میں سر ہلا کر بولی۔ ''ملازمت کہاں ملتی ہے پھر ہم عورتوں کا ملازمت کرنا گویا کہ اپنی عزت کو داؤ پر لگانا ہے جسے دیکھو بری نیت سے دیکھتا ہے اور بری نیت سے ہی ملازمت دیتا ہے۔''

وہ تائید میں سر ہلا کر بولا۔ ''ہاں...... یہ تو ہے پھر تم کیا کر رہی ہو؟ تینوں وقت پیٹ بھرنے کے لیے کچھ تو کرنا ہوتا ہے۔''

''ہاں...... یہی تو مجبوری ہے پھر بیٹی ساتھ ہے۔ اس کی خاطر گھر گھر جاتی ہوں اور ماسی کا کام کرتی ہوں۔ دو بچوں کو ٹیوشن بھی پڑھاتی ہوں مگر پھر بھی گزارہ نہیں ہوتا۔ سچ تو یہ ہے کہ مرد کے سہارے کے بغیر زندگی نہیں گزرتی ہے۔''

''پھر تو تم میرے ہی حق میں فیصلہ کرو گی اور آج نہیں تو کل شادی کے لئے راضی ہو جاؤ گی۔''

''میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتی۔''

بس آ گئی تھی۔ وہ فوراً اس میں سوار ہوگئی' عورتوں کی بھیڑ میں گم ہو کر وہاں سے چلی گئی۔ اسے عین وقت پر اپنے محبوب کی بات یاد آ گئی تھی کہ۔ ''کسی مرد پر بھروسہ نہ کرنا' کسی کو چند ہزار روپے دے کر آزماؤ گی تو جلد ہی اس کی اصلیت سامنے آ جائے گی۔''

وہ اسے چند ہزار روپے نہیں دے رہی تھی۔ اس سے جھوٹ بول کر یہ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ اس کے ساتھ اس کی بیٹی کا بھی بوجھ اٹھا سکتا ہے یا نہیں؟ اس نے پلٹ کر یہ نہیں پوچھا تھا کہ وہ کیا کرتا ہے؟ کوئی ملازمت کر رہا ہے یا نہیں؟ اسے پوچھنا چاہیے تھا لیکن دوسری شادی کی پیش کش نے اسے بدحواس کر دیا تھا۔

وہ گھر پہنچی تو بیٹی نے دروازہ کھولا۔ وہ اسے دیکھ کر پریشان ہوگئی۔ اگر چہ وہ اس کی بیٹی تھی۔ وہ اس کی ہر بات مانتی تھی۔ یہ معاملہ ایسا تھا کہ وہ بیٹی کو دیکھ کر دروازے پر ہی ہچکچانے لگی تھی۔ بچہ ہو یا جوان، وہ دوسری ماں کو برداشت کر لیتا ہے لیکن کسی دوسرے کو باپ نہیں کہتا۔ کسی غیر کو باپ کہنے سے ماں کو گالی پڑتی ہے۔

اس نے اندر آ کر پوچھا۔ ''تم نے کھانا کھا لیا؟''

''نہیں، آپ کا انتظار کر رہی تھی۔''

''دوپہر کے تین بجنے والے ہیں، تمہیں کھا لینا چاہیے تھا۔''

''یہی تو پوچھنا چاہتی ہوں دوپہر کے تین بج رہے ہیں اور آپ اب اسکول سے آ رہی ہیں؟''

''میں نے کتنی بار سمجھایا ہے کہ دادی اماں نہ بنو۔ آنے جانے میں دیر تو ہو ہی جاتی ہے۔ میں منہ ہاتھ دھو رہی ہوں۔ کھانا گرم کرو۔''

اس نے اپنے کمرے میں آ کر پرس کو ایک طرف رکھا پھر واش روم میں چلی گئی۔ جب واپس آئی تو کھانا گرم ہو چکا تھا اور ٹیبل پر رکھا ہوا تھا۔ وہ میز لکھنے پڑھنے کے لیے تھی لیکن ضرورت کے وقت اسے ڈائننگ ٹیبل بنا لیا جاتا تھا۔

دونوں ماں بیٹی اس میز کے اطراف آمنے سامنے بیٹھ گئیں۔ اس نے کھانا شروع کرتے ہوئے سوچا۔ ''بات کیسے شروع کی جائے؟ کسی کو صرف شوہر بنانے کا معاملہ ہوتا تو کوئی بات نہ تھی لیکن یہاں ایک نمبر مرد کو بیٹی کا باپ بنانا تھا اور وہ بیٹی جیسے کوئی بوڑھی لگ رہی تھی اس کے سامنے بولتے ہوئے ہچکچاہٹ محسوس ہو رہی تھی۔

وہ لقمہ چباتے ہوئے بولی۔ ''تم رات کو بہت گہری نیند سوتی ہو۔ تمہیں پتا نہیں کبھی کبھی

ہمارے دروازے اور کھڑکیوں پر پتھر آ کر لگتے ہیں۔''

وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔''جانتی ہوں، جس گھر میں بیری کا درخت ہوتا ہے وہاں پتھر آتے ہی ہیں لیکن امی ابھی تو میں جوان نہیں ہوئی ہوں۔''

مرجینا نے اسے گھور کر دیکھا۔ آج کل کے بچے جسمانی طور پر جوان ہو یا نہ ہوں لیکن ذہنی طور پر بالغ ہو جاتے ہیں۔ کیبل کے ذریعے دیکھی جانے والی بھارتی فلمیں ان بچوں کو عمر سے پہلے بڑا بنا دیتی ہیں۔

''بے شک تم بچی ہو مگر میں تو جوان ہوں۔''

وہ حیرانی سے بولی۔''لیکن آپ تو امی ہیں کیا لوگ ماں کو بھی پتھر مارتے ہیں؟''

''ہاں..... ایک ماں کا تقدس تمہارے لیے ہے لیکن باہر والے صرف ماں کی جوانی دیکھتے ہیں۔ جب تک تمہارے ابو زندہ رہے ایک بھی پتھر نہیں آتا تھا۔ اب تو ہلکی سی آہٹ بھی ہوتی ہے یا ہوا سے دروازہ ہلتا ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے بدنامی دستک دے رہی ہے۔''

'کیا جس گھر میں کسی کے ابو نہیں ہوتے وہاں ایسا ہی ہوتا ہے؟''

''جس گھر میں بھی سرپرست نہیں ہوتا اور وہاں ماں جوان ہو یا بیٹی جوان ہو تو وہاں ایسی ہی دہشت گردی ہوتی ہے۔ یہ دہشت گردی کرنے والے ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کرتے ہیں کہ جوان عورت ایک مرد کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ ہمارے گھر میں بھی ایک مرد کی موجودگی ضروری ہے۔''

یہ کہہ کر اس نے اپنی بیٹی کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ سر جھکائے سوچ رہی تھی پھر بولی۔''نائٹ چوکیدار محلے میں گشت کرتا رہتا ہے۔ ہم اسے کہیں گے کہ وہ زیادہ سے زیادہ ہمارے دروازے پر رہا کرے۔''

'کوئی صرف دروازے پر رہ کر چوکیداری کرے تو بات نہیں بنتی۔ میں یہاں سے دور دوسرے علاقے کے اسکول میں جاتی ہوں۔ دوسری ضرورتوں کے لیے محلے پڑوس اور دکانوں پر جانا پڑتا ہے۔ ایسے وقت کوئی پتھر نہیں مارتا۔ فقروں کے تیر چلاتا ہے۔ جہاں جاؤ للچائی ہوئی نظریں دکھائی دیتی ہیں۔ جب تمہارے ابو زندہ تھے تب کوئی نہیں چھیڑتا تھا۔ جب کسی جوان عورت کے جملہ حقوق کسی ایک مرد کو مل جائیں تو دوسرے تمام مرد صبر کر کے بیٹھ جاتے ہیں۔''

''ابو تو واپس نہیں آسکتے، اب کیا ہوگا؟''

''دوسرے ابو تو آسکتے ہیں؟''

”کیا......؟“

اس نے چونک کر پوچھا۔”دوسرے ابو کیسے آسکتے ہیں؟ کیا آپ شادی کریں گی؟“

وہ نظریں جھکا کر بولی۔”مجبوری ہے......شادی کرنا ہوگی۔ ورنہ ہمارے سر ننگے رہیں گے ہم محفوظ نہیں رہیں گے۔ ایک مرد کی موجودگی ہمارے اندر بڑا حوصلہ اور اعتماد پیدا کرے گی۔“

”کیا وہ مجھے پیار کرے گا؟“

”ہاں ضرور کرے گا، تمہارے ابو کی طرح کرے گا۔ میں اس سے کہوں گی تو وہ ابو سے بھی زیادہ پیار کرے گا۔“

وہ خوش ہو کر بولی۔”پھر تو بڑا مزہ آئے گا۔ آپ ابھی شادی کرلیں۔“

مرجینا نے اطمینان کی ایک گہری سانس لی۔ اس نے بیٹی کو پہاڑ سمجھ لیا تھا لیکن وہ موم کا پہاڑ تھی، پگھل رہی تھی۔ ایک باپ کی یا ایک بزرگ کی محبت چاہتی تھی۔ ماں کو اپنا قدم اٹھانے کا راستہ دے رہی تھی۔

اب آگے سوچنے کے لیے بہت کچھ تھا اور کچھ مسائل تھے کیونکہ احسان کے ساتھ اس کی ماں اور بہن تھی۔ وہ عینی کو احسان کی بیٹی کہنے والی تھیں۔ کیا وہ عورتیں اس بچی کو بھرپور پیار دے سکیں گی؟

اس گھر میں وہ ایک کمانے والا تھا۔ اس کی کمائی ماں اور بہن کے لیے بھی تھی۔ کیا سوتیلی بیٹی کے لیے بھی ہوگی؟

ایک گھر میں صرف ایک کمانے والا فرد ہو تو اس کی کمائی تقسیم ہوتے وقت فساد برپا کرتی ہے۔ ماں اپنا حق سمجھتی ہے اور بیوی اپنا۔ ایسے میں سوتیلی بیٹی کو کوئی نہیں پوچھتا۔ اسے تو ایک ساتھی کی ضرورت تھی۔ وہ ساتھی اسے دن رات مل سکتا تھا۔ مسئلہ بیٹی کا تھا کہ اسے باپ کا پیار اور بیٹی کے حقوق ملتے بھی ہیں یا نہیں؟

وہ شام چھ بجے سے نو بجے تک بچوں کو ٹیوشن پڑھاتی تھی۔ انہیں پڑھاتے رہنے کے دوران میں اپنے معاملات میں الجھتی رہی طرح طرح کے وسوسے جنم لیتے رہے اور اس کے اندر یہ چور خوشیاں بھی تھیں کہ اس کی زندگی میں ایک چاہنے والا پھر آرہا ہے۔

رات نو بجے پڑوسن خالہ اپنے بچے کو لینے آئیں تو اس نے کہا۔”خالہ! آپ سے ایک ضروری بات کرنا چاہتی ہوں۔“

”ہاں، بولو بیٹی کیا بات ہے؟“

وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ ''بات یہ ہے خالہ! میں جس محلے میں پہلے رہتی تھی وہاں میرے کچھ جان پہچان والے ہیں۔ وہاں ایک خاتون چاہتی ہیں کہ میں ان کی بہو بن جاؤں۔''

خالہ نے خوش ہو کر کہا۔ ''بیٹی! یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ کب تک ایسی پہاڑ جیسی زندگی تنہا گزارو گی پھر ایک بیٹی بھی ہے دیکھتے ہی دیکھتے جوان ہو گی اس کی ذمے داریاں پوری کرنے کے لیے بھی تمہیں ایک جیون ساتھی کی ضرورت ہے۔''

خالہ اسے دعائیں دیتے ہوئے اپنے بچے کو لے کر چلی گئیں۔ ان کی باتوں نے اسے بڑا حوصلہ دیا۔ دوسری شادی کرنے کے سلسلے میں کوئی رکاوٹ نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ رات کو بستر پر آئی تو عینی سو گئی تھی۔ ایسے ہی وقت وہ تنہائی محسوس کرتی تھی۔ رات کاٹے نہیں کٹتی تھی۔ لائٹ آف کرنے کے بعد تاریکی ہی تاریکی رہتی تھی۔ بستر پر کوئی اور نہیں رہتا تھا۔

وہ گھپ اندھیرے میں لیٹی ہوئی تھی۔ سوچ رہی تھی، ذہن اِدھر سے اُدھر بھٹک رہا تھا۔ کبھی محبوب کی طرف، کبھی احسان کی طرف۔ پہلے تو ایسے لگا جیسے محبوب سرگوشیاں کر رہا ہے پھر محسوس ہوا کہ احسان بول رہا ہے۔ اس کے دل اور دماغ پر دستک دے رہا ہے۔ دروازہ کھولنے کو کہہ رہا ہے۔ اندر آنا چاہتا ہے۔

دل میں پھر سے گدگدی ہو رہی تھی۔ اسے محبوب کی دھیمی سی سرگوشی سنائی دی۔ ''مرجینا! دوسرا مرد کبھی پہلے مرد جیسا نہیں ہوتا۔ وہ دوسرا مرد زیادہ سے زیادہ تمہاری جوانی کا بوجھ اٹھائے گا اور دوسرے مسائل حل کرنے سے کتراتا رہے گا لہٰذا میری آخری نصیحتیں یاد رکھنا، کسی پر بھروسا نہ کرنا۔ اپنی بچائی ہوئی رقم کا ذکر کبھی اس سے نہ کرنا۔ اگر اسے آزمانا ہو تو صرف چند ہزار روپے دینا پھر اس کی اصلیت تمہارے سامنے آ جائے گی۔''

وہ کروٹ بدل کر دوسری طرف رہ گئی۔ دوسری طرف اسے احسان کی سرگوشی سنائی دی۔ ''مرجینا! میں تمہارا پہلا عاشق ہوں۔ شوہر وہ محبت نہیں دے سکتا جو پہلی بار ایک عاشق سے ملتی ہے۔ میں جیسا بھی ہوں، پہلے والے سے کم تر ہوں یا برتر ہوں جیسا بھی ہوں تمہارا دیوانہ ہوں۔ تمہیں ہمیشہ اپنی دھڑکنوں میں بسائے رکھوں گا۔ مجھ پر اعتماد کرتی رہنا۔ مجھ سے اپنی کوئی بات نہ چھپانا۔ تمہارے پاس کچھ ہو تو میرے سامنے رکھ دینا۔ میں سو کے ہزار بناؤں گا۔ تمہیں خوب کما کر دیا کروں گا۔''

برسوں سے بینک میں رقم پڑی ہوئی تھی، کسی کام میں نہیں آ رہی تھی۔ ذہن کام نہیں کرتا تھا کہ اسے کس طرح استعمال کیا جائے۔ کس کاروبار میں لگایا جائے۔ دل ڈرتا تھا کہ کہیں بھی

رقم لگائی جائے گی تو ناتجربہ کاری کے باعث ڈوب جائے گی۔ وہ کاروباری ذہن نہیں رکھتی تھی۔ یہی سمجھ میں آتا تھا کہ کوئی سچا اور دیانت دار جیون ساتھی ہوگا۔ تو وہی اس رقم کو صحیح مصرف میں لائے گا۔ اس رقم سے منافع کمائے گا۔ اس کا بینک بیلنس اور بڑھائے گا۔ اس کی توقع سے زیادہ اس کے مستقبل کو سنوارے گا۔

دوسرے دن اتوار کی چھٹی تھی۔ وہ دوپہر کو ایک بجے گھر سے نکلتے وقت عینی سے بولی۔

''بیٹی گھر میں رہنا باہر نہ جانا، مجھے واپسی میں دیر ہوگی۔''

''امی، آپ کیوں دیر سے آئیں گی؟''

''میں تمہارے ہونے والے ابو سے ملنے جارہی ہوں۔''

''میں بھی چلوں گی، میں بھی ان سے ملوں گی۔''

''بیٹی! ابھی نہیں، وہ ایک آدھ دن میں ادھر آئیں گے تو میں ان سے ملوا دوں گی۔ دروازے کو اندر سے بند کرلو۔''

وہ بس میں بیٹھ کر دوسرے علاقے میں آئی۔ احسان بس اسٹاپ پر کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ کوئی اس کا، صرف اس کا منتظر ہے اور یہ کہ دھوپ میں کھڑا ہوا ہے وہ بولی۔ ''کہیں ایسی جگہ چلو جہاں ہم آسانی سے تنہائی میں باتیں کرسکیں۔''

اس نے کہا۔ ''یہاں قریب ہی میرا مکان ہے۔''

''مکان تمہارا ہے یا کرائے کا ہے؟''

''وہ جھینپ کر بولا۔ ''ایک کمرے میں ماں اور رضیہ رہتی ہیں۔ ہم دوسرے کمرے میں بیٹھ کر باتیں کرسکتے ہیں۔''

وہ اس کے ساتھ چلتے ہوئے بولی۔ ''کیا ابھی تک بہن تمہارے ساتھ رہتی ہے؟ ابھی تک اس نے شادی نہیں کی؟''

''تم تو جانتی ہو بارہ برس پہلے بیوہ ہوئی تھی۔ ایک بچی لے کر آئی تھی۔ بیوہ سے بھلا کون شادی کرتا ہے۔ ہمارے ہی گھر میں بیٹھی ہوئی ہے۔''

''بیوہ تو میں بھی ہوں۔''

''تمہاری بات اور ہے میں تمہارا دیوانہ ہوں۔ اسی لیے ہماری بات بن رہی ہے۔''

''ٹھیک ہے، تم میرے دیوانے نہ ہوتے تو بھی رشتوں کی کمی نہیں ہے۔ اس بیوگی کے دوران میں کئی رشتے آچکے ہیں اور میں انکار کرچکی ہوں۔''

''ویسے تو رضیہ کے لیے بھی کئی رشتے آچکے ہیں اور دو بار اس کی شادی ہوئی بھی تھی

لیکن سسرال والے صحیح نہیں تھے، اس لیے پھر طلاق ہوگئی۔''

''یعنی وہ تین بار شادیاں کر چکی ہے اور اسے ایک بار بھی صحیح شوہر نہیں ملا۔ کیا یہ ماننے والی بات ہے؟ اپنی بہن کی کوئی خامی نہیں سمجھو گے۔ عورت اگر چاہے تو بد مزاج شوہر کو بھی اپنا بنا کر رکھ سکتی ہے۔''

''اس کی باتیں چھوڑو، اپنی باتیں کرو۔ میں یہی چاہتا ہوں کہ کبھی ہمارے درمیان کوئی اختلاف ہو تو کبھی تم سمجھوتا کرنا اور کبھی میں سمجھوتا کیا کروں گا۔ اسی طرح ہم پیار و محبت سے زندگی گزار سکیں گے۔''

دھوپ بہت تیز تھی۔ وہ دونوں کبھی درختوں اور کبھی مکانوں اور دکانوں کے سائے میں چلتے جا رہے تھے۔ اس نے کہا۔ ''کل میں تم سے پوچھنا بھول گئی تم کام کیا کر رہے ہو؟''

''کام کیا کروں گا، برسوں سے یہ ہو رہا ہے ملازمت ملتی ہے چھوٹ جاتی ہے کل امید ہے کہ بہت بڑی ملازمت ملے گی۔ کے ای ایس سی میں میرا کل انٹرویو ہے۔ وہاں ملازمت مل گئی تو سمجھو چھ ہزار روپے ماہانہ ملا کریں گے پھر اوپری آمدنی بھی ہے۔''

''مجھے جہاں تک یاد ہے تم بجلی کا کام نہیں جانتے ہو پھر کے ای ایس سی کے ادارے میں کیا کرو گے؟''

''کلرکی کروں گا، وہاں ایک افسر کو میں نے دس ہزار روپے رشوت کے طور پر دیئے ہیں۔ مجھے وہاں ضرور ملازمت مل جائے گی۔''

وہ ایک چھوٹے سے مکان کے دروازے پر پہنچ گئے۔ وہ بوسیدہ سا مکان تھا۔ دیواروں کا پلستر اُتر چکا تھا۔ رنگ و روغن نام کو نہیں تھا۔ اس نے دروازے پر دستک دی پھر کہا۔ ''اماں! دروازہ کھولو! دیکھو کون آیا ہے۔''

ماں نے دروازہ کھولا۔ مرجینا نے انہیں سلام کیا۔ وہ سلام کا جواب دیئے بغیر اندر چلی گئیں۔ ہونے والی سسرال میں قدم رکھنے سے پہلے ہی یہ تاثر پیدا ہوا کہ ماحول سازگار نہیں ہے۔ وہ احسان کے ساتھ اندر آئی۔ کمرے میں ایک شکستہ سی چارپائی تھی۔ جس پر میلا سا بستر بچھا ہوا تھا۔ بیٹھنے کے لیے کوئی کرسی نہیں تھی۔ احسان نے کہا۔ ''چارپائی پر بیٹھو۔''

وہ اپنے آنچل سے پسینہ پونچھتے ہوئے چارپائی پر بیٹھ گئی۔ چھت کی طرف دیکھا تو پنکھا نہیں تھا۔ احسان دوڑتا ہوا دوسرے کمرے میں گیا پھر ایک پرانا سا پیڈسٹل فین اٹھا کر لے آیا۔ اس کے پلگ کو سوئچ بورڈ میں لگا کر آن کیا تو پنکھا گھڑ گھڑ کی آواز کے ساتھ چلنے لگا۔ ساتھ ہی دائیں بائیں آگے پیچھے یوں ہل رہا تھا جیسے گھر آنے والے کے پاس آ رہا ہو۔ وہ

سہم کر پیچھے ہٹ گئی اچھا خاصا شور برپا ہو گیا تھا۔ ویسے یہ غنیمت تھا کہ ٹھنڈی ہوا مل رہی تھی۔
ماں ایک طرف کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔ احسان نے کہا۔ ''اماں! یہ مرجینا ہے۔ آپ پہلے بھی اسے دیکھ چکی ہیں۔''
وہ بولیں۔ ''ہاں...... بیس برس پہلے دیکھا تھا اس وقت اچھی خاصی عمر تھی اس کی۔''
جلدی سے بولا۔ ''نہیں اماں...... بیس برس پہلے نہیں بارہ برس پہلے دیکھا تھا اور یہ عمر میں ہماری رضیہ سے چھوٹی ہے۔''
وہ بھڑک کر بولی۔ ''اپنی بہن کو بوڑھی کہہ رہا ہے اور اسے جوان کہہ رہا ہے۔ کیا میری آنکھیں نہیں ہیں، میں دیکھتی سمجھتی نہیں ہوں؟''
''تمہاری سمجھ کو تو خدا ہی سمجھے۔ تم کام کی باتیں کرو گرمی پڑ رہی ہے یہ دھوپ سے آئی ہے کچھ ٹھنڈا تو پلاؤ۔''
''گھر میں چینی نہیں ہے، کل سے کہہ رہی ہوں۔ پرچون والے سے ادھار لے آؤ مگر وہ بھی کیوں ادھار دے گا۔ پچھلے مہینے کے ہزار روپے ہم پر چڑھے ہوئے ہیں۔''
مرجینا نے کہا۔ ''میں شربت نہیں پیوں گی۔ حلق خشک ہو رہا ہے۔ دو گھونٹ پانی پلا دو۔''
احسان پانی لینے کے لیے گیا تو مرجینا نے پوچھا۔ ''رضیہ کہاں ہے؟ نظر نہیں آ رہی ہے۔''
''کہاں سے نظر آئے گی۔ بے چاری صبح جاتی ہے اور پھر رات کو واپس آتی ہے۔ چار گھروں میں ماسی کا کام کر رہی ہے۔ میں بھی یہی کام کرتی ہوں۔ ابھی تمہارے انتظار میں یہاں آئی ہوں۔ احسان کہہ رہا تھا کہ تمہیں لے کر آئے گا۔''
وہ اسٹیل کے ایک پرانے سے گلاس میں پانی لے کر آیا۔ گلاس میلا میلا سا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے برسوں سے پیاس بجھاتے بجھاتے خود بجھ رہا ہو۔ پینے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ اس نے جبراً دو گھونٹ پی کر گلاس واپس دے دیا۔ اس کی ماں نے کہا۔ ''جب تم کنواری تھیں تو میں تمہارا رشتہ مانگنے گئی تھی۔ تمہارے گھر والوں نے انکار کر دیا تھا۔ تمہیں کسی دوسرے کے پلے باندھ دیا تھا۔ ہم کوئی گئے گزرے تو نہیں ہیں، عزت سے کماتے کھاتے ہیں۔''
پھر ماں ذرا توقف سے بولی۔ ''احسان کہہ رہا تھا کہ تم بھی گھر گھر جا کر کام کرتی ہو۔ بس تمہاری یہی بات اچھی لگی اس لیے دل کڑا کر کے تم سے مل ہی لوں۔''
احسان نے کہا۔ ''اماں! تم تو بولتی ہی چلی جاتی ہو۔ آرام سے اس کے پاس بیٹھو پھر

بولو۔''

''مجھے زیادہ کچھ نہیں کہنا ہے۔ مجھے تمہاری شادی اس لیے منظور ہے کہ یہ بھی ہمارے ساتھ گھروں میں کام کرے گی پھر یہ بھی اچھی بات ہے کہ اس کی بیٹی گیارہ برس کی ہے۔ وہ بھی کام سے لگ جائے گی۔ تو یہ ماں بیٹی بوجھ نہیں بنیں گی۔''

مرجینا اپنی بیٹی کے لیے ایک بہترین اور باوقار مستقبل کے خواب دیکھتی آرہی تھی۔ بڑی بی کی باتیں سن کر سر سے پاؤں تک سلگنے لگی۔ وہ ناگواری سے بولی۔''احسان، کیا اس گھر میں صرف عورتیں کماتی ہیں، تم بیٹھ کر کھاتے ہو؟''

وہ جلدی سے بولا۔''نہیں...... ایسی بات تو نہیں ہے۔ میں نے تم کو بتایا ہے کہ کل میری نوکری لگنے والی ہے۔''

ماں نے تعجب سے پوچھا۔''یہ کون سی نوکری ہے جو پکی ہونے والی ہے۔''

وہ بولا۔''اماں! میں نے تمہیں نہیں بتایا تھا۔ سوچا تھا جب نوکری پکی ہوگی تو میں تمہیں سرپرائز دوں گا۔''

''کیا دے گا؟ آج تک تو کچھ دیا نہیں یہ انگریزی میں کیا دینے والا ہے۔''

''اماں! میں نوکری کی خوش خبری سنا کر تمہیں حیران کرنا چاہتا تھا۔''

بڑی بی نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔''بیٹے! جب سے پیدا ہوئے ہو مجھے حیران کرتے آرہے ہو۔ اب بس کرو۔ جسے گھر والی بنا کر لا رہے ہو اس سے چھپاتے کیوں ہو؟ صاف صاف کہہ دو کہ ماں اور بہن کی کمائی سے گزارہ نہیں ہو رہا ہے۔ اس لیے ایک تیسری کمانے والی لا رہے ہو۔''

احسان نے جھینپ کر مرجینا کو دیکھا پھر غصے سے بولا۔''اماں! تم کیوں بکواس کرتی ہو۔ کیا میں نے پانچ ہزار روپے لا کر نہیں دیئے تھے؟''

''چھ مہینے پہلے دیئے تھے۔ کیا وہ اب تک چل رہے ہیں۔ تیرے کام دھندے کا تو پتا ہی نہیں چلتا۔ لگی تو روزی نہیں تو روزہ والی بات ہے۔''

''کچھ بھی ہو کماتا تو ہوں، کوشش تو کرتا ہوں۔ ہڈحرامی نہیں کرتا۔''

پھر وہ مرجینا کی طرف پلٹ کر بولا۔''تم ہی اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر بولو، کیا میں عورتوں کی کمائی کھانے والا ہوں؟ ہٹا کٹا ہوں کوئی ملازمت نہ ملے تو کدال لے کر مٹی کھود سکتا ہوں۔ پتھر ڈھونے والی مزدوری کر سکتا ہوں۔ اماں تو مجھے خواہ مخواہ بے غیرت بنا رہی ہیں۔''

مرجینا نے اٹھتے ہوئے کہا۔''اتنا تو میں سمجھ گئی کہ اس گھر میں بیاہ کر آؤں گی تو مجھے

ماسی کا کام کرنا ہوگا۔ اگر تم مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو تو میری ایک ہی شرط ہے کہ مجھ سے کہیں نوکری نہیں کراؤ گے۔ میں اپنی بیٹی کے ساتھ تمہاری کمائی کے سہارے زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔''

وہ سینہ تان کر بولا۔ ''تم مجھ پر بھروسا کرو میں تمہیں اپنی محنت کی کمائی کھلاؤں گا لیکن اتنا تو تم جانتی ہو کہ کبھی نرمی اور کبھی گرمی ہوتی ہے۔ کبھی کام ملتا ہے اور کبھی ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنا پڑتا ہے۔''

وہ گھر کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ''اس گھر کی حالت بتا رہی ہے کہ بارہ برس پہلے تم جہاں تھے اب تک وہیں ہو اور تم کوئی مستقل کام نہیں کرتے ہو۔ اگر تم کام کم کرتے ہو اور آرام زیادہ کرتے ہو تو میں ایک اور شرط پر تم سے شادی کر سکتی ہوں۔''

''تم اچھی طرح جانتی ہو میں برسوں سے تمہارا دیوانہ ہوں۔ میں کسی بھی شرط پر تم سے شادی کرنے کو تیار ہوں۔''

وہ بولی۔ ''مجھے اور میری بیٹی کو ایک محافظ کی ضرورت ہے اس لیے تم میرے مجازی خدا بن کر گھر کے اندر رہو گے۔ مجھے ایک چوکیدار کی ضرورت ہے جو میرے گھر کی نگرانی کرے لہٰذا تم چوکیداری بھی کرو گے۔ میں تمہیں تین وقت کی روٹی کھلاؤں گی۔ عید بقرعید کے نئے جوڑے سلوا کر دوں گی اور روزانہ دس روپے جیب خرچ کے دیا کروں گی۔''

اس کی ماں نے ہاتھ نچا کر کہا۔ ''اے ہے! تم تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے کہیں کی مہارانی ہو یا ہزاروں لاکھوں روپے کماتی ہو۔''

''میں ایک اسکول میں ملازمت کرتی ہوں پھر گھر میں بچوں کو ٹیوشن بھی پڑھاتی ہوں۔ اتنا کماتی ہوں کہ تمہارے بیٹے کو بٹھا کر کھلا سکتی ہوں۔ شادی کی شرط یہ بھی ہوگی کہ تمہارا بیٹا دن رات میرے گھر میں رہے گا۔ تم لوگوں سے کبھی کبھی ایک دو گھنٹے کے لیے ملنے آجایا کرے گا۔ میں اسے چھٹی دے دیا کروں گی۔''

پھر وہ احسان سے بولی۔ ''اگر تمہیں منظور ہے تو باہر آجاؤ۔ باہر میرے اور تمہارے درمیان معاملات طے ہوں گے۔ میں کسی تیسرے کی مداخلت برداشت نہیں کروں گی۔''

وہ کوئی بات سنے بغیر ماں اور بیٹے کے درمیان سے نکل کر چلی گئی۔ اسے اپنے پیچھے احسان کی ماں کی بڑبڑاہٹ سنائی دے رہی تھی۔ ''یہ تم کسے پکڑ کر لے آئے ہو؟ یہ تو ماں بیٹے کو چھڑانا چاہتی ہے۔ کیا میں نے تمہیں اسی دن کے لیے پیدا کیا ہے کہ یہ تمہیں مجھ سے چھین کر لے جائے؟''

وہ باہر آ کر کچھ دور جا کر رک گئی۔ پلٹ کر دیکھا تو وہ ماں کے اعتراضات کے باوجود پیچھے آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ چلتے ہوئے بولا۔ ''اماں تو بس ایسے ہی گرم مزاج کی ہیں۔ بے تکے انداز میں بولتی رہتی ہیں۔''

''اگر تم کمانے والے ہوتے تو وہ میرے سامنے دم سادھ کر رہتیں کچھ بولنے کی جرأت نہ کرتیں۔''

''میں ان کی طرف سے معافی مانگتا ہوں۔ تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ نوکری ملے گی تو ضرور کروں گا پھر کبھی وہ نوکری نہیں چھوڑوں گا۔''

''تم تو کہہ رہے تھے کل تمہیں کے ای ایس سی میں نوکری ملنے والی ہے؟''

''ہاں ...... ان شاءاللہ ضرور ملے گی۔''

''مجھے وہاں کا پتا بتاؤ اور فون نمبر دو۔ اب میں تم پر اندھا اعتماد نہیں کروں گی۔ میں خود معلوم کروں گی کہ کون تمہیں ملازمت دے رہا ہے اور کیسے ملازمت دے رہا ہے۔''

''پہلے ملازمت تو ملنے دو پھر میں وہاں کا پتا اور فون نمبر لکھوا دوں گا۔''

''اور ملازمت نہیں ملے گی تب بھی وہاں کا پتا اور فون نمبر لکھواؤ گے۔ میں وہاں جا کر تمہاری سچائی معلوم کروں گی کہ وہاں تم انٹرویو کے لیے گئے تھے یا نہیں؟ کوئی تمہیں ملازمت دینا چاہتا ہے یا نہیں؟''

''تم تو پولیس والی بن کر انکوائری کرنا چاہتی ہو۔ یہ مناسب نہیں ہے، تمہیں مجھ پر بھروسا کرنا چاہیے۔''

''اندھا اعتماد کرنے والی مرجینا مر چکی ہے۔ میں تم سے صاف صاف کہہ چکی ہوں تم بھی مجھ سے صاف صاف کہو کہ کہیں ڈھنگ کی ملازمت نہیں کر سکتے لہٰذا میری شرائط کے مطابق مجھ سے شادی کرو گے۔''

''مرجینا! میں تمہارا دیوانہ ہوں۔ ہر قیمت پر تم سے شادی کروں گا۔ آج میں اماں کو راضی کرلوں پھر کل تم سے مل کر ساری باتیں طے کروں گا۔ ہم جلد ہی شادی کرلیں گے۔''

''تمہاری اماں راضی ہوں یا نہ ہوں، میرے لیے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کل تم مجھ سے آخری بار ملو گے اگر میری شرائط منظور ہوں گی تو پھر وہ ملاقات آخری نہیں ہوگی۔ کل اسکول کی چھٹی کے بعد دو بجے اسی بس اسٹاپ پر آؤ گے۔''

یہ کہہ کر وہ بس میں بیٹھ کر وہاں سے چلی آئی۔ اس نے دوسری شادی کے سلسلے میں جو خواب دیکھتے تھے۔ ان کی تعبیر حسب منشا نہیں تھی، دل دُکھا رہی تھی۔ حالات نے اسے اچھی

طرح سمجھا دیا تھا کہ کس موقع پر کون سی بات کہنی چاہیے اور کیسا فیصلہ کرنا چاہیے لہٰذا اس نے اپنا فیصلہ احسان کو سنا دیا تھا۔

یہ حقیقت اچھی طرح سمجھ میں آ گئی تھی کہ وہ ایک شوہر کی ذمے داریاں پوری کرنے کے قابل نہیں ہے لیکن وہ دل سے مجبور تھی۔ وہ شروع سے ہی اچھا لگتا تھا۔ وہ اسے اپنا بنا کر رکھنا چاہتی تھی اور اسے اپنا بنا کر رکھنے کے لیے اس کے پاس یہی ایک راستہ رہ گیا تھا۔ وہ بیوی بن کر نہیں مالکہ بن کر ہی اس کے ساتھ زندگی گزار سکتی تھی۔

عینی نے پوچھا۔ ''امی! کیا ابو سے ملاقات ہوئی؟''

اس نے بیٹی کو دیکھا پھر اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔ ''نہیں بیٹی! میں غلط بس میں سوار ہو گئی تھی۔ راستہ بھٹک گئی تھی جسے چاہتی تھی وہ نہیں ملا شاید کل مل جائے۔''

اسے یقین تھا کہ احسان اس کی طرف جھکے گا۔ وہ کام چور تھا۔ وہ گھومنا پھرنا اور پھر گھر میں بیٹھ کر تین وقت کی روٹی توڑنا چاہتا تھا۔ یہ اس کے لیے سنہری موقع تھا کہ مرجینا کے گھر میں تین وقت کی روٹیاں بھی ملتیں اور روزانہ دس روپے جیب خرچ کے لیے بھی ملتے رہتے۔

مرجینا کو تنہائی میں ایک ساتھی کی ضرورت تھی۔ گھر کی نگرانی کے لیے بھی ایک چوکیدار کی ضرورت تھی۔ وہ مکمل شوہر نہ سہی شوہر کا ایک لیبل بن کر رہ سکتا تھا۔ مرجینا کی پیشانی پر یہ لیبل لگا رہتا تو پھر کوئی پتھر ان کے گھر کی طرف نہ آتا۔

احسان اپنے ایک دیرینہ دوست افضل کے ساتھ ایک کیفے میں بیٹھا ہوا اپنے موجودہ حالات پر اس سے گفتگو کر رہا تھا۔ افضل نے اس کی تمام باتیں سننے کے بعد کہا۔ ''یار! تم میرے بچپن کے ساتھی ہو لیکن ہم دونوں کے مزاج اور عادتوں میں بڑا فرق ہے۔ اس کے باوجود میں تمہیں دل سے چاہتا ہوں۔ میری دلی تمنا ہے کہ کبھی تم ڈھنگ کا کام کرو اور کبھی کسی کے محتاج نہ رہو۔ تم مرجینا کے بارے میں جو کچھ بتا رہے ہو۔ اس سے تو یہی ظاہر ہو رہا ہے کہ تم شادی کے بعد اس کے محتاج بن کر رہو گے۔''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے، میں شادی کے بعد اس کی کمائی نہیں کھاؤں گا۔ خود بھی کماؤں گا۔''

''رہنے بھی دو یار! پندرہ برس پہلے ہم دونوں ایک ہی کمپنی میں ملازمت سے لگے تھے۔ تم وہاں ناغے کرتے رہے۔ تمہاری نوکری ختم ہو گئی تب سے اب تک میں نے تمہیں کبھی جم کر کام کرتے نہیں دیکھا۔ تم تو دن کے گیارہ بجے تک سونے کے عادی ہو، کام کیا خاک کرو گے؟''

''تب کی بات اور تھی، اب کی بات اور ہے۔کیا مجھ میں تبدیلیاں نہیں آ سکتیں؟''

''میں تمہاری رگ رگ سے واقف ہوں۔ میں تمہیں بچپن سے جانتا ہوں۔ جب مرجینا یہ کہہ رہی ہے کہ ماں اور بہن کو چھوڑ کر تمہیں اس کے ساتھ رہنا ہوگا اور تم راضی ہو رہے ہو، اس کا مطلب کیا ہے؟ اس بیوہ نے تمہیں ضرور کوئی آفر دی ہوگی۔ اتنا تو تم نے بتایا ہے کہ وہ اچھا کماتی کھاتی ہے۔ وہ شوہر کی کمائی کی محتاج نہیں ہے۔ سیدھی سی سمجھ میں آنے والی بات ہے کہ تم اس کے محتاج رہو گے۔''

''میں تمہیں اپنا جگری یار سمجھ کر تم سے مشورہ لے رہا ہوں اور تم مجھ کو طعنے دے رہے ہو۔''

''میں تمہیں کیا مشورہ دوں؟ یہ میں اچھی طرح سمجھ گیا ہوں کہ تم ماں بہن کو چھوڑ کر اس کے پاس ضرور جاؤ گے۔ اس سے شادی کرو گے۔ اس کی کمائی کھاؤ گے۔'' احسان اسے گھورنے لگا وہ بولا۔''یار! کیوں مردوں کو بدنام کرتے ہو۔ مرد بن کر پیدا ہوئے ہو۔ مردوں کی طرح بن کر رہو۔''

''تم میری بات کیوں نہیں سمجھ رہے ہو۔ اپنی کہے جا رہے ہو۔ میں نے کب کہا ہے کہ ماں اور بہن کو چھوڑ کر اس کے پاس چلا جاؤں گا۔ ہم سب ایک ساتھ رہیں گے۔ میں تم سے صرف ایک تعاون چاہتا ہوں، وہ تم میرے ساتھ کرو۔''

''کیا چاہتے ہو؟''

''اپنے ٹھیکے دار سے کہہ کر مجھے عارضی طور پر کسی کام سے لگوا دو تاکہ مرجینا کو یہ معلوم ہو کہ میں کام کرنے لگا ہوں۔ جب میں کام دھندے سے لگا رہوں گا تو وہ میری ماں بہن کو ساتھ رکھنے سے انکار نہیں کرے گی۔''

''ٹھیکے داری کا کام ہفتے دو ہفتے، مہینے دو مہینے تک رہتا ہے۔ اس کے بعد مزدوروں کی چھٹی کر دی جاتی ہے۔ جب تمہاری چھٹی کر دی جائے گی تو کیا کرو گے؟ اس وقت تم مرجینا کو کیا جواب دو گے؟ کیا وہ تمہاری ماں بہن کا بوجھ اٹھائے گی؟ وہ تو ماں اور بہن کے ساتھ تمہیں بھی گھر سے نکال دے گی۔ بڑے بے آبرو ہو کر اس کے کوچے سے نکلو گے۔''

''تم اتنی لمبی باتیں کیوں کر رہے ہو؟ بس میرا ایک کام کر دو۔ ٹھیکے دار سے کہہ دو کہ مجھے کام پر رکھ لے۔''

''ٹھیکے دار میرے کہنے پر تمہیں دو بار رکھ چکا ہے۔ تم ہر بار کام چھوڑ کر چلے گئے۔ کبھی بیمار پڑ جاتے ہو، کبھی کوئی مصیبت تم پر آ جاتی ہے پھر تم ناغے کرنے لگتے ہو۔ ہمیشہ دیر سے

کام پر پہنچتے ہو۔ بھلا کون ٹھیکے دار تمہیں رکھے گا؟ سوری...... میں ٹھیکے دار کے سامنے شرمندہ ہونا نہیں چاہتا......"

"یار! اپنے بچپن کے دوست کی خاطر ایک بار مجھے صرف ایک ہفتے کے لیے کام پر لگا دو۔"

"میں تم سے کہنا تو نہیں چاہتا تھا لیکن اب کہنا پڑ رہا ہے کہ ٹھیکے دار تمہیں گالیاں دیتا ہے۔ تمہیں اچھی طرح پہچان چکا ہے۔ میں تمہاری کتنی ہی سفارش کروں وہ تمہیں کبھی کام نہیں دے گا۔"

وہ مایوس ہو کر سر جھکا کر چائے پینے لگا پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ "یار! میرے کسی کام تو آؤ۔"

"میں کیا کام آ سکتا ہوں؟ ایسا کام کہو جو میں تمہارے لیے کر سکتا ہوں۔"

"تم مجھے سو روپے ادھار تو دے سکتے ہو۔"

"کیا بات کر رہے ہو، پچھلے دو برسوں میں تم اب تک مجھ سے بارہ سو روپے ادھار لے چکے ہو۔ کیا تم نے کبھی ایک روپیہ بھی لوٹایا ہے؟ میں بیوی بچوں والا ہوں۔ حاتم طائی تو نہیں ہوں کہ قرض کے نام پر تمہیں پیسے دیتا رہوں اور تم لٹاتے رہو اور واپس کرنے کا نام نہ لو۔"

"مجھے شرمندہ نہ کرو، پہلے میں اس قابل نہیں تھا۔ اب میرے حالات بدلنے والے ہیں۔ میں تم سے لیے ہوئے پیسے تھوڑے تھوڑے کر کے واپس لوٹا دوں گا۔"

افضل نے تعجب سے پوچھا۔ "تمہارے حالات کیسے بدل رہے ہیں؟ کیا مرجینا لاٹری کا ٹکٹ ہے؟ کیا تم اس سے رقم لے کر میرا قرض چکایا کرو گے؟"

"میں کچھ بھی کروں گا لیکن تمہاری رقم واپس کر دوں گا۔"

"دیکھو احسان! میں تمہاری ہیرا پھیری خوب سمجھتا ہوں۔ یہ تم سو روپے جو ادھار مانگ رہے ہو۔ اس کا کیا کرو گے یہ بھی میں جانتا ہوں۔"

"تم کیا جانتے ہو؟"

"تم مرجینا سے کہو گے کہ کسی ٹھیکے دار کے ہاں کام کر رہے ہو۔ روز صبح کام کے لیے نکل جاؤ گے اور آوارہ گردی کرتے رہو گے۔ ہوٹلوں میں بیٹھ کر گپیں ہانکتے رہو گے، چائے پیتے رہو گے۔ شام کو واپس جا کر یہی تاثر دو کہ محنت مزدوری کر کے آ رہے ہو۔ ایک ہفتے بعد سو روپے مرجینا کو پیش کرو گے کہ یہ تمہیں ہفتے کی دہاڑی ملی ہے۔ کب تک ایسے فراڈ کرتے رہو گے؟"

وہ غصے سے بولا۔ ''جب میں فراڈیا ہوں، جھوٹا ہوں، بے ایمان ہوں تو تم مجھ سے دوستی کیوں رکھتے ہو؟''

''میں تمہیں آئینہ دکھا رہا ہوں تو غصہ آرہا ہے۔ کوئی بات نہیں میں بھی آج یہی سوچ کر آیا ہوں کہ تم ناراض ہوتے ہو تو ہوا کرو۔ دوستی نہیں رکھنا چاہو گے نہ رکھو۔ نالائق کی دوستی جی کا جنجال ہوتی ہے۔ مجھے تو اس بیوہ پر ترس آرہا ہے۔ پتا نہیں تم شادی کے بعد اسے کیسے کیسے ہتھکنڈوں سے بے وقوف بناتے رہو گے؟''

''تمہیں اس پر ترس آرہا ہے۔ وہ تمہاری سگی ہے تو جاؤ میرے خلاف اس کے کان بھرو۔''

پھر وہ میز پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا ''میں دعوے سے کہتا ہوں۔ میری ہزار برائیاں سننے کے بعد بھی وہ مجھ سے شادی کرلے گی، وہ میری دیوانی ہے۔ بیوہ ہو چکی ہے۔ میرے بغیر نہیں رہ سکے گی۔'' وہ اٹھ کر کھڑا ہوا پھر بولا۔ ''میں نے سنا تھا کہ دوست مصیبت میں پہچانے جاتے ہیں۔ آج میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔''

یہ کہہ کر وہ غصے سے پاؤں پٹختا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

☆======☆======☆

وہ تیسری بار پھر بس اسٹاپ پر ملے۔ مرجینا نے کہا۔ ''آج کسی کیفے میں چلو، وہاں اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کریں گے۔''

''کیفے میں کیوں؟ میرے گھر چلو۔ تمہارے جانے کے بعد اماں کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ بہت پچھتا رہی تھیں۔ مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ میں ابھی جا کر تمہیں واپس لے آؤں۔''

''ہاں ہاں ضرور...... جب ان کے کانوں میں یہ بات پڑ چکی ہے کہ میں ان ماں بیٹی سے زیادہ کما رہی ہوں تو مجھ پر ضرور صدقے واری جائیں گی۔''

''یہ بات نہیں ہے مرجینا!''

''یہی بات ہے احسان صاحب! میرے مرحوم شوہر نے کہا تھا کہ کسی کو آزمانا ہو تو اسے چند ہزار روپے دے دو۔ اس کی اصلیت سامنے آجائے گی۔ تم ماں بیٹے کو معلوم ہو گیا کہ میں چند ہزار روپے کما رہی ہوں تو تمہاری ماں گرگٹ کی طرح رنگ بدل رہی ہیں اور تم بھی ان کی حمایت میں بول رہے ہو۔''

''میں مانتا ہوں تمہیں غصہ آنا چاہیے لیکن میری خاطر سمجھوتا کرلو۔''

''میں ان سے سمجھوتا کیوں کروں؟ مجھے شادی تم سے کرنی ہے اور اسی شرط پر کرنی ہے کہ تم میرے ساتھ ہی رہو گے۔ میں نے تمہاری بہن کا ٹھیکا نہیں لیا ہے۔ وہ برسوں سے اپنی زندگی آپ گزار رہی ہیں۔ انہیں گزارنے دو تم کیسے زندگی گزارو گے اس کا فیصلہ تم ابھی کرو گے۔ میں ہر روز یہاں بس اسٹاپ پر ملنے نہیں آیا کروں گی۔''

وہ آس پاس دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ہمیں کسی کیفے میں چل کر بیٹھنا چاہیے۔''

''کیا تمہاری جیب میں رقم ہے؟''

''ہاں...... میری جیب میں دس روپے ہیں۔ ہم دو کپ چائے تو پی سکتے ہیں۔''

''اس علاقے میں کوئی ایسا کیفے نہیں ہے جہاں الگ الگ کیبن بنے ہوں۔''

''ہم کسی دوسرے علاقے میں چلیں؟''

''اگر ہم کہیں بس میں جائیں گے تب بھی کرائے کے لیے تمہارے دس روپے کم پڑیں گے۔ ذرا سوچو تم کیسی زندگی گزار رہے ہو۔ اپنی محبوبہ کو کسی کیفے میں لے جا کر چائے پلانے کے قابل بھی نہیں ہو۔''

''وہ بات یہ ہے کہ میرے پاس سو روپے تھے۔ میں نے گھر میں راشن کے لیے دے دیئے۔''

''اچھا زیادہ باتیں نہ بناؤ، بس آ گئی ہے کرایہ نہیں دینا میں دے دوں گی۔''

وہ دونوں بس میں سوار ہو گئے۔ وہاں سے دور ایک پوش علاقے میں پہنچے۔ وہاں ایسے ریسٹورنٹ اور کیفے تھے۔ جن میں چھوٹے چھوٹے کیبن بنے ہوئے تھے اور رومانی جوڑے وہاں آ کر بڑی رازداری سے ملتے تھے۔

وہ ایک کیبن میں آ کر بیٹھ گئے۔ مرجینا نے پوچھا۔ ''کیا کھاؤ گے؟''

''کچھ نہیں...... بس چائے کافی ہے۔''

''چائے کافی نہیں ہوتی، کافی الگ ہوتی ہے چائے الگ ہوتی ہے۔'' اس نے ویٹر کو سینڈوچز لانے کو کہا پھر اس کے جانے کے بعد بولی۔ ''آج تم انٹرویو کے لیے جانے والے تھے۔ کیا ہوا؟''

''میں وہاں گیا تھا۔ انہوں نے میرے کاغذات دیکھے پھر کہا یہاں [redacted] کے لیے بڑے بڑے گریجویٹ آتے ہیں اور تم صرف دس جماعت پاس ہو پھر بھی تمہارے بارے میں سوچیں گے۔ یہ کہہ کر انہوں نے ٹال دیا۔ مجھے تو امید نہیں ہے وہ کسی گریجویٹ کے مقابلے میں مجھے ملازمت دیں گے۔''

''تم ابھی کہاں سے آ رہے ہو؟''

''انٹرویو دینے کے بعد سیدھا بس اسٹاپ پر آیا تھا۔''

''تم نے بلیک جینز پھر پھول دار شرٹ پہنی ہے پکے غنڈے اور موالی لگ رہے ہو۔ ایسے لباس میں ملازمت حاصل کرنے گئے تھے اور امید کرتے ہو کہ وہ تمہیں گلے لگا کر نوکری دیں گے۔''

''میرے دوسرے کپڑے میلے تھے۔ اس لیے میں یہ لباس پہن کر گیا تھا۔''

''یونہی چلے جاتے تو وہ ترس کھا کر نوکری دے دیتے۔''

اس نے شکایتاً کہا۔ ''تم پہلے جیسی مرجینا نہیں رہیں۔ بات بات پر طعنے دینے لگی ہو۔''

ویٹر نے سینڈوچز لا کر رکھے۔ مرجینا نے چائے لانے کا آرڈر دیا پھر وہ ایک سینڈوچ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''کام کی باتیں کرو۔''

''میری ایک بات مان لو، ہم سب ایک ساتھ رہیں گے۔ اماں اور رضیہ کبھی تمہیں شکایت کا موقع نہیں دیں گی۔''

''کوئی بھی دلہن اپنے جہیز میں ماں باپ کو سسرال لے کر نہیں جاتی پھر تم اپنی ماں اور بہن کو جہیز میں لے کر کیوں آنا چاہتے ہو۔ میں تو انہیں اپنے دروازے پر قدم بھی نہیں رکھنے دوں گی۔''

''دیکھو...... وہ تم سے بڑی ہیں۔ ماں کے برابر ہیں اگر وہ تمہارے سامنے جھکیں گی، معافی مانگیں گی تو کیا تم انہیں معاف نہیں کرو گی؟''

''وہ کیوں جھکیں گی؟ کیوں معافی مانگیں گی؟ میرا ان سے کیا رشتہ ہے؟ کیا صرف اس لیے کہ میں چند ہزار روپے کماتی ہوں؟ میرا محبوب واقعی لاکھوں میں ایک تھا۔ مجھے ایسا گُر سکھا گیا ہے کہ میں ان پر عمل کر کے تم لوگوں کی اصلیت معلوم کر رہی ہوں۔''

''مجھے اماں اور بہن کے سامنے شرمندہ نہ کرو، میں تم سے سچی محبت کرتا ہوں۔''

''مجھ سے سچی محبت کرنے والا اس دنیا سے جا چکا ہے۔ یہ بات اپنے ذہن سے نکال دو کہ میں تم پر بھروسا کرتی ہوں۔ مجھے صرف ایک محافظ کی ضرورت ہے۔ میں کسی غیر مرد کو چوکیدار بنا کر اپنے گھر میں نہیں رکھ سکتی۔ تم سے پہلے محبت کرتی تھی اس حوالے سے تمہیں پسند کرتی ہوں۔ دنیا کو دکھانے اور انہیں مطمئن کرنے کے لیے تمہیں اپنا شوہر بنا کر رکھوں گی۔''

''میں اپنی سچی محبت ثابت کرنے کے لیے تم جس طرح کہو گی اس طرح کی زندگی تمہارے ساتھ گزار دوں گا لیکن یہ تو سوچو رشتہ طے کرنے کے لیے اماں کا تمہارے گھر آنا

ضروری ہے۔''

''کوئی ضروری نہیں ہے تم انہیں کسی بہانے سے بھی لانا چاہو گے تو میں تمہیں بھی اپنے گھر میں گھسنے نہیں دوں گی۔''

''کیا تم ہمیشہ اپنی ہی باتیں منواؤ گی۔ میری کوئی بات نہیں مانو گی۔''

''کبھی تم کوئی معقول بات کرو گے تو ضرور مانوں گی۔''

''تمہارے محلے پڑوس والوں کو بتانا ہو گا کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ میرے بزرگ رشتہ مانگنے آئیں گے مگر میں کہاں سے بزرگ لے کر آؤں گا؟''

''تم طرح طرح کی ہیرا پھیری کر کے زندگی گزار رہے ہو کیا کسی کو بزرگ بنا کر نہیں لا سکتے؟ تمہارے کتنے ہی دوست ہوں گے۔ ان سے کہو وہ اپنے والدین کو رشتے کی بات کرنے کے لیے بھیج دیں۔''

''مجھے یہ سوچ کر خوشی ہو رہی ہے کہ تم مجھ پر بھروسا...... نہ کرتے ہوئے بھی اپنا لائف پارٹنر بنا رہی ہو۔ تمہارے دل میں میری محبت چھپی ہوئی ہے بس ایک ماں اور بہن کی فکر ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کے لیے کیا کروں؟''

''ان کے لیے کیا کرو گے، کبھی تم نے کچھ کیا ہے کیا تم کما کر انہیں کھلاتے ہو۔ وہ تو خود ہی محنت کرتی ہیں اور اپنا گزارہ کرتی ہیں۔ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو۔ اگر ان سے ہمدردی اور محبت ہے۔ تو میں بھی کبھی تمہیں ان کے پاس جانے سے نہیں روکوں گی، جب دل چاہے جایا کرنا۔ اگر ماں سے محبت ہے تو ان کے لیے محنت کرو اور جو کماؤ ان کے ہاتھ پر جا کر رکھو۔ میں کبھی اعتراض نہیں کروں گی۔ کبھی یہ نہیں کہوں گی کہ تمہاری کمائی پر میرا حق ہے۔''

''یہ کیسے ہو گا کہ میں وہاں بھی رہوں اور یہاں بھی؟''

''تم وہاں نہیں رہو گے، میرے پاس دن رات رہو گے۔ صرف اپنی محنت کی کمائی دینے کے لیے اور کبھی ان کے دکھ سکھ میں شریک ہونے کے لیے گھنٹے دو گھنٹے کے لیے جایا کرو گے۔ اس سے بڑی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ تمہاری ساری کمائی تمہاری اماں کو دوں اور تم سے ایک پیسہ نہ لوں اور ساری زندگی تمہیں روٹی کھلاؤں گی تمہارا خرچ برداشت کروں گی۔ ماں نے بھی کبھی تم پر اتنا خرچ نہیں کیا ہو گا جتنا میں کرتی رہوں گی۔''

وہ چائے کا آخری گھونٹ پینے کے بعد بولی۔ ''مجھے ذرا جلدی جانا ہے، میری بیٹی گھر میں اکیلی ہے۔ مجھے بتاؤ تم کب اپنے بزرگوں کو میرا رشتہ لینے کے لیے بھیجو گے؟ لیکن ان بزرگوں میں تمہاری ماں نہیں ہو گی۔''

”میں کل تک بزرگوں کا انتظام کروں گا پھر پرسوں انہیں تمہارے گھر لے آؤں گا۔“

اس نے ایک کاغذ پر اپنے مکان کا پتا لکھ کر دیا پھر کہا۔”اب میں تم سے نہیں ملوں گی۔ پرسوں شام چھ بجے میں تمہارا اور تمہارے بزرگوں کا انتظار کروں گی۔اب ہمیں چلنا چاہیے۔“

وہ وہاں سے اٹھ گئے۔ پہلے کھانے پینے کا بل ادا کیا پھر وہ کیفے سے باہر آ کر بس اسٹاپ کی طرف جانے لگے۔ ایسے میں سر عزیز الدین سے سامنا ہوا۔ وہ جس اسکول میں پڑھاتی تھی اسی میں سر عزیز الدین بھی پڑھاتے تھے۔ وہ بزرگ بہت ہی قابل استاد تھے۔ سب ہی ان کا احترام کرتے تھے۔ مرجینا نے انہیں سلام کرتے ہوئے پوچھا۔”سر! آپ ادھر کہاں آ گئے؟“

وہ تھکے ہوئے انداز میں پسینہ پونچھتے ہوئے بولے۔”ادھر ایک ٹیوشن ملنے کی امید تھی اس لیے آیا تھا۔ مایوس ہو کر واپس جا رہا ہوں۔ بڑی گرمی ہے، پیاس سے حلق میں کانٹے چبھ رہے ہیں۔“

”سر! میں آپ کو ٹھنڈا پلواؤں گی۔ ذرا ایک منٹ۔“

اس نے احسان سے کہا۔”اب تم جاؤ۔ میں اپنے سر کے ساتھ جا رہی ہوں۔“

وہ پرسوں شام کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ وہ سر عزیز الدین کے ساتھ پھر اسی کیفے میں آ گئی۔ اس نے ویٹر سے دو اورنج جوس لانے کو کہا پھر اس کے جانے کے بعد بولی۔”سر! میں آپ کو اسکول میں دیکھتی ہوں تو آپ سے بڑی ہمدردی ہوتی ہے۔ آپ اس عمر میں کتنی محنت کرتے ہیں۔“

”میں محنت سے نہیں گھبراتا ہوں لیکن یہ سوچ کر دکھ ہوتا ہے کہ اتنی محنت کا معقول معاوضہ نہیں ملتا ہے۔ اب یہی دیکھ لو کہ میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ ہوں۔ وہاں سب سے سینئر ہوں۔ اس کے باوجود اس اسکول کا ہیڈ ماسٹر نہیں ہوں۔ وہاں مجھے ٹیچر اور کلرک بنا کر رکھا گیا ہے۔“

”وہاں آپ کو تنخواہ کتنی ملتی ہے؟“

”دو ہزار دو سو روپے اور اس کے علاوہ کچھ ٹیوشن ہیں، سب ملا کر ماہانہ ساڑھے پانچ ہزار روپے بنتے ہیں۔ گھر میں پانچ جوان بیٹیاں شادی کے لیے بیٹھی ہیں وہ بھی گھر پر ٹیوشن پڑھاتی ہیں۔ اس طرح ہماری کل ماہانہ آمدنی سات ہزار روپے ہے۔ بڑی مشکل سے گزارہ ہوتا ہے۔ اتنی بچت بھی نہیں ہوتی کہ کسی ایک بیٹی کی شادی کر دیں۔“

ویٹر نے اورنج جوس لا کر رکھے وہ گلاس اٹھا کر ایک ایک گھونٹ پیتے ہوئے کہنے

لگے۔ ''مجھ سے جو ٹیچر جونیئر ہیں وہ بیس سے پچیس ہزار روپے ماہانہ کماتے ہیں۔ ایسے بھی ٹیچر ہیں جن کے پاس لاکھوں روپے تھے۔ انہوں نے اسکول میں پڑھانے کے دوران تجربہ حاصل کیا پھر اپنا اپنا اسکول کھول کر بیٹھ گئے۔''

وہ ایک سرد آہ بھر کر بولے۔ ''کبھی کبھی حسرت سے سوچتا ہوں کاش میرے پاس بھی اتنی رقم ہوتی تو میں بھی ایک بہت بڑا اسکول کھول لیتا۔''

مرجینا ان کی باتیں سن رہی تھی اور کچھ سوچ رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔ ''ایک اسکول قائم کرنے کے لیے کم از کم کتنے سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے؟''

انہوں نے کہا۔ ''اچھے خاصے سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جن لوگوں کے پاس اپنی زمین ہوتی ہے۔ وہ پچاس ہزار یا ایک لاکھ روپے سے ابتدا کرتے ہیں پھر رفتہ رفتہ کلاسوں کو بڑھاتے جاتے ہیں۔ طلبہ اور طالبات میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اس کے ساتھ آمدنی بھی بڑھتی جاتی ہے۔''

''ہمارے علاقے میں زمین کی قیمت کیا ہے؟ اگر ہم وہاں اسکول کھولنا چاہیں تو......؟''

''نرسری اور پرائمری کلاسوں تک کا اسکول کھولنے کے لیے ستر اسّی گز کی زمین کافی ہوتی ہے۔ چالیس یا پچاس ہزار روپے میں یہ زمین خریدی جاسکتی ہے۔''

''میں چاہتی ہوں کہ دو سو، چار سو یا چھ سو گز کی زمین خریدیں تاکہ آئندہ دسویں کلاس تک کی کلاسیں بھی قائم کرسکیں۔''

''ہم جس علاقے میں رہتے ہیں وہ پسماندہ ہے لیکن چار برسوں میں ترقی کرنے والا ہے۔ وہاں چھ سو گز کی زمین تقریباً چار لاکھ میں ملے گی۔''

پھر وہ چونک کر بولے۔ ''بیٹی! تم اتنی لمبی لمبی باتیں کر رہی ہو۔ کیوں مجھے خواب دکھا رہی ہو؟ میں بھی بولتا چلا جا رہا ہوں۔''

اس نے ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''ہم اور آپ مل کر یہ خواب پورا کرسکتے ہیں، میں رقم لگاتی ہوں۔ آپ بہت تجربہ کار ہیں۔ میری رقم سے اور آپ کے تجربے سے ہم دونوں کو فائدہ پہنچے گا۔ آپ یہ بتائیں کہ آپ رجسٹریشن وغیرہ کروا سکتے ہیں؟''

''میں بہت کچھ کروا سکتا ہوں، میری پہنچ بہت دور تک ہے۔ صرف رقم نہ ہونے کے باعث رینگ رینگ کر زندگی گزار رہا ہوں۔''

''مجھے ایک دیانت دار رہنما کی ضرورت ہے اور آپ کو رقم چاہیے۔ اس طرح ہم ایک

دوسرے کے کام آسکتے ہیں۔''

انہوں نے حیرانی سے پوچھا۔''کیاتم اتنی رقم کہیں سے لاسکتی ہو؟''

''جی ہاں...... میں نے آج تک کسی کونہیں بتایا۔آپ پراعتماد کررہی ہوں اورآپ بھی یہ بات اپنی ذات تک رکھیں گے میرے مرحوم شوہر نے میرے لیے اتنی رقم چھوڑی ہے۔اس سے ہم دونوں مل کرایک بہت بڑا اسکول کھول سکتے ہیں۔''

وہ حیرت اور مسرت سے اسے دیکھتے ہوئے بولے۔''بیٹی! مجھے یقین نہیں ہورہا ہے۔تم وہاں ایک معمولی ٹیچر کی حیثیت سے پڑھارہی ہواور لاکھوں روپے کاروبار میں لگانے کی بات کررہی ہو۔''

''سر! لاکھوں روپے خرچ کرنے کی بات ہے۔ میں بہت محتاط رہتی ہوں۔ مجھ اکیلی سے فراڈ کرنے والے بہت ملیں گےلیکن ایماندار شاید ہی کوئی ملے۔ پتانہیں کیوں میرادل کہتا ہے کہ آپ کے ساتھ کاروبار کروں گی تو مجھے نقصان نہیں پہنچے گا۔''

انہوں نے کہا۔''میں نے تمہیں بیٹی کہا ہےتو باپ بن کردکھاؤں گااورتمہارے کاروبار میں حصہ دارنہیں بنوں گا۔بس میں اپنی محنت کامعقول معاوضہ چاہوں گا۔''

''آپ معاوضے کی بات رہنے دیں۔ میں آپ کی توقع سے زیادہ آپ کے لیے کروں گی۔آپ اسٹیٹ ایجنسی والوں سے کسی اچھی سی زمین کا سودا کریں۔''

یہ کہہ کراس نے آنکھیں بند کرلیں۔ دیرتک آنکھیں بند کیے بیٹھی رہی۔سرعزیز نے پوچھا۔''کیابات ہے بیٹی!تم نے آنکھیں کیوں بند کرلیں؟''

''میں بیوہ ہونے کے بعداپنی بیٹی کے بہترین مستقبل کے لیےسوچتی رہتی تھی کہ اتنی رقم کہاں لگاؤں کہ وہ ڈوبنے نہ پائے۔ میں سوچتی تھی اورالجھتی رہتی تھی۔آج ایک عجیب طرح کااطمینان حاصل ہواہے۔''

سرعزیزالدین اس کے ہاتھ کوہولے سے تھپکنے لگے۔انہوں نے زبان سے کچھ نہیں کہا لیکن ان کے تھپکنے کابزرگانہ اندازاسے حوصلہ دے رہاتھا۔

☆======☆======☆

شادی ہوگئی احسان اپنے میکے سے رخصت ہوکراپنی سسرال آگیا۔ نکاح کے بعد مرجینا کے پاس رہ گیا۔ محلے پڑوس والوں کو بتایا گیا تھا کہ اس کا کوئی نہیں ہے۔اس لیے وہ شادی کے بعد مرجینا کے ساتھ ہی رہے گا۔

مرجینا کو ویران راتوں کا ہم سفرمل گیا تھا۔ وہ ہم سفر راتوں کو گوارا تھالیکن دن کے

اجالے میں ٹھوکریں کھاتا تھا۔صحیح طرح زندگی گزارنا جانتا ہی نہیں تھا۔مرجینا نے کہا۔"جب تک کسی کام دھندے سے نہیں لگتے ہو تب تک گھر کا کام کیا کرو۔ کچھ پکانا تو جانتے ہی ہو۔ ہمارے لیے سالن پکا کر رکھا کرو۔ دوپہر کو اسکول سے آتے وقت میں روٹیاں لے آیا کروں گی۔فارغ بیٹھے رہتے ہو اپنے اور ہمارے کپڑے ہی دھولیا کرو۔ میں اسکول سے آنے کے بعد استری کرلیا کروں گی۔اس طرح ہم مل جُل کر گھر کا اور باہر کا کام نمٹایا کریں گے۔"

اس نے ابتدا میں احکامات کی تعمیل کی۔ سالن پکایا تو کبھی اس میں نمک کم ہوتا کبھی مزے کا ہوتا اور کبھی بے مزہ ہوتا تھا۔ کپڑے دھوتا ضرور تھا مگر وہ اجلے نہیں ہوتے تھے۔ مرجینا صبح چھ بجے اسے جگاتی تھی۔ سات بجے اسکول چلی جاتی تھی۔ واپس آ کر دیکھتی تو وہ الٹے سیدھے کام کرنے کے بعد سویا ہوا ملتا تھا۔

جب ماں بہن کے ساتھ رہتا تھا تو وہاں کبھی کبھی فاقے کرنے پڑتے تھے۔ اکثر اپنے کپڑے دھونے کے لیے گھر میں صابن نہیں ہوتا تھا۔مرجینا کے پاس ہر طرح کی سہولت تھی۔ تین وقت تو کیا وہ چھ وقت بھی کھا سکتا تھا۔ دو چار نئے جوڑے پہننے کو مل گئے تھے پھر ہر روز دس روپے جیب خرچ کے لیے ملتے تھے۔دن کو یہ ساری نعمتیں ملتی تھیں اور رات کو مرجینا میسر ہوتی تھی۔ وہ اپنے مزاج کے مطابق عیش و آرام سے رہنے لگا تھا۔

ایک ہفتے بعد ہی اسے کچن کے کاموں سے نجات ملی۔ ماں بیٹی کو اس کا پکایا ہوا سالن پسند نہیں آتا تھا پھر کپڑے بھی صاف ستھرے نہیں دھلتے تھے۔اسے دھوبی کے کام سے بھی نجات مل گئی۔ایک روز اس نے کہا۔"مرجینا! میں باہر نکلتا ہوں تو محلے والے پوچھتے ہیں کہ میں کام کیا کرتا ہوں؟ میں نے فی الحال ان سے جھوٹ کہا ہے کہ شادی کے سلسلے میں پندرہ دنوں کے لیے چھٹی لے رکھی ہے اس کے بعد ڈیوٹی پر جایا کروں گا۔"

"تم میرے پاس رہ کر محلے والوں سے جھوٹ نہ بولا کرو۔ یہاں تو اپنی عادتیں بدلنے کی کوشش کرو۔"

"اس میں جھوٹ کیا ہے؟ مجھے گھر سے باہر نکلنا ہی پڑے گا۔آخر کہیں نہ کہیں تو کام دھندا تلاش کرنا ہی ہے۔ اماں اور رضیہ کو کچھ تو دینا ہی ہوگا۔ کہیں جا کر کماؤں گا تب ہی تو دے سکوں گا۔"

"تمہیں جیب خرچ کے لیے روزانہ دس روپے ملتے ہیں میں خوب سمجھ رہی ہوں تم صبح جایا کرو گے اور ان پیسوں سے عیاشی کرو گے ہوٹل بازی کرو گے اور شام کو آجایا کرو گے۔"

"مجھے بالکل ہی گیا گزرا نہ سمجھو۔ مجھے ماں بہن کو دینے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا ہی ہے۔"

''ٹھیک ہے تم روز صبح جایا کرو گے لیکن مجھے معلوم ہونا چاہیے کہ کہاں جا رہے ہو اور کیا کام کر رہے ہو۔''

''کیا میں جہاں کام کروں گا وہاں جا کر تم انکوائری کرو گی؟''

''بے شک کروں گی، میں آنکھیں بند کر کے تمہارے ساتھ زندگی نہیں گزاروں گی۔ مجھے تمہارے بارے میں ہر بات معلوم ہونی چاہیے۔ جب شوہر اپنی کمائی کھلاتا ہے تو بیوی کی ہر بات ہر حرکت پر نظر رکھتا ہے۔ میں اپنی کمائی کھلا رہی ہوں تو میں بھی ایسا ہی کروں گی۔''

اس نے سر جھکا لیا اور چپ رہا۔

ایسے وقت چپ رہنا ہی پڑتا ہے۔ پوری دنیا میں پورے معاشرے میں اور پورے گھر میں دینے والے ہاتھ کی حکمرانی ہوتی ہے۔ دینے والا ہاتھ مرد کا ہو تو وہ عورت پر حکومت کرتا ہے اور اگر دینے والا ہاتھ عورت کا ہو تو وہ مرد پر حاوی ہو جاتی ہے۔ یہ کہنے والوں کی زبانیں بند ہو جاتی ہیں کہ عورت کمزور ہوتی ہے۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ مرجینا نے کہا۔ ''جاؤ باہر دیکھو کون آیا ہے؟''

وہ اٹھ کر وہاں سے چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں واپس آ کر بولا۔ ''ایک بوڑھے سے آدمی ہیں۔ اپنا نام عزیز الدین بتاتے ہیں۔''

وہ فوراً ہی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ تیزی سے چلتی ہوئی دوسرے کمرے میں آئی پھر وہاں کا دروازہ کھول کر دیکھا تو سر عزیز الدین کھڑے ہوئے تھے۔ اس نے سلام کیا پھر کہا۔ ''سر! آپ آئے ہیں...... آیئے...... تشریف لایئے۔''

وہ کمرے میں آئے۔ اس نے کرسی پر بیٹھنے کو کہا پھر احسان سے تعارف کروایا۔ ''سر! یہ میرے شوہر ہیں۔ احسان اللہ نام ہے اور احسان یہ ہمارے اسکول کے ہیڈ ٹیچر ہیں۔ بہت ہی معزز بزرگ ہیں۔''

احسان نے انہیں سلام کیا، مصافحہ کیا پھر کہا۔ ''سر! آپ تشریف رکھیں میں آپ کے لیے گرم گرم چائے بنا کر لاتا ہوں۔''

انہوں نے کہا۔ ''مجھے شرمندہ نہ کریں۔ آپ میرے لیے کچن میں جائیں گے۔ نہیں یہاں تشریف رکھیں۔''

مرجینا نے کہا۔ ''میں چائے لے آتی ہوں۔''

وہ بولے۔ ''چائے اتنی ضروری نہیں ہے۔ جتنی ضروری باتیں ہیں۔ میں ایک اسٹیٹ ایجنٹ سے ایک زمین کے بارے میں باتیں کر کے آیا ہوں۔ بہت ہی اچھی زمین ہے سب

سے اچھی بات یہ ہے کہ اس کے ساتھ بہت بڑا پلے گراؤنڈ ہے۔ بچے وہاں طرح طرح کے کھیل، کھیل سکیں گے۔''

''یہ بتائیں کہ علاقہ کیسا ہے؟''

''چار پانچ برس کے اندر وہ ایک کمرشل ایریا بن جائے گا۔ ہمارا اسکول وہاں مرکزی حصے میں ہوگا۔ چاروں طرف سے آمدورفت رہے گی۔''

''زمین کتنی ہے؟''

''جتنی تم چاہتی ہو۔ بہت دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ یعنی چھ ہزار گز پر ہے۔ جب اسکول تعمیر ہوگا تو بچوں کے لیے بڑے بڑے ہوادار کمرے ہوں گے۔''

''جب اتنی بڑی زمین ہے تو قیمت بھی اچھی خاصی ہی ہوگی؟''

''ہاں...... قیمت تو ہے۔ پتا نہیں تم اتنی رقم لگا سکو گی یا نہیں؟ میں نے سوچا تمہیں بتا دوں اور زمین دکھا دوں۔ اگر پوری زمین نہ لے سکیں تو آدھی لو گی؟''

احسان حیرانی سے ان کی باتیں سن رہا تھا اور مرجینا کو ایسی نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے پہلی بار دیکھ رہا ہو۔ اس کا ذہن تسلیم ہی نہیں کر رہا تھا کہ وہ ایک بہت بڑی زمین خریدنے والی ہے۔ اگر خریدنے والی ہے تو اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ اپنے پاس بہت بڑی رقم چھپا کر رکھتی ہے۔ مرجینا نے پوچھا۔ ''آخر وہ کتنی رقم بتا رہے ہیں؟''

سر عزیز الدین نے کہا۔ ''دیکھا جائے تو قیمت زیادہ نہیں ہے بلکہ کم ہے وہ پورے چھ ہزار گز کے تین لاکھ چالیس ہزار مانگ رہے ہیں۔ اگر تم آدھی زمین لینا چاہو گی تو وہ ایک لاکھ ستر ہزار کی پڑے گی۔ اگر کچھ سودے بازی کی جائے تو شاید پانچ دس ہزار روپے اور کم ہو جائیں گے۔''

وہ بولی۔ ''نہیں...... میں پوری زمین خریدوں گی۔ بہت بڑا اسکول قائم کروں گی۔ آخر اس اسکول کو ایک دن نویں دسویں جماعت تک پہنچانا ہے۔''

احسان کا سر چکرانے لگا۔ وہ دیدے پھاڑ پھاڑ کر اپنی بیوی کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کے ساتھ دن اور راتیں گزارتا آرہا تھا اور اب تک اتنی بڑی حقیقت سے بے خبر تھا کہ اس کی بیوی کے پاس تین لاکھ چالیس ہزار روپے تھے۔ یعنی وہ ایک لکھ پتی بیوی کا شوہر ہے۔

مرجینا کہہ رہی تھی۔ ''سر! میں ابھی چل کر وہ زمین دیکھوں گی۔ اگر آپ کے بیان کے مطابق وہ اسکول کے لیے اچھی لوکیشن ہے تو آپ فوراً ہی ان سے سودا کر لیں۔''

''ٹھیک ہے بیٹی! ابھی چلو لیکن سودا کرنے کے لیے چار پانچ ہزار روپے پیشگی ادا

کرنے ہوں گے۔"

"ابھی تو میرے پاس نہیں ہیں، کل بینک کھلے گا تو میں رقم نکالوں گی۔"

احسان نے پھر آنکھیں پھاڑ کر مرجینا کو دیکھا۔ اس کی بیوی کا بینک اکاؤنٹ تھا پتا نہیں وہاں وہ کتنی دولت چھپا کر رکھتی ہو گی۔ وہ احسان سے بولی۔ "تم گھر میں رہو۔ ابھی بچے ٹیوشن پڑھنے کے لیے آئیں گے تم ان کا خیال رکھنا۔ میں جلد ہی واپس آ جاؤں گی۔"

سر عزیز الدین نے کہا۔ "انہیں بھی چلنا چاہیے اتنی بڑی جائیداد کی خرید و فروخت میں ان کی موجودگی بھی ضروری ہو گی۔"

"کوئی ضروری نہیں ہو گی آپ میرے ساتھ چلیں۔ میں نہیں چاہتی کہ ٹیوشن والے بچوں کا یہاں ناغہ ہو۔"

احسان نے کہا۔ "کوئی چھٹی نہیں ہو گی عینی ہے ناں، وہ بچوں کو سنبھال لے گی ہم جلدی واپس آ جائیں گے۔"

"میں اتنا بڑا گھر ایک چھوٹی سی بچی کے حوالے کر کے نہیں جاؤں گی۔ تمہیں یہاں رہنا چاہیے۔"

وہ سر عزیز الدین کے ساتھ باہر چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی وہ دھپ سے فرش پر ایسے بیٹھ گیا جیسے چکرا کر گر پڑا ہو۔ وہ اس عورت کے ساتھ رہ رہا تھا جو دال روٹی یا چٹنی کھاتی تھی۔ ہفتے میں ایک بار گوشت پکاتی تھی۔ دھوپ میں پڑھانے کے لیے اسکول جاتی تھی پھر گرم لو میں جھلستی ہوئی گھر واپس آتی تھی۔ ایسی عورت کے پاس تین لاکھ چالیس ہزار روپے تھے۔ جسے وہ آج کل میں خرچ کرنے والی تھی۔ اس کے بعد بھی اس کے اکاؤنٹ میں پیسے ہوں گے۔ میں اُلو کا پٹھا ہوں۔ مجھے معلوم ہی نہ ہو سکا کہ میں لاکھوں میں کھیلنے والی ملکہ کی گود میں بیٹھا ہوا ہوں۔

عینی اچھلتی کودتی باہر آئی پھر بولی۔ "امی ایک سر کے ساتھ کہیں گئیں ہیں ہمیں گھر میں رہنا چاہیے۔ بچے پڑھنے کے لیے آتے ہی ہوں گے۔"

وہ ایک کونے میں رکھی ہوئی جھاڑو اٹھا کر بولی۔ "آپ دوسرے کمرے میں جائیں میں اس کمرے کی صفائی کروں گی۔"

وہ اس کے ہاتھ سے جھاڑو لے کر بولا۔ "نہیں بیٹی! تم تو ہماری پیاری سی گڑیا ہو تم کو یہ کام نہیں کرنے چاہئیں میں صفائی کرتا ہوں۔"

احسان اس کے ہاتھ سے جھاڑو لے کر فرش صاف کرنے لگا۔ وہ بولی۔ "میں کیا کروں؟"

''مجھ سے باتیں کرو، یہ بتاؤ تم ماں بیٹی اس چھوٹے سے مکان میں کیوں رہتے ہو؟ اپنی امی سے کہو ایک بڑا سا مکان لیں ایک بڑی سی گاڑی خریدیں۔ تمہاری امی کتنی خوبصورت ہیں انہیں دھوپ میں جھلسنا نہیں چاہیے۔''

''جب میرے ابو زندہ تھے تو انہیں باہر نہیں جانے دیتے تھے۔ آپ انہیں کیوں باہر جانے دیتے ہیں؟''

''یہ بتاؤ، کیا تمہارے ابو بہت دولت مند تھے؟ لاکھوں روپے کماتے تھے؟''

''یہ تو میں نہیں جانتی ہوں؟''

''ہاں، تم تو بچی ہو تمہاری امی کو سمجھنا بہت مشکل ہے میں ابھی تک انہیں سمجھ نہیں پایا ہوں۔''

اس نے فرش پر جھاڑو لگانے کے دوران الماری کی طرف دیکھا۔ اس نے کئی بار مرجینا کو الماری کھولتے اور بند کرتے دیکھا تھا۔ اس الماری کے اندر ایک چھوٹا سا سیف تھا۔ جسے وہ ایک چابی سے کھولا کرتی تھی۔

اس نے سوچا اس سیف میں نقد رقم نہیں ہوگی۔ اگر ہوتی تو وہ ابھی پیشگی دینے کے لیے لے جاتی۔ یہ عورت بہت چالاک ہے الماری میں ایک ہزار بھی چھپا کر نہیں رکھتی ہوگی۔

بچے پڑھنے کے لیے آ گئے تھے۔ عینی نے ان کے لیے چٹائیاں بچھائیں وہ ان پر بیٹھ کر پڑھنے لگے۔ مرجینا تقریباً ایک گھنٹے بعد آئی۔ گھر میں آ کر حیرانی سے دیکھا، گھر بہت صاف ستھرا نظر آ رہا تھا۔ ہر چیز اپنی جگہ سلیقے سے رکھی ہوئی تھی۔ احسان نے فخریہ کہا۔''میں نے صفائی کی ہے۔ تم دیکھ لینا روز اسی طرح گھر کو چمکا کر رکھوں گا۔''

وہ بولی۔''شاباش! اب تم ذمے داریوں کو سمجھنے لگے ہو۔ میں بچوں کو پڑھا کر آتی ہوں۔''

''ابھی تو اتنی دور سے آئی ہو۔ تھک گئی ہوگی آج بچوں کو چھٹی دے دو۔''

وہ دوسرے کمرے میں بچوں کے پاس جانا چاہتی تھی۔ اس نے پوچھا۔''کیا تمہیں زمین پسند آئی ہے؟''

''ہاں...... بہت اچھی زمین ہے میں اپنی خواہش کے مطابق ایک بہت بڑا اسکول قائم کر سکوں گی۔''

''لیکن وہ قیمت بہت زیادہ بتا رہے ہیں۔ تمہارے سر عزیز الدین ان سے معاملات نہیں کر سکیں گے۔ تمہیں ان معاملات میں مجھ پر بھروسا کرنا چاہیے مجھے اچھا خاص تجربہ ہے۔ میں اسٹیٹ ایجنٹ والوں سے کم سے کم قیمت کروا سکتا ہوں۔''

مرجینا نے اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا پھر کہا۔''میرے ایک سوال کا جواب

ایک زمین کی لمبائی دس گز ہے اور چوڑائی چھ گز ہے۔ اس کا کل رقبہ کتنا ہوا؟ اگر اس زمین کی قیمت سو روپے ہے تو اس کے چوتھائی حصے کی قیمت کیا ہوگی؟ ابھی پانچویں جماعت کے بچے سے پوچھوں گی تو وہ فوراً جواب دے گا۔ تم کتنی دیر میں جواب دو گے؟''

وہ جھجکتے ہوئے بولا۔ ''یہ تم مجھ کو حساب کتاب میں کیوں الجھا رہی ہو؟ تم میرے ساتھ رہو گی تو حساب تم کرو گی اور معاملات میں طے کروں گا۔''

عینی وہاں کھڑی سن رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ''امی اس زمین کا کل رقبہ ساٹھ گز ہوگا اور اس کی چوتھائی پچیس روپے ہوگی۔''

مرجینا نے ناگواری سے کہا۔ ''سن لیا، تم ایک سالن تو پکا نہیں سکتے۔ کپڑے صاف نہیں دھو سکتے۔ آج پہلی بار تم نے گھر کی صفائی اچھی طرح کی ہے۔ یہ کرتے رہا کرو۔''

وہ دوسرے کمرے میں بچوں کے پاس چلی گئی۔ اس نے عینی کو دیکھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے منہ دبا کر ہنستی ہوئی ماں کے پیچھے چلی گئی۔ وہ بھی پلٹ کر جانا چاہتا تھا پھر رک گیا اور الماری کو سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔

رات کو کھانے کے بعد جب عینی اپنے کمرے میں سو گئی تو وہ دوسرے کمرے میں آیا۔ مرجینا بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی۔ وہ اس کے پیروں کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ اس نے پوچھا۔ ''وہاں کیوں بیٹھے ہو؟''

''تم دن بھر چلتی پھرتی رہتی ہو۔ کام کرتی رہتی ہو۔ تھک جاتی ہو گی۔''

وہ اس کے پاؤں دبانے لگا۔ وہ بولی۔ ''تم جیسے بھی ہو مگر ایک خدمت گزار شوہر ہو۔''

''میں تو ساری عمر تمہاری خدمت کرتا رہوں گا لیکن تم نہ جانے کیوں مجھ پر بھروسا نہیں کرتی ہو؟''

''کبھی تم کوئی بھروسے والا کام کر کے دکھاؤ۔''

''تم مجھے ایک موقع دو گی تو میں ایسا کام کر کے دکھاؤں گا کہ تم حیران رہ جاؤ گی۔''

''میں تمہیں کیا موقع دوں......؟ کیا میں تمہیں کچھ کرنے سے روک رہی ہوں۔''

''تم بہت اچھی ہو۔ مجھے روکتی نہیں ہو۔ میں جانتا ہوں مجھے حوصلہ دوں گی۔ میرے پاس ایک زبردست کاروبار کا آئیڈیا ہے۔''

اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''اچھا......!''

وہ بولا۔ ''گھر کی عورتیں راشن خریدنے یا دوسری ضرورت کی چیزیں خریدنے کے لیے

باہر نکلتی ہیں۔ دور دور تک بازار جاتی ہیں اگر میں تھوک مارکیٹ سے سامان خرید کر گھر گھر پہنچاؤں اور انہیں مناسب قیمت پر فروخت کروں تو تمام عورتیں گھر بیٹھے خریداری کر سکیں گی۔''

وہ قائل ہو کر بولی۔''واقعی آئیڈیا تو بہت اچھا ہے۔''

وہ خوش ہو کر بولا۔''میرے پاس ایک سے بڑھ کر ایک آئیڈیا ہے۔ بس پیسے سے مار کھا جاتا ہوں۔ اگر میرے پاس سرمایہ ہو تو میں کیا سے کیا کر جاؤں۔ دیکھتے ہی دیکھتے لکھ پتی اور کروڑ پتی بن جاؤں۔''

''بس کرو، اتنے اونچے بھی نہ اُڑو۔ پہلے محنت کرو، اپنی محنت سے رقم جمع کرو، پھر کاروبار کرو۔''

''کیسی غیروں جیسی باتیں کر رہی ہو......؟ کیا تم مجھے تھوڑی سی رقم نہیں دے سکتیں؟ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ جتنی رقم لوں گا ایک ہفتے میں اسے دگنی اور تگنی کر دوں گا۔''

''اور اگر میری رقم ڈبو دو گے تو میں تمہارا کیا بگاڑ لوں گی۔''

''میں تمہیں لکھ کر دیتا ہوں۔ رقم نہیں ڈوبے گی۔''

''میں تمہاری وہ تحریر کس کے پاس لے کر جاؤں گی۔ کون میری رقم واپس دلوائے گا؟''

''مرجینا! میں تمہارا شوہر ہوں، مجازی خدا ہوں۔ تمہیں مجھ پر کچھ تو بھروسا کرنا چاہیے۔''

''بے شک، اس رشتے سے بھروسا کرنا چاہیے۔ اگر میں تمہیں پانچ ہزار روپے دوں تو تم کتنا منافع کما کر دو گے؟''

وہ جلدی سے بولا۔''میں پانچ کے دس ہزار بنا کر دوں گا اور ایک ہفتے کے اندر تمہاری اصل رقم واپس کر دوں گا۔ اس کے بعد منافع دیتا رہوں گا۔''

''اچھی بات ہے۔ کل میں بینک جاؤں گی تو تمہارے لیے بھی رقم لاؤں گی۔ تمہیں پانچ ہزار روپے دے کر ضرور آزماؤں گی۔''

وہ خوش ہو کر اس سے لپٹ گیا۔ اسے چومنے لگا اس کی تعریفیں کرنے لگا۔

یوں آدھی رات گزر گئی۔ مرجینا نے صبح بینک بھی جانا تھا۔ اس لیے وہ سو گئی۔ دوسرے کمرے میں بیٹی سو رہی تھی۔ گھر میں گہری خاموشی چھا گئی تھی۔ وہ تھوڑی دیر تک مرجینا کے پاس لیٹا رہا پھر اس نے آنکھیں کھول کر مرجینا کو دیکھا۔ اسے یقین ہو گیا کہ وہ گہری نیند میں ہے تکیے کے نیچے سے چابیوں کا گچھا ذرا سا جھلک رہا تھا۔ اس کی انگلیاں رینگتی ہوئی تکیے کے نیچے پہنچ گئیں پھر اس گچھے کو کھینچتی ہوئی باہر لے آئیں۔

وہ ان چابیوں کو مٹھی میں دبوچ کر آہستگی سے بستر سے اتر گیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا وہ

بدستور گہری نیند میں تھی۔ وہ دبے قدموں چلتا ہوا اسٹور روم میں آیا۔ وہاں بہت سا سامان رکھا ہوا تھا۔ کپڑے دھونے والے صابن کی کئی ٹکیاں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ اس نے دو ٹکیاں اٹھالیں پھر وہاں سے غسل خانے میں آ گیا۔

اس نے کبھی محنت مزدوری نہیں کی تھی لیکن جب بھی تن آسانی سے رقم کمانے کا موقع ہاتھ آیا تھا تو اس طرح کی محنت ضرور کرتا تھا۔ اس نے ایک مگ میں پانی لے کر صابن کی دونوں ٹکیاں اس میں بھگودیں۔ وہ جانتا تھا کہ چابی کے گچھے میں سے کون سی چابی درازوں کی ہے اور کون سی الماری کی ہے۔ ان میں سے چھوٹی چابی الماری کے سیف کی تھی۔ اس نے الماری اور سیف کی چابیاں گچھے سے نکال لیں۔

پھر اس نے صابن کی ٹکیہ کو پانی سے نکالا وہ دونوں گیلی ہو چکی تھیں۔ اس نے دونوں چابیوں کو ایک ایک کر کے ٹکیہ پر رکھ کر دبایا۔ ہلکے دباؤ کے ساتھ اس صابن پر ایک ایک چابی کا سانچہ بنا گیا۔ اس نے ان چابیوں کا اور سانچوں کا موازنہ کیا پھر مطمئن ہو گیا۔ سانچے بالکل صحیح تیار ہوئے تھے۔

اس نے چابیوں کو پھر گچھے میں پرودیا۔ صابن کی دونوں ٹکیہ لے کر کمرے میں آیا۔ وہ بے خبر سو رہی تھی۔ اس نے صابن کی دونوں ٹکیوں کو الماری کے اوپر والے حصے میں رکھ دیا اور پھر واپس بیڈ پر آ کر لیٹ گیا۔ کروٹ بدل کر تھوڑی دیر مرجینا کو دیکھتا رہا پھر آہستہ سے ہاتھ بڑھا کر چابیوں کے گچھے کو تکیے کے نیچے رکھ دیا۔ یوں آئندہ ہونے والی واردات کا پہلا مرحلہ طے ہو چکا تھا۔

اگلی صبح مرجینا نے کہا۔ "میں بینک جاؤں گی تم عینی کو اسکول لے جا کر چھوڑ دو۔ پھر چھٹی کے وقت واپس لے آنا۔ میں تمہارے لیے بھی پانچ ہزار روپے لے آؤں گی۔"

وہ خوش ہو کر بولا۔ "میں عینی کو حفاظت سے لے جاؤں گا اور لے آؤں گا پھر اماں سے بھی مل آؤں گا۔ ان کی بھی خیر خیریت معلوم کرنی ہے۔"

وہ سات بجے عینی کو لے کر نکلا اسے اسکول پہنچانے کے بعد اپنی اماں کے پاس آیا۔ ماں اور بہن دونوں ہی کام پر جانے والی تھیں۔ اس نے کہا۔ "ابھی نہ جاؤ۔ میں ایک ایسی خبر سنانے آیا ہوں کہ تم حیران ہو جاؤ گی، کبھی یقین نہیں کرو گی۔"

ماں نے کہا۔ "ایسی حیرانی کی کیا بات ہے؟ بڑا خوش دکھائی دے رہا ہے کیا الہ دین کا چراغ ہاتھ لگ گیا ہے؟"

"اماں بس یہی سمجھو، ہم لاکھوں روپے کمانے والے ہیں۔"

''بس کر بیٹا، تیری یہ باتیں میں برسوں سے سنتی آ رہی ہوں۔''

''اماں، پہلے میری پوری بات تو سنو۔ تم یقین نہیں کروگی مرجینا لکھ پتی ہے۔''

اس نے تعجب سے پوچھا۔ ''کیا پیتی ہے؟''

''پیتی نہیں اماں! پتی جیسے چائے کی پتی ہوتی ہے جیسے عورت کا پتی ہوتا ہے ویسے ہی و لکھ پتی ہے اور میں پتی ہوتے ہوئے بھی ککھ پتی ہوں۔ وہ لکھ پتی ہے، بڑی گھنی ہے اند سے کچھ ہے اور کچھ دکھائی دیتی ہے۔ اس نے کسی بینک میں لاکھوں روپے جمع کرر کھے ہیں۔ ابھی دو چار روز میں تین لاکھ چالیس ہزار روپے نکلوا کے لانے والی ہے۔''

وہ دونوں حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھ رہی تھیں بہن نے کہا۔ ''بھیا! مجھے تو یقین نہیں آتا کہ اس کے پاس لاکھوں روپے ہوں گے۔''

''دو چار روز میں یقین ہو جائے گا۔ میں اس کی الماری اور سیف کی چابیوں کا سانچہ بن کرلا یا ہوں، یہ دیکھو!''

اس نے جیب سے صابن کی دو ٹکیہ نکالیں۔ ماں کو دکھائیں پھر کہا۔ ''تم لنگڑے چابی والے سے پہلے بھی چابی بنوا چکی ہو۔ اسے ابھی لے جاؤ اور اس سے کہو ہمیں ایک گھنٹے کے اندر چابیاں بنا کر دے جو بھی پیسے مانگے اس کے منہ پر دے مارنا۔''

''اے بیٹا! وہ بہت زیادہ منہ پھاڑتا ہے۔ سمجھتا ہے کہ ہم کہیں نہ کہیں واردات کرنے جا رہے ہیں۔ یہ تین چابیوں کے سانچے ہیں۔ وہ کم از کم تین سو روپے ضرور لے گا۔''

''لیتا ہے تو لینے دو، تم کہیں سے بھی دے دو۔''

''ارے، میں کہاں سے دوں گی کیا میرے پاس قارون کا خزانہ رکھا ہوا ہے؟''

''میں نہیں جانتا، لاکھوں روپے کمانا ہیں یا نہیں؟ کیا تین سو روپے کے لیے لاکھوں روپے ہاتھ سے نکل جانے دو گی؟''

ماں نے بے بسی سے پہلے بیٹی اور پھر بیٹے کو دیکھا۔ بیٹے نے کہا۔ ''اماں! لمبا ہاتھ مارنے کے لیے جوا کھیلنا ہی پڑتا ہے لگا دو اپنے تین سو روپے۔''

''وہ بولی۔ ''میرے پاس ڈھائی سو روپے ہیں۔''

احسان نے دس دس کے نوٹ نکالتے ہوئے کہا۔ ''یہ پچاس روپے لو اور جاؤ۔''

ماں وہاں سے چلی گئی وہ پلنگ پر آ کر لیٹ گیا۔ بہن نے پوچھا۔ ''کیا وہ سچ مچ مال دار ہے؟ اس کا گھر کتنا بڑا ہے؟''

''بہت معمولی سا چھوٹا سا مکان ہے۔ وہ بہت سیدھی سادی اور غریبوں جیسی زندگی

گزارتی ہے۔اسے دیکھ کر کوئی کہہ بھی نہیں سکتا کہ وہ کتنی مالدار ہوگی۔''

وہ دوسری طرف منہ کر کے سو گیا۔ بڑی دیر تک سوتا رہا۔ ماں نے آ کر اسے اٹھایا پھر کہا۔''لے یہ تیرا کام ہو گیا۔''

اس نے تینوں چابیوں کو ہاتھ میں لے کر اچھی طرح دیکھا۔انہیں سانچے سے ملا کر دیکھا پھر کہا۔''لنگڑا کمال کی چابیاں تیار کرتا ہے۔ مال ہاتھ آئے گا تو اسے اور تین سو روپے دوں گا۔اب میں جا رہا ہوں۔

ماں نے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔''دیکھو بیٹا! ہوشیاری سے کام کرنا۔ایک بار حوالات میں گیا تھا۔ایسے ڈنڈے پڑے تھے کہ ہفتوں تک بستر پر پڑا رہا تھا۔''

''فکر نہ کرو اماں، ہم دو چار دنوں میں لکھ پتی ہو جائیں گے، میرے لیے بس دعا کرتی رہنا۔''

وہ وہاں سے چلا آیا۔اسکول کی چھٹی ہوئی تو عینی کو لے کر گھر پہنچا۔مرجینا اپنی بیٹی کا انتظار کر رہی تھی۔اس کے لیے بھوکی بیٹھی ہوئی تھی۔ سالن گرم کرنے کے بعد وہ تینوں کھانا کھانے لگے۔احسان نے پوچھا۔''کیا زمین کا بیعانہ ہو چکا ہے؟''

''ہاں...... میں نے پانچ ہزار روپے دیئے ہیں۔ پرسوں تک کاغذات تیار ہو جائیں گے۔تین لاکھ پچیس ہزار میں سودا ہو چکا ہے، میں پرسوں بینک سے رقم نکلوا لاؤں گی۔''

''میرے لیے رقم لائی ہو؟''

''ہاں......ابھی کھانے کے بعد دوں گی۔ یہ بتاؤ کہ تم کام کیا کرنا چاہتے ہو؟''

''میں نے اماں سے بات کی تھی وہ کہہ رہی تھیں کہ ہزار روپے میں ایک ریڑھا مل جائے گا۔ میں سبزی منڈی سے تازہ سبزیاں خرید کر اس ریڑھے پر رکھوں گا اور گلی گلی سبزیاں بیچتا پھروں گا۔شام تک چار پانچ سو روپے کما لیا کروں گا۔اگر میں تمہیں روز سو روپے لا کر دیا کروں گا تو ایک مہینے میں تمہاری اصل رقم میں سے تین ہزار روپے وصول ہو جائیں گے۔''

''اگر تم واقعی مجھے روزانہ سو روپے دیا کرو گے تو میں تم پر بھروسا کرنے لگوں گی۔آئندہ بھی تمہاری مدد کروں گی۔''

وہ شام کو پانچ ہزار روپے لے کر نکلا پھر سیدھا اماں کے گھر پہنچا۔انہیں پانچ سو روپے دیتے ہوئے کہا۔''لو اماں عیش کرو، ابھی تو چھوٹی لاٹری نکلی ہے۔ پرسوں بڑی لاٹری نکلنے والی ہے۔''

''تیرے پاس تو بڑے بڑے نوٹ ہیں۔کیا تیری جورو نے دیئے ہیں؟''

"ابھی مجھے فی الحال چھوٹا سا کاروبار کرنے کے لیے دیئے ہیں۔ خود کو بہت چالاک سمجھتی ہے۔ اپنے پاس دولت کا پہاڑ رکھا ہے اور مجھے اس میں سے ایک ذرہ دیا ہے۔ میں بھی چور راستے سے پہاڑ کاٹنا جانتا ہوں۔"

"پڑوسن کو روپوں کی سخت ضرورت ہے۔ وہ اپنا پرائز بونڈ بیچ رہی ہے۔ اسے خرید لے ہوسکتا ہے تیری قسمت بھی چمک جائے اور لاکھوں روپے کے انعامات نکل آئیں۔"

اس نے ایک ہزار روپے نکال کر دیئے۔ ماں پڑوسن کے ہاں گئی پھر وہاں سے ایک پرائز بونڈ لے آئی۔ اسے دیتے ہوئے بولی۔ "دو روز بعد انعامات نکلنے والے ہیں۔ پڑوسن کو صبر کرنا چاہیے تھا لیکن وہ مایوس ہوگئی ہے۔ کہتی ہے چار برس ہو چکے ہیں ایک بار بھی چھوٹا سا انعام نہیں نکلا ہے۔ اس لیے اس نے بیچ دیا ہے۔"

وہ پرائز بونڈ کو جیب میں رکھ کر جانے لگا ماں نے پوچھا۔ "کہاں جا رہا ہے؟"

"ایک اور جگہ ہے، جہاں قسمت آزمائی جاتی ہے۔ میرا ستارہ عروج پر ہے۔ آج وہاں سے بھی لمبا ہاتھ ماروں گا۔"

وہ ایک جوئے کے اڈے پر پہنچ گیا۔ وہاں دن رات جوا چلتا رہتا تھا۔ وہاں پر احسان جیسے لوگ یہی سوچ کر آتے تھے کہ ان کا ستارہ عروج پر ہے اور وہاں سے لمبا ہاتھ مار کر جائیں گے لیکن دس میں سے کوئی ایک نصیب والا ہوتا تھا۔ ورنہ وہاں سے بھی قسمت کے جوتے کھا کر جاتے تھے۔

اس نے پانچ سو روپے ماں کو دیئے تھے۔ ایک ہزار کا پرائز بونڈ خریدا تھا اور اب جیب میں ساڑھے تین ہزار روپے تھے۔ رات کے دس بجے اس کی جیب میں صرف دس روپے تھے اور یہ گھر واپس جانے کا کرایہ تھا۔

لوٹ کر بدھو گھر کو آئے۔ وہ گھر آ گیا۔ وہاں سر عزیز الدین ایک کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ مرجینا نے کہا۔ "آدھی رات ہونے والی ہے پہلے تو اتنی رات گئے تک گھر سے باہر نہیں گئے۔ آج کیا جیب میں رقم اچھل رہی تھی؟"

وہ تھکے ہوئے انداز میں ایک کرسی پر بیٹھ کر بولا۔ "ریڑھے اور سبزی کی بھاگ دوڑ میں لگا ہوا تھا۔ پورے دو ہزار میں ایک ریڑھا ملا ہے۔ باقی تین ہزار روپے اماں کو دے آیا ہوں۔ وہ صبح سویرے پانچ بجے منڈی جائیں گی۔ وہاں سے سبزی لے کر آئیں گی پھر میں یہاں سے جاؤں گا اور ریڑھے پر سبزیاں رکھ کر بیچوں گا۔"

سر عزیز الدین نے متاثر ہو کر کہا۔ "آپ بہت محنتی ہیں ہم بھی دن رات محنت کرتے

ہیں۔ اللہ تعالیٰ بھی محنت کرنے والوں کو ایک دن صلہ دیتا ہے۔

مرجینا نے کہا۔ ''آپ ان باتوں کو چھوڑیں اپنی بات کریں۔''

انہوں نے کہا۔ ''ہماری باتیں تقریباً ہو چکی ہیں۔ اب یہ رہ گیا ہے کہ زمین کا قبضہ ملتے ہی چاروں طرف احاطے کی دیوار کھڑی کرنا ہوگی۔ اسکول کے دو تین نقشے میرے پاس پڑے ہوئے ہیں۔ تم دیکھ لو جو تمہیں پسند ہوگا اس کے مطابق تعمیر شروع ہو جائے گی۔''

وہ بولی۔ ''اس کا مطلب ہے پرسوں احاطے کی دیوار کے لیے بھی رقم نکالنی ہوگی۔''

''ہاں، رقم ہاتھ میں ہو تو اچھا ہے۔ کام فوراً شروع ہو جائے گا۔''

''تین لاکھ پچیس ہزار روپے زمین کے مالک کو ادا کرنے ہیں۔ باقی اور پچیس ہزار لے آؤں گی۔ کیا ان سے کام شروع ہو جائے گا۔''

''ہاں، اتنی رقم کافی ہے اور اب میں چلتا ہوں۔''

وہ ان کے ساتھ دروازے تک چلتی ہوئی آئی پھر بولی۔ ''آدھی رات ہو چکی ہے آپ کو بہت زیادہ محنت کرنا پڑ رہی ہے۔''

''محنت کریں گے تو پھل ملے گا جوانی میں نہیں ملا تو ہو سکتا ہے بڑھاپے میں مل جائے۔ خدا سے یہی دعا ہے تمہاری رقم کو کسی کی نظر نہ لگے۔ بینک سے واپسی پر محتاط رہنا۔ چور اچکے تاک میں رہتے ہیں۔''

''آپ فکر نہ کریں، میں نے اپنے بچپن سے اب تک بڑی ٹھوکریں کھائی ہیں۔ حالات کی دھوپ میں جلتی رہی ہوں۔ مجھے پھونک پھونک کر قدم رکھنا آتا ہے۔''

وہ خدا حافظ کہہ کر چلے گئے۔ اس نے دروازے کو اچھی طرح بند کر لیا۔ احسان نے پوچھا۔ ''کیا تم کل بینک جاؤ گی؟''

''ہاں...... پرسوں بینک ہالی ڈے ہے اس لیے کل ہی رقم نکال لوں گی۔''

''مرجینا! کوئی چھوٹی موٹی رقم نہیں ہے۔ تم کہو تو میں بھی ساتھ چلوں گا۔''

''نہیں...... تم نے نیا کام شروع کیا ہے۔ اپنے کام سے لگے رہو۔''

وہ تو یہی جانتی تھی کہ اسے صبح سویرے اٹھ کر سبزی فروخت کرنے جانا ہے۔ لہٰذا وہ سب جلدی سو گئے۔ صبح مرجینا نے ایک درخواست لکھ کر عینی کو دی اور کہا۔ ''یہ اپنی ہیڈ مسٹریس کو دے دینا۔ میں تین دنوں کی چھٹیاں لے رہی ہوں۔ تمہارے ساتھ اسکول نہیں جا سکوں گی۔ تمہارے ابو تمہیں پہنچا دیں گے واپسی میں اکیلی بس میں بیٹھ کر آ جانا۔''

احسان عینی کو لے کر اسکول آیا اسے چھوڑ کر اس بینک کی طرف گیا جہاں مرجینا پہنچنے والی تھی۔ اس کے اندر کھلبلی سی ہو رہی تھی۔ وہ یقین کرنا چاہتا تھا کہ آج وہ بینک سے رقم نکال کر لا رہی ہے۔ وہ بینک سے ذرا دور کھڑا اس کا انتظار کرتا رہا وہ ساڑھے نو بجے نظر آئی۔ فٹ پاتھ پر چلتی ہوئی آ رہی تھی پھر اس بینک کی عمارت میں داخل ہو گئی تھی۔

بینک کا عملہ مستعد ہو تو پندرہ منٹ میں رقم مل جاتی ہے۔ اسے توقع تھی کہ وہ اتنی دیر میں رقم لے کر آئے گی لیکن بہت دیر ہو گئی۔ ایک گھنٹا گزر گیا۔ اسے تشویش ہوئی کہ آخر وہ کیا کر رہی ہے؟ اتنی دیر کیوں ہو رہی ہے؟''

اس نے مزید آدھے گھنٹے انتظار کیا پھر بے چینی بڑھ گئی۔ اتنی دیر نہیں ہونی چاہیے پھر کیوں ہو رہی ہے؟ اب اس سے صبر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ اندر جا کر اسے دیکھنا چاہتا تھا۔

پھر وہ جیسے ہی بینک کی عمارت کی طرف جانے لگا تو وہ نظر آ گئی۔ اپنا چھوٹا سا بیگ سنبھالتی ہوئی آ رہی تھی۔ جس فٹ پاتھ پر چلتی ہوئی آئی تھی۔ اسی پر چلتی ہوئی بس اسٹاپ کی طرف جانے لگی۔ وہ اس سے کافی فاصلہ رکھ کر پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ ایسے ہی وقت ایک شخص مرجینا سے ٹکرایا پھر یکبارگی اس کا ہینڈ بیگ چھین کر بھاگنے لگا۔

یہ اس کی کم بختی تھی کہ وہ بھاگتا ہوا احسان کی طرف آ رہا تھا اور قریب ہی ایک گلی میں مڑنا چاہتا تھا۔ احسان نے ایک چھلانگ لگا کر اسے دبوچ لیا۔ دونوں زمین پر لڑھکتے ہوئے دور تک گئے۔ وہ خود کو چھڑا کر بھاگنا چاہتا تھا لیکن احسان اسے دبوچ کر گھونسے مار رہا تھا۔ مرجینا چیختی چلاتی آ رہی تھی۔ اس کے پیچھے کچھ لوگ تھے اور معلوم کرنا چاہتے تھے کہ معاملہ کیا ہے؟

دو سپاہی بھی ان میں شامل تھے۔ انہوں نے اس چور کو پکڑ لیا۔ مرجینا نے قریب آ کر احسان کو دیکھا پھر اس چور کو دیکھا جو پولیس کی گرفت میں تھا۔ احسان نے ہانپتے ہوئے اس کا بیگ اسے دیتے ہوئے کہا۔ ''اگر میں نہ ہوتا تو یہ ساری رقم لے کر بھاگ جاتا۔''

سپاہی اس چور کی پٹائی کر رہے تھے۔ کچھ لوگ اسے گالیاں دے رہے تھے۔ مرجینا نے بیگ کی زِپ کھول کر اندر جھانک کر دیکھا پھر مطمئن ہو کر زپ بند کر دی۔ احسان اپنے لباس پر سے مٹی جھاڑ رہا تھا۔ وہ بھی اس کے لباس کو اِدھر اُدھر سے صاف کرتے ہوئے بولی۔ ''ہم پولیس تھانے کے چکر میں نہیں پڑیں گے۔''

سپاہیوں نے اس چور کی پٹائی کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ جائیں ہم اس سے نمٹ لیں گے۔''

وہ دونوں وہاں سے چلتے ہوئے فٹ پاتھ پر آئے۔ وہ بولی۔ ''تم تو اپنا نیا دھندا شروع کرنے گئے تھے؟''

''ہاں...... جا رہا تھا مگر میرا دل نہیں مان رہا تھا۔ تم بہت بڑی رقم لے کر آنے والی تھیں۔ میں نے سوچا کہ میں دور ہی دور سے تمہاری نگرانی کروں گا اور میری یہ دانش مندی کام آ گئی ہے۔''

وہ دونوں بس اسٹاپ پر رک گئے۔ وہ محبت سے اس کا ہاتھ تھام کر بولی۔ ''شادی کے بعد آج تم نے پہلی بار مرد ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ میں بہت خوش ہوں اور تم پر فخر کرتی ہوں......''

''اگر فخر کر رہی ہو تو میری ایک بات مان لو۔ پیسے زیادہ بچانے کی فکر نہ کرو۔ اتنی رقم لے کر بس سے سفر کرنا مناسب نہیں ہے یہاں سے رکشا یا ٹیکسی میں چلو۔''

وہ ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر گھر آ گئے۔ ٹیکسی والے کو کرایہ دے کر رخصت کیا پھر تالا کھول کر اندر آئے۔ اندر آتے ہی مرجینا نے بیگ کو ایک طرف رکھا دروازے کو بند کیا پھر ایک دم سے احسان کی گردن میں بانہیں ڈال کر لپٹ گئی۔ خوشی سے روتے ہوئے بولی۔ ''آج تم نے اپنی بہت بڑی ذمے داری نبھائی ہے۔ دانش مندی کا ثبوت دیا ہے ایک محافظ بن کر چوری چھپے میری نگرانی کی ہے تم نے میرا دل جیتا ہے میرا اعتماد جیت لیا ہے۔ تمہیں نہیں پتا آج مجھے کیسی خوشی ملی ہے۔ مجھے مکمل مرد ملا ہے ایک مکمل محافظ اور مکمل مجازی خدا ملا ہے۔''

وہ اسے چوم کر بولا۔ ''میں ایسا ہی ہوں۔ تم مجھے غلط سمجھتی رہی ہو۔''

وہ انکار میں سر ہلا کر بولی۔ ''جھوٹ نہ بولو، تمہاری یہی عادت مجھے کھٹکتی ہے اور میں تم پر اعتماد نہیں کرتی ہوں۔ کیا تم جھوٹ اور فریب سے باز نہیں آ سکتے؟''

''اگر تم یہی سمجھتی ہو۔ تو میں کوئی غلطی کروں تو تم مجھے ٹوک سکتی ہو۔ مجھے گائیڈ کرو میں اپنی بری عادتوں سے باز آ جاؤں گا۔''

''تم چاہو تو خود کو بدل سکتے ہو، میرے معتبر ساتھی بن سکتے ہو۔ میں پریشان رہتی ہوں سوچتی رہتی ہوں کہ جو لاکھوں روپے کا کاروبار شروع کیا ہے تو اسے تنہا کب تک سنبھالتی رہوں گی؟ سر عزیز الدین بہت ہی سچے اور دیانتدار ہے۔ مجھے ان پر بھروسا ہے لیکن کیا ہی اچھا ہو کہ میں اپنے مجازی خدا پر بھروسا کروں اور پھر سب کچھ اس کے حوالے کر دوں۔''

''میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ بھی تمہارا اعتماد حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہوں

گا۔“

مرجینا نے اپنا ہینڈ بیگ اٹھالیا۔احسان اسے دونوں بازوؤں میں اٹھا کر بیڈ روم میں آ گیا۔حالات نے اچانک ہی اسے ہیرو بنا دیا تھا۔مرجینا اس پر صدقے واری ہو رہی تھی۔ اس قدر لپٹ کر اس کو چوم رہی تھی، پیار دے رہی تھی جیسے اس پر قربان ہو رہی ہے۔اسے پہلی بار یقین ہو رہا تھا کہ برسوں کی تنہائیاں سہنے کے بعد سچا جیون ساتھی ملا ہے۔

وہ محبوب کی جدائی سہنے کے بعد بڑے ذہنی کرب میں مبتلا رہی تھی۔کسی پر بھروسا نہیں کر سکتی تھی۔وہ لاکھوں روپے اس کے اندر کانٹوں کی طرح چبھتے رہتے تھے۔سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اتنی بڑی رقم کو کس مصرف میں لایا جائے اور نقصان اٹھائے بغیر اپنا اور اپنی بیٹی کا مستقبل سنوارا جائے۔

لاکھوں روپے کی طاقت بہت ہوتی ہے اگر مرد کے پاس ہوں......اور اگر عورت کے پاس ہوں تو طرح طرح کے اندیشے پیدا ہوتے رہتے ہیں۔خطرات منڈلانے لگتے ہیں اپنے ہی لوگ آستین کے سانپ بن جاتے ہیں۔ایسے میں ایک تنہا اور کمزور عورت بھروسا کرے تو کس پر کرے؟

ایسے میں احسان نے اپنا ایک نیا روپ دکھایا تھا تو وہ خوشی سے رونے لگی تھی۔اس پر اعتماد کرنے لگی تھی۔اس نے بھی وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنے بہترین عمل سے اس کے دل میں جگہ بناتا رہے گا۔

شام کو سرعزیز الدین اس سے ملنے آئے وہ بہت خوش تھی۔اس نے کہا۔”میں بینک سے رقم نکلوالائی ہوں۔کل ہم صبح کس وقت جائیں گے؟“

”ہم صبح دس بجے اسٹیٹ ایجنسی جائیں گے۔ وہیں زمین کا مالک آئے گا۔ کاغذات تیار ہو چکے ہوں گے۔ان شاء اللہ کل پے منٹ کرنے کے بعد زمین تمہاری ہو جائے گی۔“

وہ اسکول کی تعمیر کے سلسلے میں باتیں کرنے لگے کہ آئندہ انہیں کس طرح کام شروع کرنا چاہیے۔احسان بھی پہلی بار ان کی باتوں میں حصہ لے رہا تھا اور مرجینا اعتراض نہیں کر رہی تھی بلکہ خوش ہو رہی تھی۔اس نے سرعزیز الدین کے جانے کے بعد کہا۔”احسان! اسکول کے تمام معاملات میں تم میرے ساتھ رہا کرو گے۔سبزی فروخت کرنے کا کام نہیں کرو گے۔“

”تم جو کہو گی، وہی کروں گا۔کبھی کسی معاملے میں تمہیں شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔تم

بھی میری ایک بات مان لو۔''

''آج تم جو کہو گے وہ مانوں گی۔''

''میں ریڑھا خرید چکا ہوں۔ سبزیاں بھی آ گئی ہوں گی۔ اماں نے گھر کے سامنے دکان لگائی ہوگی۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ دکان اور وہ سبزیاں ان کے حوالے کر دوں۔ ان کا گزارہ ہوتا رہے گا۔''

''تم بہت اچھی باتیں کر رہے ہو۔ میں ان کی دشمن نہیں ہوں۔ ٹھیک ہے، انہیں اپنا گزارہ کرنے کے لیے سبزیاں فروخت کرنے دو۔''

احسان نے اس کی بہت بڑی رقم کو چوری ہونے سے بچایا تھا۔ آئندہ بھی اس کے ساتھ سچائی اور دیانتداری سے رہ سکتا تھا۔ وہ تو اس پر قربان ہونے کو تیار تھی کہ اپنا سب کچھ اس کے حوالے کر دے گی۔ وہ آئندہ لاکھوں روپے کے لین دین والا اعتماد حاصل کر سکتا تھا۔ بس ایک ذرا دیانت داری لازمی تھی۔

وہ رات کے کھانے کے بعد جلدی سو گئے۔ دوسری صبح سے ایک نئی زندگی کا آغاز ہونے والا تھا۔ وہ زندگی میاں بیوی کے باہمی اعتماد سے شروع ہونے ولی تھی۔ عینی دوسرے کمرے میں سو رہی تھی اور وہ دونوں ایک دوسرے کی آغوش میں محوِ خواب تھے۔ رات کے دو بجے احسان نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ وہ گہری نیند میں تھی وہ آہستہ سے کروٹ بدل کر الگ ہو گیا۔ جن کے اندر شیطان اچھلتا رہتا ہے وہ صبر سے اچھے دن کا انتظار نہیں کرتے۔

ان کے اندر یہ بات نقش رہتی ہے کہ آج جو مل رہا ہے اسے سمیٹ لو۔ کل کا بھروسا نہ کرو۔ وہ آہستہ سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کمرے میں زیرو پاور کا بلب روشن تھا۔ الماری چند قدم کے فاصلے پر تھی۔ وہ بیڈ سے اُتر کر دبے قدموں الماری کے پاس پہنچ گیا۔

اس نے وہاں سے گھوم کر دیکھا۔ مرجینا اسی الماری کی طرف منہ کیے سو رہی تھی۔ وہ یقین کر چکا تھا کہ وہ گہری نیند میں ہے۔ اس نے جیب سے تین چابیاں نکالیں۔ دو چابیوں سے الماری کے پٹ کھولے ایک بار پھر سر گھما کر احتیاطاً دیکھا۔ خطرے کی بات نہیں تھی وہ بے خبر سو رہی تھی۔

اس نے چھوٹی چابی سے سیف کے پٹ کو کھولا۔ اندر بینک کے کچھ کاغذات دستاویزات اور چیک بک رکھی ہوئی تھی۔ ان کے اوپر نوٹوں کی گڈیاں تھیں لیکن وہ گڈیاں بہت کم تھیں وہ پورے تین لاکھ پچاس ہزار روپے کی رقم نہیں ہو سکتی تھی۔ اس نے انہیں اٹھا کر

اندازہ کیا۔ ان کے ساتھ ایک پے آرڈر کی سلپ رکھی ہوئی تھی۔ اس نے اٹھا کر زیرو پاور کے بلب میں پڑھنے کی کوشش کی۔ تب اسے یاد آیا کہ زمین کی خرید وفروخت کے وقت نقد رقم کی لین دین نہیں ہوتی۔ بینک سے جاری کیے جانے والے پے آرڈر کے ذریعے ادائیگی کی جاتی ہے تاکہ خریدار کو کسی طرح کا بھی دھوکا نہ ہو۔

اس پے آرڈر پر تین لاکھ پچیس ہزار روپے لکھے ہوئے تھے اور اس کے علاوہ پچیس ہزار روپے نقد رقم کی صورت میں رکھے ہوئے تھے۔ وہ جھنجھلا کر رہ گیا۔ پے آرڈر چرا نہیں سکتا تھا۔ اسے کیش کروانے کے لیے جاتا تو پکڑا جاتا۔ صرف پچیس ہزار روپے نقد ہاتھ آ رہے تھے۔ اس وقت مرجینا کی آنکھ کھل گئی۔ وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے اسے الماری کے پاس دیکھ رہی تھی۔ اس کے پٹ کھلے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ سیف بھی کھلا ہوا تھا اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔ اس نے اپنے تکیے کے نیچے ہاتھ لے جا کر دیکھا تو وہاں چابیاں موجود تھیں۔

اس نے اس گچھے کو نکال کر دیکھا تو چابیاں پوری موجود تھیں۔ اس نے سوچا کہ سیف اور الماری کیسے کھل گئی؟ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی وہ آہٹ سن کر چونک گیا۔ مرجینا کو ایسا لگا جیسے اس پر حملہ کرنے والا ہو۔ وہ بھاگتے ہوئے دروازہ کھول کر باہر نکل گئی پھر دروازہ باہر سے بند کر دیا۔

وہ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ابھی اس نے فیصلہ نہیں کیا تھا کہ پچیس ہزار روپے لے کر فرار ہو جائے صبر کرے یا انتظار کرے۔ آئندہ کبھی لاکھوں روپے پر ہاتھ صاف کرنے کا موقع مل سکتا ہے۔ اس کے کسی فیصلے پر پہنچنے سے پہلے ہی وہ دروازہ باہر سے بند ہو چکا تھا۔ اس کمرے میں کوئی دوسرا دروازہ نہیں تھا۔ دو کھڑکیاں تھیں جن میں لوہے کی گرل لگی ہوئی تھیں۔ ایک کھڑکی باہر کی طرف کھلتی تھی اور ایک دوسرے کمرے کی طرف اس نے دوسری کھڑکی کی طرف آ کر دیکھا۔ عینی بیڈ پر سو رہی تھی اور مرجینا اس کے پاس کھڑی ہوئی تھی۔

وہ اسے حیرانی اور بے یقینی سے دیکھ رہی تھی۔ آج ہی اس نے بڑے ڈرامائی انداز میں اس کا اعتماد حاصل کیا تھا اور وہ خوش ہو کر اس کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ خدا کا شکر ادا کر رہی تھی کہ یہ دوسرا شوہر قابل اعتماد ہے لیکن وہ پھر اپنی روش پر آ گیا تھا۔ اسے ذہنی جھٹکے پہنچا رہا تھا۔

وہ کھڑکی کی جالی کے پاس آ کر سر جھکا کر شرمندگی سے بولا۔ ''وہ مرجینا مجھے غلط نہ

سمجھنا، دراصل میں نے خواب میں دیکھا تھا کہ روپے چوری ہو چکے ہیں۔ اس لیے میں نے اٹھ کر الماری کھولی تھی اور اطمینان کر رہا تھا کہ روپے محفوظ ہیں کہ نہیں۔''

مرجینا نے ہاتھ بڑھا کر مٹھی کھولی پھر اسے چابیوں کا گچھا دکھاتے ہوئے بولی۔ ''چابیاں میرے پاس ہیں۔ تم نے الماری اور سیف کو کیسے کھولا؟''

وہ کوئی جواب نہ دے سکا۔ وہ بولی۔ ''میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ چوری تمہارا پیشہ ہے اور تم نقلی چابیاں بنوا سکتے ہو۔''

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ''میں تمہاری قسم کھا کر کہتا ہوں کہ آج تم سے اتنی محبت ملی کہ میں نے توبہ کر لی۔ آئندہ کبھی ایسی واردات نہیں کروں گا۔ یہ چابیاں میں نے بہت پہلے بنوائی تھیں۔ اب انہیں پھینک دوں گا۔ اب تمہارے سامنے وعدہ کرتا ہوں، کان پکڑتا ہوں اس بار مجھے معاف کر دو۔''

اس نے پوچھا۔ ''اگر اس کمرے میں دوسرا دروازہ ہوتا اور تمہیں فرار ہونے کا موقع ملتا تو کیا تم مجھ سے معافی مانگنے کے لیے کھڑے رہتے؟''

اس نے سر جھکا لیا۔ وہ بولی۔ ''اگر میں کمرے سے بھاگ کر نہ آتی تو کیا تم مجھے زندہ رہنے دیتے؟ تم چوری کے الزام سے بچنے کے لیے مجھے مار ڈالتے یا زخمی کر کے بھاگ جاتے۔ تم کتنے کمینے ہو یہ مجھے اچھی طرح معلوم ہو چکا ہے اب میں تمہارے ساتھ اپنی زندگی کا ایک لمحہ بھی نہیں گزاروں گی۔''

''خدا کے لیے غصہ تھوک دو، میری ایک غلطی معاف کر دو۔''

''ایک ہی شرط پر معاف کروں گی۔''

''تم ہزار شرطیں منوالو، میں مان لوں گا بولو کیا شرط منوانا چاہتی ہو؟''

''اس کمرے میں کاغذ اور قلم موجود ہے وہاں بیٹھ کر ایک طلاق نامہ لکھو۔ واضح الفاظ میں لکھو کہ تم جھوٹے ہو، فریبی ہو، تم نے مجھے کئی بار دھوکا دینے کی کوششیں کیں۔ اس لیے میرا اعتماد حاصل نہ کر سکے اور تم پورے ہوش و حواس میں رہ کر مجھے طلاق دے رہے ہو۔''

وہ عاجزی سے بولا۔ ''نہیں مرجینا! طلاق کا مطالبہ نہ کرو میں طلاق نہیں دوں گا۔''

''تمہارے تو اچھے بھی دیں گے اگر میری بات نہیں مانو گے تو صبح پولیس والوں کے سامنے منوالوں گی۔''

''نہیں مرجینا! یہ ہمارا ذاتی معاملہ ہے پولیس کو بیچ میں نہ لاؤ، شوہر کو چور ثابت کرو گی تو

دنیا والوں کے سامنے تمہارا اپنا سر بھی جھکے گا۔''

''تم مجھے نہ سمجھاؤ، صرف طلاق کی بات کرو لکھتے ہو یا نہیں؟''

''طلاق لینے سے عورت کی توہین ہوتی ہے۔ تم کیوں اپنی توہین کروانا چاہتی ہو؟''

''لکھتے ہو یا نہیں، نہیں لکھو گے تو میں بیٹی کو لے کر مکان سے باہر جاؤں گی اور باہر والا دروازہ بھی بند کر دوں گی۔ تم دونوں دروازے توڑ کر فرار نہیں ہو سکو گے۔ میں صبح پولیس والوں کے ساتھ واپس آؤں گی۔''

وہ ہاتھ جوڑ کر عاجزی سے بولا۔''تم غصے میں ہو آرام سے بیٹھ جاؤ۔ صبح سے پہلے ٹھنڈے دماغ سے میرے بارے میں سوچو۔''

''میں ایک منٹ تک انتظار کروں گی۔ اگر مجھے طلاق نہ دی تو میں یہاں سے چلی جاؤں گی پھر تم چیخ چیخ کر دیواروں سے باتیں کرتے رہو گے۔''

وہ طرح طرح سے باتیں بنا کر اس کو منانے لگا۔ ٹھیک ایک منٹ کے بعد اس نے عینی کے پاس بیٹھ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔''عینی! اٹھو۔''

وہ جلدی سے بولا۔''نہیں......نہیں......اسے نہ جگاؤ، میں......میں لکھ رہا ہوں۔''

وہ کھڑکی سے پلٹ کر میز کے پاس گیا۔ وہاں بیٹھ کر تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا اور لکھتا رہا پھر وہ کاغذ لے کر کھڑکی کے پاس آ گیا۔ اس سے بولا۔''میں نے تمہارے حکم کی تعمیل کی ہے۔ میں تمہیں طلاق نہیں دینا چاہتا لیکن میں نے لکھ دیا ہے۔ اب بھی وقت ہے مجھ پر بھروسا کرو تو میں کاغذ پھاڑ کر پھینک دوں گا ہم ایک نئے سرے سے نئی زندگی گزاریں گے۔ میں تمہارا غلام بن کر رہوں گا۔''

''تم غلام بننے کی بات کرتے ہو۔ میں تمہیں شوہر نہ سہی محافظ بنا کر رکھنا چاہتی تھی لیکن تم محافظ بھی نہ بن سکے، لاؤ کاغذ مجھے دو۔''

اس نے آگے بڑھ کر کاغذ کو اس سے جھپٹ لیا پھر اسے لے کر پڑھنے لگی۔ اس نے پورے ہوش و حواس میں رہ کر طلاق لکھ دی تھی۔ وہ پڑھتے پڑھتے رونے لگی۔ اب وہ سہاگن نہیں رہی تھی۔ ساری دنیا صبح کے اجالے میں ایک مطلقہ کا چہرہ دیکھنے والی تھی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ عینی کی آنکھ کھل گئی وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے ماں سے لپٹ کر پوچھا۔''امی! آپ کیوں رو رہی ہیں؟''

وہ روتے روتے بولی۔''میں تمہیں کیا بتاؤں بیٹی......لیکن بتانا پڑے گا تمہیں اچھی طرح سمجھانا ہوگا۔ کل کو تم بھی جوان ہو جاؤ گی تمہیں بھی ایک مرد کی ضرورت ہوگی۔ ہم

عورتوں کا المیہ یہی ہے کہ ہمیں محبوب جیسا شوہر نہیں ملتا۔ ملتا بھی ہے تو بڑی مختصر سی زندگی گزار کر بے سہارا چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ وہ ہمیں دولت دے کر جاتا ہے مگر وہ دولت کسی کام نہیں آتی وہ ہمیں عزت دے کر جاتا ہے مگر دوسرے آ کر عزت اچھالنے لگتے ہیں۔ آؤ بیٹی، ہم برابر والی خالہ کے گھر رات گزاریں گے۔''

وہ لوہے کی جالیوں کو پکڑ کو جھنجھوڑتے ہوئے بولا۔ ''نہیں...... تم مجھے قیدی بنا کر نہیں جاؤ گی میں نے طلاق نامہ لکھ دیا ہے۔ اب ہمارا تمہارا کوئی رشتہ نہیں ہے دروازہ کھول دو، مجھے جانے دو۔''

وہ سنی اَن سنی کر کے بولتی رہی۔ ''بیٹی! میں تمہیں سمجھاؤں گی کہ عورت کے پاس دولت ہو تب بھی وہ محفوظ نہیں رہتی۔ وہ ذہانت سے کام لیتی ہے تب بھی محفوظ نہیں رہتی۔ اتنی بڑی دنیا میں محبت کرنے والا شوہر ہی اس کی حفاظت کر سکتا ہے اور وہ بڑے نصیب سے ملتا ہے۔''

وہ یہ کہتے ہوئے عینی کا ہاتھ پکڑ کر دروازہ کھول کر باہر چلی گئی۔ باہر سے اس نے دروازے کو بند کر کے تالا لگایا اور برابر والی خالہ کے گھر چلی گئی وہ اندر سے چیخ چیخ کر اسے پکار رہا تھا پھر تھوڑی دیر میں چپ ہو گیا۔ یہ عقل آ گئی کہ چیخے گا چلائے گا، تو محلے والے آئیں گے پھر بات کھلے گی کہ بیوی نے اسے تالے میں بند کیوں کیا ہے؟ اور اسے چھوڑ کر کیوں چلی گئی ہے؟

بات تو کھلنی ہی تھی۔ مرجینا نے بتانا تھا کہ اس نے دوسرے شوہر سے طلاق کیوں لی ہے۔ لہٰذا اس نے برابر والی خالہ کو بتایا انہوں نے اپنی پڑوسن کو بتایا، اس پڑوسن نے دوسری پڑوسن کو بتایا۔ صبح ہوتے ہوتے کتنی ہی عورتیں اور مرد اس گھر کے اردگرد جمع ہو گئے۔ پولیس والے آئے مقفل گھر کو کھولا گیا اور وہ احسان کو گرفتار کر کے لے گئے۔

☆======☆======☆

میں راقم الحروف آپ سے مخاطب ہوں۔ آپ میری تحریر کردہ کہانیاں پڑھتے ہیں۔ اگر آپ نے اب تک شادی نہیں کی تو میں مشورہ دینا چاہتا ہوں کہ ایسی عورتوں سے شادی کریں جو آپ کی توجہ کی طالب ہیں...... یا جنہیں آپ کی بہت ضرورت ہے۔

میں آپ سے غریب عورتوں کی باتیں نہیں کروں گا۔ وہ بے چاریاں تو اپنے شوہر کے جوتے کھاتے کھاتے اور بچے پیدا کرتے کرتے مر جاتی ہیں۔ میں ایسی عورتوں کی بات کر رہا ہوں۔ جن کے پاس تھوڑی بہت دولت ہوتی ہے، وہ مالی اعتبار سے کمزور نہیں ہوتیں لیکن بھر

پور تحفظ دینے والے مرد سے محروم ہوتی ہیں۔

آپ مرد ہیں، مرجینا کے پاس جائیں اسے تیسرے شوہر کی ضرورت ہے کیونکہ ایک عورت اپنے مال وزر کے ساتھ اور اپنی بیٹی کے ساتھ اس وقت تک محفوظ نہیں رہ سکتی جب تک اسے ایک مرد کا سہارا نہ ملے۔

مرجینا اپنے بل بوتے پر اپنے اعتماد اور حوصلے پر ایک اسکول کی تعمیر کر رہی ہے اور آپ کا انتظار کر رہی ہے۔

ایک اور عورت ہے جو اسپتال میں بیمار پڑی ہے اسے خون کا سرطان ہو گیا ہے۔ اس کا شوہر پچاس لاکھ روپے لے کر بھاگ گیا ہے۔ اس کے باوجود اس نے پچیس لاکھ روپے بچا کر رکھے ہیں۔ اسے بھی ایک معتبر شوہر کی ضرورت ہے۔ آپ وہاں بھی جا سکتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ نصیب اچھے ہوں تو دولت ملتی ہے لیکن عورتوں کے معاملے میں یہ کہنا پڑتا ہے کہ جو بدنصیب ہوتی ہیں انہیں دولت ملتی ہے۔ ایک نوجوان عورت کی شامت آئی تھی اسے پرائز بونڈ کے ذریعے پچیس لاکھ ملے تھے۔ اب وہ پریشان ہے اس کا شوہر عیش کر رہا ہے اور اب ایک اور نوجوان عورت سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ وہ اب تک اس کے پانچ لاکھ روپے ہڑپ کر چکا ہے۔ آخر وہ مجبور ہو کر اپنے بچیس لاکھ روپے لے کر گھر سے نکل آئی ہے اور ایک جگہ چھپی ہوئی ہے وہ وہاں آپ کا انتظار کر رہی ہے۔

آپ دیر نہ کریں، ابھی جائیں ویسے تو میں بھی جا سکتا ہوں لیکن شرم آتی ہے کیونکہ ہم نے اپنے معتبر ہونے کا کوئی راستہ نہیں چھوڑا ہے۔

☆======☆======☆

اُونچی اُڑان

اس عالیشان کوٹھی میں انسان کم اور جوتے زیادہ تھے۔ ماں بیٹے، بہو، پوتے، اور پوتی سب ہی کے دو دو پاؤں تھے۔ دو سے زیادہ تو ہو بھی نہیں سکتے لیکن ان میں پہننے والے جوتے زیادہ سے زیادہ ہو سکتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کے بیڈ روم میں مختلف ڈیزائن کے درجنوں جوتے تھے۔ اس خاندان کے افراد میں اتنی سوجھ بوجھ تھی کہ وہ جوتوں کا استعمال جانتے تھے۔ انہیں پہن کر چلتے تھے، ایک دوسرے پر چلاتے نہیں تھے۔

اس خاندان میں بتول بی ایک ایسی بزرگ خاتون تھیں جو کوٹھی کے باہر اور باغیچے میں ننگے پاؤں چلتی پھرتی تھیں۔ ان کے پاس چپل کی ایک ہی جوڑی تھی۔ وہ کبھی بازار جاتیں یا کسی سے ملنے ملانے جاتیں تو انہیں پیروں میں ڈال لیا کرتی تھیں۔ کوٹھی کے ہر حصے میں قالین بچھے ہوئے تھے۔ باغیچے میں ہری بھری گھاس کا ملائم فرش تھا۔ ایک بار ننگے پاؤں چلتے وقت ان کے پاؤں میں کانٹا چبھ گیا تھا۔ بیٹے نے ناراض ہو کر کہا تھا۔ ''اماں! آپ ننھی بچی تو نہیں ہیں کہ آپ کے پیروں میں چپلیں پہنائی جائیں، آپ ننگے پاؤں کیوں چلتی ہیں؟''

وہ کہتیں۔ ''بیٹا! دنیا میں رہ کر عاقبت کو نہیں بھولنا چاہئے۔ وہاں پل صراط پر ننگے پاؤں چلنا ہوگا۔''

''عاقبت کو یاد رکھنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہاں اپنے پاؤں زخمی کر لیے جائیں۔''

''ہم جوتے پہن لیں۔ تب بھی کہیں نہ کہیں سے زخمی ہو جاتے ہیں، کبھی کبھی زمین سے ننگے پاؤں کا رشتہ قائم رکھنا چاہیے۔''

وہ سوچنے کے انداز میں ایک طرف تکتے ہوئے بولیں۔ ''تمہارا باپ ساری دنیا کو جوتے پہناتا ہے۔ کسی کو ننگے پاؤں نہیں رہنے دیتا لیکن خود کبھی کبھی ننگے پاؤں چلتا ہے، کہتا ہے۔'' زمین پر پاؤں رکھتے ہوئے اچھا لگتا ہے۔ یہ اپنی طرف کھینچتی ہے، ایک دن ہمیشہ کے

لیے کھینچ لے گی۔"

باپ کا ذکر ہوتے ہی بیٹا پریشان ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگتا تھا جیسے کوئی چوری یا ہیرا پھیری کر رہا ہے۔ وہ قریب بیٹھ کر دھیرے سے بولا۔ "کتنی بار سمجھایا ہے، ابا کی باتیں یہاں نہ کیا کریں۔"

ماں نے چبھتی ہوئی نظروں سے بیٹے کو دیکھا، وہ نظریں چراتے ہوئے بولا۔ "میں بیٹا ہوں۔ ابا کا دشمن نہیں ہوں۔ آپ سمجھتی ہیں میرے دل میں ان کے لیے محبت نہیں ہے۔ میں اپنا دل چیر کر نہیں دکھا سکتا لیکن یہاں...... یہاں ان کی باتیں کرنا......"

وہ بے چینی سے پہلو بدلنے لگا۔ انہوں نے بیٹے کے شانے کو تھپک کر کہا۔ "میں تو کوشش کرتی ہوں مگر کبھی کبھی بے اختیار ان کی کوئی بات زبان پر آ ہی جاتی ہے۔ تمہیں پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ میں اپنے ہونٹ سی لوں گی۔"

ان کی بہو شگفتہ زینے سے اترتی نیچے آ رہی تھی۔ ماں بیٹا کو دیکھ کر بولی۔ "آپ تو ہمیشہ اماں کے پاس گھسے رہتے ہیں۔ جوان بچوں پر بھی توجہ دیں۔ شام ہوتے ہی عینی گھر سے نکل جاتی ہے۔ پھر رات گئے تک اس کی صوت دکھائی نہیں دیتی۔ میں پوچھتی ہوں، آپ نے اس کے لیے نئی کار کیوں خریدی؟"

فضل الرحمٰن نے کہا۔ "میں نے اس سے وعدہ کیا تھا۔ وہ انٹر پاس کر کے یونیورسٹی میں داخلہ لے گی تو اسے پرانی کار سے نجات دلا دوں گا اور نئی کار خرید کر دوں گا۔"

بتول نے کہا۔ "اس نے نئی کار کے لالچ میں دن رات محنت کی تھی۔ اچھے نمبروں سے پاس ہوئی تھی۔ بچوں کو انعام کا لالچ دیا جائے تو وہ خوب محنت کرتے ہیں۔ خوب ترقی کرتے ہیں۔"

شگفتہ ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے ہاتھ نچاتے ہوئے بولی۔۔ "اماں، آپ تو نہ بولیں۔ آپ کی ایسی ہی باتوں سے میرے بچے بگڑ رہے ہیں۔ نہ جانے وہ کہاں کہاں جاتی ہے۔ کتنوں کے ساتھ گھومتی پھرتی ہے۔ فون پر فون آتے رہتے ہیں۔ ہر فون پر ہائے ہائے کرتی رہتی ہے۔"

"اے دلہن! کیا میں اسے دوستیاں کرنے اور ہائے ہائے کرنے کو کہتی ہوں؟ تم تو مجھے کوئی نہ کوئی الزام دینے کا بہانہ ڈھونڈتی رہتی ہو۔"

فضل الرحمٰن نے کہا۔ "ساس بہو کی مہا بھارت شروع ہو گئی۔ مجھے تو یہاں سے جانا چاہیئے۔"

''آپ تو ہمیشہ اپنی جان چھڑا کر بھاگ جاتے ہیں۔ مجھے ہی بھگتنا پڑتا ہے۔ بیٹی تو بے لگام ہوتی جارہی ہے۔ بیٹے بھی آپ کے قابو میں نہیں ہیں۔''

''کیا آپ اندر کی بات جانتے ہیں؟ وہ اپنی بیوی پر کتنا لٹاتا ہے؟''

''اے دلہن! وہ تمہاری بہو ہے۔ وقاص اس پر نہیں لٹائے گا تو اور کس پر خرچ کرے گا؟''

شگفتہ نے ناگواری سے منہ پھیرتے ہوئے کہا۔''اماں! آپ تو نہ ہی بولیں۔ میری جان جل جاتی ہے۔ بہو ٹی وی ڈراموں میں اور اشتہاری فلموں میں اپنے جلوے دکھاتی ہے۔ لاکھوں روپے کماتی ہے۔ یہ لاکھوں روپے کہاں جاتے ہیں؟ اپنے بینک اکاؤنٹ میں بھرتی ہے اور میرے لیے بیٹے کا اکاؤنٹ خالی کر دیتی ہے۔''

فضل الرحمٰن نے کہا۔''میں بھی تمہارے اکاؤنٹ میں رقم ڈالتا رہتا ہوں۔ ہمارا بیٹا بھی اپنی بیوی کے لیے یہی کرتا ہے۔ پھر تمہیں اعتراض کیا ہے؟''

شگفتہ نے کہا۔''میرا بینک بیلنس آگے چل کر میری اولاد کے کام آئے گا۔ بہو تو اولاد پیدا کرنے سے صاف انکار کرتی ہے۔ آپ سمجھتے تو ہیں کہ وہ کیوں انکار کرتی ہے؟''

فضل الرحمٰن نے جھینپ کر اپنی ماں کو دیکھا۔ آرزو ٹاپ کی ماڈل تھی۔ ٹی وی ڈراموں کی وجہ سے بھی خاصی مقبول تھی۔ اپنی مقبولیت کو برقرار رکھنے کے لیے اپنے حسن وشباب کی دلکشی کو برقرار رکھنا پڑتا ہے۔ وہ صبح شام آئینے میں دیکھتی رہتی تھی کہ اس کی دلکشی کے کسی حصے پر کوئی دھبا تو نہیں لگا۔ پتا نہیں وقاص اسے کیسے چھوتا ہوگا؟ بظاہر تو وہ بہت خوش تھا۔ آرزو کے پیچھے دُم ہلاتا پھرتا تھا۔ ان کے درمیان شاید کوئی سمجھوتا ہوگیا تھا۔ بے چارے کو سردی لگتی ہوگی تو آگ کو چھوتا نہیں ہوگا، آنچ سے بہل جاتا ہوگا۔

آرزو نے شادی سے پہلے ہی وقاص کے پہلو میں بیٹھ کر بہت سے معاملات طے کر لیے تھے۔

فلموں اور ڈراموں میں آؤٹ ڈور شوٹنگ بھی ہوتی ہے اور اِن ڈور شوٹنگ بھی ہوتی ہے۔ آرزو نے آؤٹ ڈور شوٹنگ پر پابندی لگادی۔ وقاص نے پابندی قبول کر لی۔ پھر بولی۔''ایک اور وعدہ کرو، اولاد کے لیے ضد نہیں کرو گے۔''

وہ پریشان ہو کر بولا۔''یہ تو تم مشکل میں ڈال رہی ہو۔ میری ممی، پاپا اور دادی جان بہو کے آتے ہی اولاد کی تمنا کرنے لگیں گے۔ وارث پیدا کرنے کے لیے اور خاندان بڑھانے کے لیے ہی شادی کی جاتی ہے۔''

''تمہیں کسی بھی طرح اپنے بزرگوں کو راضی کرنا ہوگا، جب تک میری مارکیٹ ویلیو رہے گی۔ جب تک اشتہاری فلموں اور ڈراموں میں میری ڈیمانڈ رہے گی، میں ماں نہیں بنوں گی۔''

وہ تو دیوانہ تھا۔ ایک دیوانہ اپنی خوشی نہیں دیکھتا، اپنے چاہنے والے کی خوشی میں خوش رہتا ہے۔ اس نے آرزو کی یہ ضد بھی مان لی۔ شادی کو تین برس پھر چار برس گزر گئے۔ ماں باپ اور دادی جان آرزو سے پوتے پوتی کا مطالبہ کرتے رہے۔ آخر اس نے کہہ دیا کہ وہ ماں نہیں بنے گی، آئندہ کئی برسوں تک اپنے جسمانی حسن کی کشش کو برقرار رکھے گی۔

اپنی جوانی اور اپنے بدن کے حسن کو برقرار رکھنے والی باتیں بڑی شرمناک تھیں۔ اعلیٰ خاندان کی بہویں نہ ایسی باتیں کرتی ہیں، نہ ایسی ضد منواتی ہیں۔ وہ تو سسرال میں آتے ہی بچے پیدا کرنے لگتی ہیں۔ فضل الرحمٰن کی عالیشان کوٹھی میں اور تو سب کچھ تھا۔ ننھے بچوں کی آوازیں اور شرارتیں نہیں تھیں۔ بتول بی نے بیٹے اور بہو سے کہا۔ ''دلہن! اپنی اس بہو سے اب کوئی آس امید نہ رکھو۔ وکی کی شادی کر دو۔ اگلے ہی برس پوتے اور پوتی ہماری گود میں ہوں گے۔''

''اماں! وکی فرسٹ ائیر میں ہے۔ ابھی اسے تعلیم حاصل کرنی ہے۔ اپنے بڑے بھائی کی طرح میرا کاروبار سنبھالنا ہے۔ بیٹے جب تک ذمے داریوں کا بوجھ اٹھانے کے قابل نہ ہو جائیں، ان کی شادیاں نہیں کرنی چاہئیں۔''

''اماں! آپ تو نہ بولا کریں۔ میرے بچے کی عمر ہی کیا ہے؟ خواہ مخواہ اس کی شادی کا مشورہ دے رہی ہیں۔''

وہ بولیں۔ ''یہ جو ٹی وی پر ہندوستانی اور انگریزی فلمیں آتی ہیں' انہیں دیکھتے رہنے کے بعد پھر کوئی بچہ نہیں رہتا۔ اپنے بچے کی شادی آج کرو، کل باپ بن جائے گا۔ گھر میں ایسے ایسے رسالے آتے ہیں۔ ان میں ایسی ایسی تصویریں ہوتی ہیں کہ انہیں دیکھنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ تم نہ تو ٹی وی بند کرتی ہو اور نہ ایسے رسالوں پر پابندی لگاتی ہو۔ تم دونوں ماڈرن ممی اور ڈیڈی بنتے ہو۔ اب ایسے میں، میں کچھ کہتی ہوں تو بولتی ہو کہ اماں آپ تو نہ بولا کریں۔''

شگفتہ نے اپنے میاں سے کہا۔ ''آپ دیکھ رہے ہیں، اماں میری نقل کر رہی ہیں۔''

فضل الرحمٰن ہنسنے لگا۔ بتول بی اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولیں۔ ''میں کھانا لگوا رہی ہوں۔ منہ ہاتھ دھو کر آ جاؤ۔ آج ہفتے کی رات ہے۔ مجھے کھاتے ہی چلے جانا ہے۔ پھر کل رات کو واپس آؤں گی۔''

وہ دور تک بولتی ہوئی کچن کی طرف چلی گئیں۔ شگفتہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ پھر دھیمی سرگوشی میں بولی۔ ”یہ آپ کی اماں ہیں۔ ہماری نہیں مانیں گی۔ کیا ہر ہفتے ان کا جانا ضروری ہے۔ پوری ایک رات اور ایک دن کے لیے جاتی ہیں۔ ہر اتوار کو میرے میکے سے کوئی نہ کوئی آتا ہے۔ میری سہیلیاں اور آپ کے دوستوں کی بیویاں بھی آتی ہیں۔ سب ہی پوچھتی ہیں، اماں کہاں ہیں؟ ان سے جھوٹ بولنا پڑتا ہے کہ وہ ہر اتوار کو درگاہ شریف جاتی ہیں۔“

وہ بولا۔ ”اماں کو سمجھایا تو ہے کہ مہینے دو مہینے میں دو بار جایا کرو۔ کسی نے وہاں جاتے دیکھ لیا تو ساری عزت خاک میں مل جائے گی۔“

”آپ کی کیا عزت ہے؟ آپ کی تو یہ اماں ہیں۔ بدنامی کا ڈر تو مجھے ہے۔ میرے میکے والے بڑے بڑے سرکاری عہدے دار ہیں۔ بات کھلے گی تو میں کسی سے نظریں نہیں ملا سکوں گی۔“

”تم ہمیشہ اپنے خاندان والوں کے گن گاتی رہتی ہو۔ اگر وہ بڑے بڑے سرکاری عہدے دار ہیں تو میں بھی سیّد فضل الرحمٰن ہوں۔ تم لوگ شیخ ہو، میں سیّد ہوں۔ تمہارے خاندان والے پچیس ہزار یا پچاس ہزار روپے ماہانہ کماتے ہیں اور میں یہاں لاکھوں روپے کماتا ہوں۔ اس پر کہتی ہو کہ میری کیا عزت ہے؟ اگر عزت نہیں ہے تو کیوں یہاں بیٹھی ہو، جاؤ اپنے خاندان والوں کے پاس جا کر مرو۔“

وہ اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ ”آپ تو ذرا سی بات پر ناراض ہو جاتے ہیں۔“

وہ غصے سے ہاتھ چھڑا کر بولا۔ ”کیا یہ ذرا سی بات ہے؟ ہمیشہ اپنے خاندان والوں کو مجھ سے برتر بناتی ہو۔ اگر وہ برتر ہیں اور میں کم تر ہوں تو کیوں میری شریکِ حیات بن کر رہتی ہو؟ تم نے میرے لیے کیوں بچے پیدا کیے ہیں؟ جاؤ اپنے برتر والوں کے لیے پیدا کرو۔“

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”جب تم مجھے کم تر کہتی ہو تو اس کا مطلب ہے، تم اپنے آپ کو اور اپنی اولاد کے مستقبل کو اور ان کی اَنا اور خودداری کو کم تر بناتی ہو۔“

وہ وہاں سے جانے لگا پھر دروازے پر رک کر بولا۔ ”میں تمہیں سمجھاتا آ رہا ہوں، انسان بن جاؤ۔ اگر میری کوئی عزت نہیں ہے تو طلاق لے کر چلی جاؤ۔ تمام اولادیں میری ہیں، میری رہیں گی۔ میں تمہیں دھکے دے کر نکال دوں گا۔“

وہ چیخ کر وہاں سے چلا گیا تو وہ جواباً غصے سے چیخنے لگی۔ ”آپ کو اس عمر میں

"طلاق دیتے ہوئے شرم نہیں آئے گی۔ بچے جوان ہو چکے ہیں۔ آپ مجھے چھوڑ سکتے ہیں، وہ مجھے کبھی نہیں چھوڑیں گے۔"

وہ دروازہ کھول کر واپس آ کر بولا۔ "یہ بھی آزما کر دیکھ لو۔ دولت کے سامنے دودھ کا رشتہ پانی ہو جاتا ہے۔ میں نے تمام دولت اور جائیداد اپنے نام رکھی ہے۔ وہ میری وراثت سے محروم ہو کر تمہارے ساتھ کنگال بن کر کبھی رہنا نہیں چاہیں گے۔"

وہ دروازے کو زوردار آواز سے بند کر کے چلا گیا۔ بتول بی کچن سے ان کی تُو تُو، مَیں مَیں سن رہی تھیں۔ فضل الرحمٰن ویسے تو ہر معاملے میں بیوی کے آگے جھکتا تھا لیکن خاندانی برتری کی بات پر اختلاف ہوتے ہی وہ اپنی چہیتی بیوی سے لڑ پڑتا تھا۔ وہ بڑی سے بڑی گالی سن سکتا تھا لیکن یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ کوئی اسے دوسروں سے کم تر سمجھے۔ جب وہ سیّد تھا، دوسروں سے برتر تھا۔ تو اسے کمتری کا احساس نہیں ہونا چاہیے تھا لیکن بعض بیویوں کی عادت ہوتی ہے، وہ اپنے شوہر کے مقابلے میں میکے والوں کو بہتر گردانتی ہیں۔

فضل الرحمٰن بہت بڑی شوز کمپنی کا مالک تھا۔ اس کی فیکٹری سے تیار کردہ جوُتے ایکسپورٹ کوالٹی کے حامل ہوتے تھے۔ یورپ کے کئی ممالک میں اس کی پروڈکٹس کی ڈیمانڈ بڑھتی جا رہی تھی۔ ملکی مارکیٹ پر بھی وہ چھایا ہوا تھا۔ یورپ اور امریکا کے کتنے ہی بینکوں میں پاؤنڈز اور ڈالرز کے حساب سے اس کی دولت جمع ہوتی رہتی تھی۔ کاروباری دنیا میں اسے نمبرون بزنس مین سمجھا جاتا تھا۔ اس نے عزت، دولت اور شہرت حاصل کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اتنا سب کچھ ہونے کے باوجود شگفتہ اپنے میکے والوں کو اس سے بہتر کہتی تھی تو وہ پاؤں سے لے کر سر تک سلگ جاتا تھا۔

بتول بی جب کبھی بہو کا مذاق اُڑاتی تھیں یا اپنی باتوں سے اسے زچ کرتی تھیں اور بیٹا ہنس کر ٹال دیتا تھا تو پھر شگفتہ تلملا کر ان پر چوٹ کیا کرتی تھی۔ وہ اپنے میاں کی کمزوری خوب سمجھتی تھی۔ خاندانی برتری کی باتیں شروع کر دیتی تھی۔ اس وقت بھی اس نے یہی چوٹ کی تھی۔ یہ سوچ کر مسکرا رہی تھی کہ فضل الرحمٰن غصہ دکھانے اور خواہ مخواہ اسے طلاق کی دھمکی دینے کے باوجود اپنے بیڈروم میں جا کر غصے سے تلملا رہا ہوگا۔ انگاروں پر لوٹ رہا ہوگا۔

رات کے کھانے کے بعد بتول بی اپنے کمرے میں آئیں تو وکی ان کے بستر پر جوتوں سمیت لیٹا ہوا تھا۔ پاؤں پر پاؤں چڑھا کر کانوں پر ہیڈ فون لگا کر ویسٹرن میوزک سن رہا تھا اور لیٹے ہی لیٹے تھرک رہا تھا۔

بتول بی نے دروازے سے ہی ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "وکی! یہ کیا ہو رہا ہے؟ وکی

وکی......!"

اس کے کانوں سے ہیڈ فون لگا ہوا تھا۔ بتول بی نے پاس آ کر اسے کانوں سے الگ کرتے ہوئے پوچھا۔ "یہ کیا بدتمیزی ہے؟ میرے بستر پر جوتے پہن کر لیٹے ہوئے ہو۔"

وکی نے ان کے ہاتھ پکڑ کر اپنے طرف کھینچا۔ وہ اس پر آ گریں۔ وہ انہیں دونوں بازوؤں میں بھینچتے ہوئے بولا۔ "دادی جان! جب آپ پر محبت آتی ہے تو جی چاہتا ہے جوتوں سمیت آپ کے دل میں گھس جاؤں۔"

وہ تکلیف سے کراہتے ہوئے بولیں۔ "ارے کم بخت! چھوڑ مجھے، میری ہڈی پسلی توڑے گا؟ اپنی طرح جوان سمجھ رہا ہے۔ ہائے میرا سانس رک رہا ہے۔"

اس نے چھوڑ دیا وہ فوراً ہی سیدھی بیٹھ کر گہری گہری سانسیں لینے لگیں۔ "توبہ ہے لڑکے! میرے کمرے میں آ کر گھسا ہوا ہے۔ کھانے کی میز پر کیوں نہیں آیا؟"

"آپ کو تو پتہ ہے، پاپا نے میری پروگریس رپورٹ دیکھ لی ہے۔ مارکس کم آئے ہیں۔ انہوں نے سزا دی ہے۔ میں ایک ہفتے تک اپنی کار نہیں چلا سکوں گا۔ انہوں نے کار کی چابی چھین لی ہے اور میری چیک بک بھی لے کر رکھ دی ہے۔ میں اپنے اکاؤنٹ سے ایک روپیہ بھی نہیں نکال سکتا۔ آپ کے ہوتے ہوئے آپ کا یہ پوتا ایک ہفتے تک کنگال رہے گا۔"

"کنگال رہیں تمہارے دشمن تمہیں روزانہ جیب خرچ کے لیے ایک ہزار ملتے ہیں۔"

"وہ بھی کم پڑتے ہیں دادی جان! اس لیے پانچ سو ممی سے لیتا ہوں اور پانچ سو آپ سے لیا کرتا ہوں۔"

"وکی، یہ تو فضول خرچی ہے، تم روزانہ دو ہزار یعنی ماہانہ ساٹھ ہزار خرچ کرتے ہو؟"

"پلیز دادی جان! آپ فضول بحث کرنے نہ بیٹھ جائیں۔ میں نے ممی کو راضی کر لیا ہے۔ جب تک پاپا پابندی لگائے ہوئے ہیں، وہ مجھے روز ایک ہزار دیتی رہیں گی اور ایک ہزار آپ دیا کریں گی اور ضرور دیں گی۔"

"کیا زبردستی لو گے؟"

وہ لیٹ کر پیار کرتے ہوئے بولا۔ "نہیں پیار سے لوں گا۔"

"میں روز ایک ہزار کہاں سے لاؤں گی۔ تمہارا باپ مجھے اتنی رقم نہیں دیتا دیتا ہے۔"

"رہنے دیں دادی جان! پاپا تو آپ کے لیے اپنا سیف کھول دیتے ہیں۔ آپ ہیں کہ ہزار دو ہزار سے زیادہ لیتی ہی نہیں ہیں۔ میری خاطر ان سے زیادہ لیا کریں گی اور ابھی مجھے دس ہزار دیں گی۔ میں کل صبح دوستوں کے ساتھ آؤٹنگ کے لیے جا رہا ہوں۔"

انہوں نے پوتے کے سینے پر دو ہتھڑ مارتے ہوئے کہا۔ ''کیا تیرے باپ کا خزانہ رکھا ہوا ہے یہاں؟ کہاں سے لاؤں گی میں اتنی بڑی رقم؟''

''دادی جان! آپ سب سے چھپا سکتی ہیں، مجھ سے نہیں چھپا سکتیں۔ ابھی آپ کی الماری کھولوں گا تو بیس پچیس ہزار نکل ہی آئیں گے۔''

''میری الماری میں کچھ نہیں ہے۔ میں تمہیں ایک ہفتے تک روز ایک ہزار دے دیا کروں گی۔''

''نہیں بھی ہیں اور روز دیتی بھی رہیں گی۔ واہ! آپ کو تو جھوٹ بولنا بھی نہیں آتا۔''

''ہاں، میں جھوٹ بول رہی ہوں۔ نہیں دیتی رقم۔ جاؤ یہاں سے۔''

''سوچ لیں۔ میں نے رات کا کھانا نہیں کھایا ہے۔ صبح تک بھوکا رہوں گا۔''

''بھوکے رہو مگر ایک ہزار لے جاؤ۔''

وہ الماری کے پاس جا کر اسے کھولنے لگیں، وہ بولا۔ ''میں دس ہزار سے کم نہیں لوں گا۔ آج بھی بھوکا رہوں گا۔ کل بھی بھوکا رہوں گا۔ آپ کل واپس آئیں گی۔ میں یہاں لمبا لیٹا ملوں گا۔ مجھ پر سفید چادر پڑی ہوگی۔''

وہ ایک دم سے لرز گئیں۔ چیخ کر بولیں۔ ''وکی.....!'' پھر بیڈ کے نیچے پڑی ہوئی چپل اٹھا کر اسے مارنے دوڑیں۔ وہ اِدھر سے اُدھر بھاگنے لگا۔ وہ پیچھے دوڑتے ہوئے بولیں۔ ''ہزار بار کہا ہے۔ مرنے کی باتیں نہ کیا کر۔ پتا نہیں کس منحوس گھڑی میں بات زبان سے نکلے اور وہ پوری ہو جائے۔''

وہ دوڑتے دوڑتے رک گیا پھر اس نے گھٹنے ٹیک کر سر کو جھکا لیا۔ وہ چپل اٹھا کر اسے مارنے آئیں پھر رک گئیں۔ چپل ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ وہ اس سے لپٹ کے رونے لگیں۔ وہ شرمندہ سا ہو گیا۔ وہ انہیں چومنے لگا۔ ان کے آنسو پونچھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''سوری دادی جان! میں نے مذاق میں کہا تھا۔ یہ بھول گیا تھا کہ میں آپ کی جان ہوں، مذاق میں بھی آپ کی جان نکل جائے گی۔ مجھے معاف کر دیں دادی جان! پھر کبھی ایسا نہیں کہوں گا۔''

وہ اس کی پیشانی کو چوم کر اسے الماری کے پاس لے گئیں۔ ''لعنت ہے ایسے دس ہزار پر، مجھے دنیا کی ساری دولت ملے تو تم پر لٹا دوں گی۔'' انہوں نے الماری میں سے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دی پھر کہا۔ ''اسے چھپا لو ورنہ تمہارا باپ دیکھے گا تو اسے بھی چھین لے گا۔ میں کچن میں جا رہی ہوں۔ کھانا گرم کر کے لا رہی ہوں، وہاں میز پر آ جاؤ۔''

وہ خوش ہو کر ان کے دونوں ہاتھوں کو چوم کر وہاں سے چلا گیا۔ وہ مسکرا کر اس دروازے کی طرف دیکھنے لگیں جہاں سے وہ گزر کر گیا تھا اور جانے کے باوجود نہیں گیا تھا۔ نگاہوں کے سامنے شرارتیں کر رہا تھا۔ ان کے بوڑھے دل میں دھڑک رہا تھا۔

☆======☆======☆

نیم تاریک علاقے کو ٹیکسی کی ہیڈ لائٹس روشن کر رہی تھیں۔ وہ ایسے لوگوں کا علاقہ تھا جو کاروں اور ٹیکسیوں کو حسرت سے دیکھتے تھے اور ان کی نرم و گداز سیٹوں پر بیٹھنے کا صرف تصور کر سکتے تھے۔ مقدر نے انہیں بس میں سفر کرنے کا پیدائشی حق دیا تھا۔ مہنگائی مقدر کے خلاف تھی۔ وہ ان سے بس میں بیٹھنے کا حق بھی چھین رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے پھر سے پیدل چلنے کا زمانہ لوٹ کر آ رہا ہے۔

وہ ٹیکسی سے اتر کر پیدل چلنے لگی۔ وہ بھی مجبور تھی۔ اس محلے کی گلیاں اتنی تنگ تھیں کہ وہ ٹیکسی میں بیٹھ کر اپنے گھر کے دروازے تک نہیں جا سکتی تھی۔ اتنی رات کو گاڑی کی ہیڈ لائٹس کتنے ہی مکانوں کے دروازوں اور کھڑکیوں تک گئیں۔ وہ دروازے اور کھڑکیاں کھلنے لگیں۔ جوان اور بوڑھی عورتوں کے چہرے باہر جھانکنے لگے۔ کچے پکے ٹین کی چھت والے مکانات ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے۔ باہر دیکھنے والوں نے پہچان لیا کہ ٹیکسی میں بیٹھ کر آنے والی کون ہے؟ حالانکہ وہ چادر میں لپٹی ہوئی تھی۔ آدھا چہرہ بھی چھپا ہوا تھا لیکن عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے ہیں۔ وہ چادر میں چھپی پیار کی خوشبو لٹاتی جا رہی تھی۔ اس خوشبو کو سب پہچانتے تھے کہ یہ کس دروازے پر جائے گی مگر یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ اتنی رات کو کہاں سے آتی ہے؟

وہ رات کو آنے کے بعد دوسری صبح محلے والوں سے ملتی تھی۔ ان کی خیر خیریت پوچھتی تھی، ان کے دکھ سکھ میں کام آتی تھی لیکن رات کو صرف ایک ہی دلدار سے ملتی تھی' وہ تیزی سے چلتی ہوئی ایک گلی سے گزر کر دوسری گلی میں مڑ گئی۔ پھر تین مکانوں کے بعد ایک بوسیدہ سے مکان کے سامنے رک گئی۔ تھوڑی دیر تک اس کے در و دیوار کو حسرت سے تکتی رہی جیسے پرانے شناسا کو دیکھ رہی ہو۔ ہاتھ بڑھا کر انگلیوں کے پوروں سے خستہ دیواروں کو چھونے لگی۔ یہی ٹوٹی پھوٹی دیواریں کبھی اس کے لیے ایک مضبوط قلعے کی فصیل تھیں۔ ان کے پیچھے وہ اپنے دلدار کے ساتھ ایک محفوظ اور آسودہ زندگی گزارتی رہی تھی۔ اب وہ ایک کوٹھی میں رہتی تھی۔ ایسے جیسے حبسِ بے جا میں رہ رہی ہو۔

تقریباً اٹھائیس برس پہلے اس کی محبت کا بٹوارہ کیا گیا تھا۔ ایک طرف دل

دھڑک دھڑک کر اپنے مجازی خدا کے لیے مچلتا تھا اور دوسری طرف کلیجا تھا، جو بیٹے کی جدائی کے تصور سے بھی پھٹنے لگتا تھا۔ یا تو اسے دل اور اس کی خواہشوں کو کچلنا تھا یا پھر اپنے کلیجے کو نوچ کر پھینک دینا تھا۔ دونوں ہی صورتیں نا قابلِ قبول تھیں۔ ان حالات میں وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی، کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے؟ اسے فیصلے کی سولی پر چڑھا دیا گیا تھا۔

ایسے وقت اس کے مجازی خدا نے اس کے فیصلے کی ڈولتی ہوئی ناؤ کو کنارے لگا دیا۔ اس نے بڑی محبت سے بیوی کو ایک کڑے امتحان سے بچا لیا۔ ماں کو بیٹے کے حوالے کر کے خود تنہائی کا عذاب سہنے لگا۔ باپ بیٹے کی اس جنگ میں ایک عورت شکستہ ہوئی۔ اس کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ جسم بیٹے کے پاس چلا گیا، دل مجازی خدا کے پاس رہ گیا۔

وہ خیالات سے چونک گئی۔ دستک دینے سے پہلے ہی اس مکان کا دروازہ کھل گیا۔ آنے والی کی آہٹ نے، ہواؤں کی سرگوشیوں نے اور چادر میں چھپی ہوئی خوشبو نے کہہ دیا تھا، دروازہ کھولو، وہ آ گئی ہے۔

وہ کھلے ہوئے دروازے پر کھڑا ہوا بڑی محبت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ دونوں ہی ایک دوسرے کو سر سے پاؤں تک دیکھ رہے تھے۔ پھر اس نے دھیمی سرگوشی میں مخاطب کیا۔
''بتول......!''

گئے دنوں میں وہ کہا کرتی تھی۔ ''علم دین! جب تیری زبان میرا نام لیتی ہے۔ مجھے بتول کہتی ہے تو میرے اندر پھول کھلنے لگتے ہیں۔''

ہائے وہ گزرے ہوئے ایام اور وہ گزری ہوئی باتیں اور یادیں، آج بھی بڑھاپے کے کھنڈر میں گونجتی رہتی تھیں۔

وہ نحیف آواز میں بڑی اپنائیت سے بولا۔ ''بتول! یہ تیرا اپنا گھر ہے، کیا تجھے اندر آنے کے لیے کہنا پڑے گا؟''

وہ چادر اتارتے ہوئے اندر آ گئی۔ علم دین نے دروازے کو بند کر دیا۔ صحن میں نیم کا گھنا درخت تھا۔ وہ اتنا ہی پرانا تھا، جتنی پرانی ان کی محبت تھی۔ جب انہوں نے اس دو کمروں کے مکان کو خریدا تھا۔ تب اسے بڑی چاہت سے صحن کے بیچ میں لگایا تھا۔ اس وقت وہ ایک چھوٹا سا پودا تھا۔ اب ایک تناور سایہ دار درخت بن گیا تھا۔

خون کے رشتے ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ دور ہو جاتے ہیں لیکن درخت اپنے مالک کی دی ہوئی جگہ پر سایہ فگن رہتا ہے۔ وہ سوچ رہی تھی، نیم کا درخت جتنا کڑوا ہوتا ہے، اس کی چھاؤں اتنی ہی میٹھی اور ٹھنڈی ہوتی ہے۔ لہو کے رشتے جتنے ٹھنڈے اور میٹھے لگتے ہیں، اندر

سے اتنے ہی خودغرض اور کڑوے ہوتے ہیں۔

وہ خیالات سے چونک گئی۔ علم دین اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر پوچھ رہا تھا ''کیا بیتے ہوئے دنوں کا حساب کر رہی ہو؟''

اس نے پلٹ کر دیکھا۔ علم دین کی آنکھوں میں بڑھاپے سے تنہا لڑنے کا بھرپور اعتماد تھا۔ یہ شکایت نہیں تھی کہ وہ اسے تنہا چھوڑ کر جاتی ہے۔ ہوا کے ایک جھونکے کی طرح آتی ہے اور آ کر پھر گزر جاتی ہے۔ وہ اس کے شانے پر سر رکھ کر رونے لگی۔ وہ اسے تھپکتے ہوئے بولا۔ ''پھر وہی آنسو، اری بس کر یہ آنسو بھی ہماری طرح بوڑھے ہو چکے ہیں۔ اپنی اولاد کو بھی متاثر نہیں کرتے۔ جب سے یہ بے اثر ہوئے ہیں، میں انہیں بہا کر ضائع کرنا بھول چکا ہوں۔ تُو بھی انہیں بھول جا۔''

وہ اسے شانوں سے تھام کر ایک کمرے میں لے آیا۔ وہ آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے کمرے میں رکھی ایک ایک چیز کو تکنے لگی۔ ایک چار پائی پر بستر بچھا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ایک پرانی کرسی رکھی تھی۔ ایک طرف جوتے گانٹھنے کا سامان رکھا ہوا تھا۔ اس محلے سے کچھ فاصلے پر مین روڈ کے کنارے وہ پرانے جوتوں کی مرمت کیا کرتا تھا۔ پچھلے پچاس برسوں سے اس کا یہی پیشہ رہا تھا۔

پچاس برس کم نہیں ہوتے۔ اس نے پرانے جوتوں کی مرمت کرتے کرتے آدھی صدی گزار دی تھی۔ اس آدھی صدی میں اس نے بتول سے شادی کی۔ ایک بیٹا پیدا ہوا تو اسے بڑا آدمی بنانے کے لیے دن رات محنت کرنے لگا۔ پرانے جوتوں کی مرمت کرتے کرتے اس نے بیٹے کو تعلیم دلوائی۔ اس کا کام بہت چلتا تھا۔ ان دنوں آج جیسی مہنگائی نہیں تھی۔ انہوں نے سادگی سے زندگی گزارتے ہوئے خوب بچت کی۔ تعلیم حاصل کرنے والا بیٹا اس کی طرح موچی نہیں بن سکتا تھا۔ اس نے بیٹے کو جرمنی بھیج کر مشینوں کے ذریعے جوتے تیار کرنے کا ہنر سکھایا۔ اس نے بیٹے کا نام فضل دین رکھا تھا۔ فضل دین نے پاکستان واپس واپس آ کر پہلے ایک مشین لگائی۔ چھوٹے پیمانے پر کام شروع کیا۔ بڑی محنت اور لگن سے دن رات کام کرتا رہا۔ وہ قسمت کا دھنی تھا۔ رفتہ رفتہ کامیابیاں حاصل کرتا گیا۔ چند برسوں میں اس مقام پر پہنچ گیا جہاں سے سڑک پر بیٹھے ہوئے ایک موچی کو دیکھنے کے لیے سر جھکانا پڑتا تھا۔

اور وہ کسی کے آگے سر جھکانے کا عادی نہیں تھا۔ اس نے سکول سے کالج تک اور پاکستان سے لے کر جرمنی تک کبھی کسی سے نہیں کہا کہ اس کا باپ ایک موچی ہے اور کہنا بھی نہیں چاہیے تھا۔ ہمارے معاشرے میں موچی ہونا قابلِ فخر نہیں ہے۔ جو ہمیں جوتے پہناتا

ہے اور ہمارے پاؤں کو کانٹوں سے بچاتا ہے، اسے ہم قابلِ قدر نہیں سمجھتے۔

جب فضل دین کا کام چل پڑا تو اسے اپنا نام کچھ پینڈو جیسا لگا۔ اس نے اپنا نام فضل الرحمٰن رکھ لیا۔ ولدیت میں علم دین کے بجائے علیم الدین لکھنے لگا۔ اپنی خاندانی برتری بھی ظاہر کرنی تھی لہٰذا نام کے آگے سیّد کا اضافہ کر دیا۔ سوسائٹی کے علاقے میں ایک کوٹھی خریدی۔ باپ سے کہتا آ رہا تھا کہ اب وہ پرانے جوتوں کی مرمت کرنا چھوڑ دے۔ بیوی کو اور بیٹے کو تُو کہہ کر مخاطب نہ کرے۔

علم دین نے صاف کہہ دیا۔ ''میں جوتے گانٹھنے کا کام نہیں چھوڑ سکتا۔ جس جگہ سے میں نے رزق حاصل کرنا شروع کیا تھا، اس جگہ کو میں کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔ یہ نہ بھولو کہ اسی جگہ نے تمہیں بہت بڑی شوز کمپنی کا مالک بنایا ہے۔''

''ابا! اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم ہمیشہ اسی سڑک کے کنارے بیٹھے رہیں۔ بڑے بڑے کاروباری لوگوں سے میرے مراسم ہیں۔ کیا وہ لاکھوں روپے کی کاروں میں بیٹھ کر مجھ سے ملنے اس سڑک کے کنارے آئیں گے؟''

''تمہیں کون یہاں رہنے کو کہتا ہے؟ تم نے کوٹھی خرید لی ہے، جاؤ عیش و آرام سے رہو۔''

''لیکن میں لوگوں سے کیا کہوں؟ یہ کہ میرا ابا موچی ہے؟''

''تم نے جب سے ہوش سنبھالا ہے، کبھی خود کو موچی کا بیٹا نہیں کہا۔ اب عزت اور شہرت حاصل کرنے کے بعد بھی اس موچی کو مردہ بنا کر رکھو، تمہارے نام کے آگے سیّد لگ چکا ہے۔ دنیا والوں کو بتا چکے ہو کہ میرے نطفے سے نہیں ہو۔ سیّد زادے ہو۔ اس طرح تم نے اپنی ماں کو بھی گالی دی ہے۔''

فضل الرحمٰن بھنا گیا۔ ''ابا! تم کہاں کی بات کہاں لے جاتے ہو۔ جب عزت، شہرت اور دولت حاصل ہو رہی ہے اور اس بیچ میں ایک کمزوری یا کمی رہ گئی ہے تو اسے دور کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں آپ کا خون نہیں ہوں۔''

بتول نے کہا۔ ''علم دین! ہمیں بیٹے کی مجبوریوں کو سمجھ کر اس کا ساتھ دینا چاہیے۔ کیا بیٹے کی عزت بنائے رکھنے کے لیے ہم جھوٹ نہیں بول سکتے؟ تمہیں تو علم دین سے صرف سیّد علیم الدین کہلانا ہے اور بیٹے کے ساتھ کوٹھی میں چل کر رہنا ہے۔''

''تُو کیا چاہتی ہے، تیرے بیٹے کی طرح میں بھی اپنے باپ کے نطفے سے انکار کر دوں اور سیدزادہ کہلاؤں؟ جس کا باپ نہیں ہوتا، وہ ناجائز کہلاتا ہے۔ یہ نئی بات دیکھ رہا ہوں کہ

ہمارا بیٹا، باپ کے وجود سے انکار کر کے عزت دار کہلا رہا ہے۔ یہ دنیا کیا ہوتی جا رہی ہے؟''

''ابا! میں اپنی اور تمہاری بہتری کے لیے کہتا ہوں۔ میرے ساتھ رہو، میری عزت رکھو، جوتے گانٹھنے کا کام چھوڑ دو۔ میرا فرض ہے کہ میں بڑھاپے میں تم کو آرام پہنچاؤں۔''

''ٹھیک ہے، میں کام چھوڑ دوں گا، اپنے کسی اوزار کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا لیکن تمہاری طرح اپنا باپ نہیں بدلوں گا۔''

''تم ٹیڑھی بات کیوں کرتے ہو؟''

''تم سیّد خاندان میں پیدا ہوئے ہو، تم ہی بتاؤ، تمہارا وہ باپ سیّد علیم الدین کون ہے؟''

''ابا! وہ تم ہو۔''

''بیٹے! میں موچی علم الدین ہوں۔''

بتول نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''بحث نہ کرو۔ ہمارا بیٹا بڑی مشکل میں ہے۔''

اس نے بیٹے کو ناگواری سے دیکھ کر پوچھا۔ ''کیسی مشکل؟''

''ہمارے بیٹے کو ایک لڑکی پسند آ گئی ہے۔ میں نے بھی اسے دیکھا ہے۔ ماشاء اللہ بہت خوبصورت ہے۔ شگفتہ نام ہے۔ اس کے خاندان والے شیخ کہلاتے ہیں۔ ہمارا بیٹا سیّد کہلاتا ہے۔ لڑکی والوں کے خاندان سے اونچا بن چکا ہے۔ اگر ہم ماں باپ ہو کر اس کے سیّد ہونے سے انکار کریں گے تو وہاں رشتہ نہیں ہو سکے گا۔''

فضل الرحمٰن نے کہا۔ ''اماں! وہاں تو کیا، کہیں بھی نہیں ہو سکے گا۔ میری اصلیت معلوم ہو گی تو کسی بھی شریف خاندان کی لڑکی کا رشتہ نہیں ملے گا۔ کاروباری حلقوں میں، اونچی سوسائٹی میں مجھے گری ہوئی نظروں سے دیکھا جائے گا۔ یہ بات ابا کی سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔''

''میں نادان نہیں ہوں، خوب سمجھ رہا ہوں، خاندانی برتری کی دوڑ میں تم بہت آگے جا چکے ہو۔ واپس اپنے اصل مقام کی طرف نہیں آ سکو گے۔ میں تمہاری مشکل آسان کرنے کے لیے ایک مشورہ دیتا ہوں، دنیا والوں سے کہہ دو، تمہارا باپ مر چکا ہے۔''

بتول نے تڑپ کر کہا۔ ''مریں آپ کے دشمن۔ کیوں میرا دل دہلانے والی باتیں کر رہے ہو؟''

''میں سچ مچ تو نہیں مروں گا۔ موت سے پہلے کوئی نہیں مرتا۔ البتہ موت سے پہلے ہم

باپ بیٹے ایک دوسرے کے لیے مرجائیں گے۔ کبھی ایک دوسرے سے نہیں ملیں گے۔ ہم میں سے کسی کو موت آئے گی تو کوئی کسی کا جنازہ اٹھانے نہیں آئے گا۔ کیونکہ ایک دوسرے کی قبر پر فاتحہ پڑھنے والا رشتہ ختم ہو چکا ہوگا۔''

بتول آنچل میں منہ چھپا کر رونے لگی۔ وہ بولا۔ ''رونے سے کبھی کوئی مشکل آسان نہیں ہوتی۔ جھوٹی خاندانی برتری حاصل کرنے کا یہی ایک راستہ ہے۔ مجھے مرحوم بنادو۔''

اس نے روتے ہوئے کہا۔ ''کیسی باتیں کرتے ہو؟ کیا میں تمہارے جیتے جی بیوہ کہلاؤں گی؟''

''سوچ لو، کیا کہلانا چاہتی ہو؟ میرے ساتھ رہو گی تو بیوی اور بیٹے کے ساتھ رہو گی تو بیوہ۔''

بتول پریشان ہوگئی۔ نہ شوہر کو چھوڑ سکتی تھی، نہ بیٹے کو۔ یہ بات یقینی ہوگئی تھی کہ باپ اپنے بیٹے کی عالیشان کوٹھی میں رہائش کے لیے نہیں جائے گا۔ سیّد بن کر، باپ کا نام بدل کر بے غیرت نہیں بنے گا۔ وہ ایک غیرت مند موچی بن کر رہے گا۔

دوسری طرف بیٹا نہیں چاہتا تھا کہ اس کی عزت اور شہرت پر کوئی حرف آئے۔ وہ بولا۔ ''ابا! میرا دل اس بات سے مطمئن رہے گا کہ میں سیّد علیم الدین کو مردہ کہوں گا۔ اپنے باپ علم دین کو مرحوم نہیں کہوں گا۔ البتہ یہ سوچ کر دکھ ہو رہا ہے کہ ہم آئندہ ایک دوسرے سے نہیں ملیں گے۔ میں ایک بات تم سے پوچھتا ہوں۔''

باپ، بیٹے نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ بیٹے نے پوچھا۔ ''کیا ہمارے دلوں سے محبت بھی مرجائے گی؟ میں تو تم کو یاد کرتا رہوں گا، تم سے ملنے کے لیے تڑپتا رہوں گا۔''

علم دین نے کہا۔ ''میرے سینے میں پتھر نہیں ہے، دل ہے۔ تم میری ایک ہی اولاد ہو۔ میرا پہلا اور آخری سرمایہ ہو۔ تمہیں کھو کر میں سکون سے نہیں رہ سکوں گا۔ یہ دیکھ کر خوش ہونے کی کوشش کرتا رہوں گا کہ تم روز بروز امیر کبیر ہوتے جا رہے ہو اور جو عزت اور خاندانی برتری میں نہ دے سکا، وہ تم دنیا والوں سے حاصل کر رہے ہو۔''

فضل الرحمٰن نے سر جھکا لیا۔ اس فیصلے کے بعد وہ کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ صرف سر جھکا کر شرمندگی ظاہر کر سکتا تھا۔ باپ کی ضد اور ہٹ دھرمی کو مان کر خود کو اور آئندہ اپنی نسل کو کمتر نہیں بنا سکتا تھا۔

وہ باپ سے آخری بار گلے مل کر رخصت ہوتے وقت ماں سے بولا۔ ''اماں! ابا کی طرح تم میرا ساتھ نہیں چھوڑو گی، میں کوٹھی میں تمہارا انتظار کروں گا۔ تمہیں بہو لانا ہے اور

آئندہ بہت سی ذمہ داریوں کو پورا کرنا ہے۔''

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ ماں کو فیصلے کی سولی پر لٹکا گیا۔ وہ بیٹا تھا، اس نے اس کی کوکھ سے جنم لیا تھا۔ اس کی آنکھوں کا نور، ممتا بھرے سینے کی ٹھنڈک، اس کے جسم کا حصہ، نہ وہ اس حصے کو کاٹ سکتی تھی اور نہ ہی شوہر کی محبت کو نوچ کو پھینک سکتی تھی۔

ماں اور بیوی، دونوں ہی رشتے عظیم اور معتبر ہوتے ہیں۔ ان کی حرمت کو برقرار رکھنا اس کا فرض تھا۔ وہ کسی بھی رشتے کو کمتر بنانا نہیں چاہتی تھی۔ ایسی روایت قائم نہیں کرنا چاہتی تھی، جس کے پیش نظر بیوی سے شوہر اور ماں سے اولاد بدظن ہو جائے۔

یہ اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ دونوں کو بیک وقت خوش نہیں رکھ سکتی تھی۔ فی الحال وہ علم دین کے پاس رہی لیکن دل اور دماغ بیٹے کی طرف اٹکا رہا۔ وہ تمام دن گھر کا کام کرتی رہی اور بڑبڑاتی رہی۔ ''وہ کوٹھی میں اکیلا ہوگا۔ نہ باپ ہے، نہ ماں، اس کے لیے دلہن کون لائے گا۔ ہم بزرگ ہی شگفتہ سے اسے منسوب کر سکتے تھے۔ شریف خاندان والے اس اکیلے کو بیٹی نہیں دیں گے۔ سب پوچھیں گے کہ ماں باپ کہاں ہیں؟''

وہ دن کو سڑک کے کنارے بیٹھ کر جوتوں کی مرمت کرتا تھا۔ رات کو گھر میں مختلف سائز کے جوتے تیار کیا کرتا تھا۔ اس نے ایک جوتے کو پالش کرتے ہوئے کہا۔ ''جب میں نے تجھ سے شادی کی تو میرا بھی کوئی نہیں تھا۔ تیرے ماں باپ کے گھر گیا تھا۔ تجھ سے نکاح پڑھا کر تجھے لے آیا تھا۔ کسی رشتے دار کا آسرا نہیں کیا تھا۔''

''جب ہماری شادی ہوئی تو تمہارے ماں باپ نہیں تھے لیکن ہمارا بیٹا تو یتیم اور یسیر نہیں ہے۔ میرے دل میں کتنے ارمان تھے کہ بیٹے کے سر پر سہرا دیکھوں گی، دھوم دھام سے برات لے کر جاؤں گی اور بہو لانے کے ارمان پورے کروں گی۔ ایک ہی تو بیٹا ہے دس نہیں ہیں کہ یہ نہ سہی دوسرے کی شادی میں ارمان نکال لوں گی۔''

وہ اس کی بڑبڑاہٹ سنتا رہتا اور دل ہی دل میں مسکراتا رہتا۔ بہو لانے کے لیے اس کے اندر کتنی ہلچل مچی رہتی ہے۔ یہ خوب سمجھتا تھا۔ آخر اس نے کہا۔ ''بتول! نہ تُو سکون سے رہے گی نہ ہی مجھے سکون سے رہنے دے گی۔ ایک تو تجھے نیند نہیں آتی اور آ جائے تو نیند میں بھی بیٹے کے لیے دلہن لانے کی باتیں کرتی رہتی ہے۔''

وہ بولی۔ ''میں نے تمہارے ساتھ ساری زندگی گزار دی جتنی سانسیں رہ گئیں، وہ بھی تمہارے لیے ہیں۔ تم میری چھوٹی بڑی خوشیاں تو پوری کرتے رہے ہو لیکن سب سے بڑی اور اہم خوشی پوری نہیں کر رہے ہو۔ جب فضل دین پیدا ہوا تھا، اسی دن سے میں اس کے سر پر

سہرا سجانے کے خواب دیکھ رہی ہوں۔''

''میں کب کہتا ہوں کہ اپنے خواب اور خوشیاں پوری نہ کرو۔ میں تمہیں اجازت دیتا ہوں، بیٹے کے پاس چلی جاؤ۔''

''تمہیں تنہا چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔''

''اور میں سیّد زادہ بن کر وہاں نہیں جاؤں گا۔ بحث کرو گی، بات بڑھاؤ گی تو کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ میں نے ایک لمبی زندگی گزاری ہے، باقی بھی گزار دوں گا لیکن بیٹا ایک نئی زندگی گزار رہا ہے۔ اس کے ساتھ میں نہیں رہ سکتا، تم رہ سکتی ہو۔''

وہ کچھ کہنا چاہتی تھی، اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''میری فکر نہ کر۔ میں بالکل تنہا نہیں رہوں گا۔ تُو کبھی کبھی ملنے آیا کرے گی۔ کتنا اچھا لگے گا جب میں تیرا انتظار کرتا رہوں گا۔ تُو ملنے آئے گی پھر چلی جائے گی۔ پھر ملنے کی امید میں تجھے سوچتا رہوں گا۔ خیالوں میں تجھے بلاتا رہوں گا۔ یوں لگے گا، گزری ہوئی جوانی کو دہرا رہا ہوں۔''

''ہماری عمر کا حساب کیا جائے تو ہم پھٹے پرانے جوتے ہیں۔ تم اپنی خوبصورت باتوں سے اور اپنی محبتوں سے بوڑھی زندگی کی مرمت کرتے رہتے ہو اور اسے چمکاتے رہتے ہو۔ مگر علم دین، میں جاؤں گی تو تمہارے کھانے پینے کا کیا ہوگا؟ کون تمہیں غسل کرنے کے لیے گرم پانی کر کے دے گا؟''

''میں روز صبح دو وقت کی ہانڈی پکا لیا کروں گا۔ تُو میری فکر نہ کر، بیٹے کے گھر جا اور دھوم دھام سے بہو لے آ۔''

وہ عجیب کشمکش میں تھی۔ اس بڑھاپے میں دن رات محنت کرنے والے میاں کا ساتھ نہیں چھوڑنا چاہتی تھی لیکن بہو لانے کے لیے بھی دل مچل رہا تھا اور بیٹا تو ایسا دل سے لگا ہوا تھا کہ اسے دیکھ دیکھ کر جیتی تھی۔ علم دین نے کہا۔ ''تُو اس طرح الجھتی رہی تو نہ اِدھر کی رہے گی، نہ اُدھر کی۔ بیمار پڑ جائے گی۔ میں تو مشکل آسان کر رہا ہوں۔ تجھے خوشی سے بیٹے کے پاس رہنے کو کہہ رہا ہوں۔ میرے دل میں یہ میل نہیں آئے گا کہ تُو مجھے چھوڑ کر گئی ہے۔ اری! تُو مجھے چھوڑ کر کہاں جائے گی؟ میرے دروازے سے بندھی ہوئی گائے ہے۔ رسی کی لمبائی تک جائے گی پھر واپس آ جائے گی۔''

علم دین نے اسے صاف دلی سے بیٹے کے پاس رہنے کی اجازت دے دی۔ وہ مستقل وہاں رہنے لگی۔ بڑی دھوم دھام سے بیٹے کی شادی کی۔ شگفتہ کو بہو بنا کر لے آئی۔ بہو کے خاندان والے عزت دار لوگ تھے۔ خاندانی شرافت کو اہمیت دیتے تھے۔ فضل الرحمٰن نے

تنہائی میں بتول کو سمجھایا۔ ’’اماں! میری عزت کا خیال رکھو۔ ابا سے ہر روز ملنے نہ جایا کرو۔ چھپ چھپا کر جاتی ہو۔ پھر بھی چوری پکڑی جا سکتی ہے۔ میری عزت اور شان و شوکت خاک میں مل سکتی ہے۔‘‘

بتول نے ناراض ہو کر کہا۔ ’’تم کیا چاہتے ہو؟ میں تمہارے باپ سے ملنا چھوڑ دوں۔ اس بڑھاپے میں اسے میری ضرورت ہے لیکن میں تمہارے گھر میں پڑی رہتی ہوں۔‘‘

’’اماں! میں یہ تو نہیں کہتا کہ انہیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ دو۔ بے شک وہ تنہا رہ گئے ہیں۔ آپ کو وہاں جانا چاہیے، ان کا خیال رکھنا چاہیے لیکن ایک ہفتے میں ایک بار۔‘‘

’’کیا......؟ ہفتے میں ایک بار۔‘‘

’’آپ بار بار جائیں گی تو کسی نہ کسی دن، کسی نہ کسی کی نظر میں آ جائیں گی۔‘‘

انہوں نے بے بسی سے بیٹے کی طرف دیکھا۔ ماں کا دل کہتا تھا کہ وہ باپ کا دشمن نہیں ہے۔ اسے صرف ایک ہی ڈر لگا رہتا ہے کہ اس کی عزت اور نیک نامی خاک میں نہ مل جائے۔ وہ بے بسی سے بولی۔ ’’تمہارے لیے مجازی خدا کو چھوڑ دیا، پتا نہیں اور کیا، کیا کرنا ہو گا؟ ٹھیک ہے، میں ہفتے میں ایک بار جاؤں گی۔ ایک رات اور ایک دن وہاں رہا کروں گی۔ دوسرے دن شام کو واپس آیا کروں گی۔‘‘

اس پر بھی بیٹے کو اعتراض تھا۔ اس نے کہا۔ ’’شگفتہ پوچھے گی، آپ ہفتے میں ایک بار چوبیس گھنٹے کے لیے کہاں جاتی ہیں؟ میں کیا جواب دوں گا؟‘‘

’’تم تو بیوی کے آتے ہی اس کے غلام بن گئے ہو۔ شوہر بیوی کے آگے کسی بات کا جواب دہ نہیں ہوتا مگر تم نے تو اسے سر پر چڑھا رکھا ہے۔‘‘

’’اماں ایک تجسس تو پیدا ہوتا ہے کہ آپ گھر کی بزرگ ہیں۔ تنہا چوبیس گھنٹوں کے لیے کہاں چلی جاتی ہیں۔ جب ہمارا اور کوئی رشتہ دار نہیں ہے ہم نے شگفتہ کے میکے والوں کو بتایا ہے کہ ہمارے تمام رشتے دار ہندوستان اور بنگلا دیش میں رہ گئے ہیں۔‘‘

’’بہو سے کہہ دینا، میں اپنی ایک سہیلی کے گھر جاتی ہوں۔ وہ میری بچپن کی سہیلی ہے۔ میرے ماں باپ نہیں تھے، اسی کے ماں باپ نے میری پرورش کی ہے۔ میں اس کی احسان مند ہوں۔ اس لیے ہر ہفتے اس کے پاس جا کر کچھ وقت گزارہ کرتی ہوں۔ وہاں ایک درگاہ شریف ہے۔ میں عقیدت سے وہاں بھی جاتی ہوں۔‘‘

جب شگفتہ نے یہ بات سنیں تو اس نے کہا۔ ’’اماں، آپ کی سہیلی تو قابلِ احترام ہیں۔ آپ انہیں یہاں بھی بلایا کریں۔ ہمیں بھی ان کی خدمت کرنی چاہیے۔‘‘

بتول نے بیٹے کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ کوئی سہیلی نہیں تھی۔ وہ کیسے بہو کے سامنے پیش کرتیں۔ وہ ہچکچاتے ہوئے بولیں۔ ''وہ...... بات یہ ہے کہ میں اپنی سہیلی اور اس کے میاں کو یہاں نہیں لا سکتی۔''

شگفتہ نے تعجب سے پوچھا۔ ''کیوں نہیں لا سکتیں؟''

بتول نے پھر بیٹے کی طرف دیکھا، کچھ تو کہنا ہی تھا لہٰذا وہ بولیں۔ ''وہ...... دراصل میری سہیلی ایک موچی کی بیوی ہے۔''

فضل الرحمٰن نے ایک توہین کے احساس سے ٹوٹ کر سر جھکا لیا۔ بتول نے کہا۔ ''دلہن! کیا تم چاہو گی کہ ایک موچی اور اس کے بیوی بچے اس گھر میں آئیں؟''

شگفتہ نے تھوڑی دیر سوچنے کے بعد کہا۔ ''انہوں نے آپ کی پرورش کی ہے، آپ کا گھر بسایا ہے۔ اگر وہ یہ احسان نہ کرتیں تو آپ سیّدوں کے خاندان میں بیاہ کر نہ آتیں۔''

فضل الرحمٰن نے کہا۔ ''بے شک، ان کا احسان ہے لیکن اماں کی سہیلی اور ان کے گھر والوں کو یہاں بلانا مناسب نہیں ہے۔''

شگفتہ نے کہا۔ ''میں یہی کہنے والی تھی۔ ہمیں دنیا والوں کا خیال رکھنا پڑے گا۔ یہاں تمام ہائی اسٹیٹس کے لوگ آتے ہیں۔ یہ بات چھپی نہیں رہے گی کہ یہاں موچی خاندان والے بھی آتے ہیں۔''

فضل الرحمٰن ندامت سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا، شگفتہ نے پوچھا۔ ''کہاں جا رہے ہیں؟''

''مجھے تھکن ہو رہی ہے۔ میں بیڈ روم میں جا رہا ہوں۔''

شگفتہ نے بھی اٹھتے ہوئے کہا۔ ''اماں! آپ کو ان کے ہاں ضرور جانا چاہیے لیکن انہیں یہاں نہیں آنا چاہیے۔''

وہ اپنے میاں کے ساتھ بیڈ روم میں چلی گئی۔ یہ مسئلہ تو حل ہو گیا کہ وہ ہفتے میں ایک بار چوبیس گھنٹے کے لیے کہیں جائیں گی تو اب بہو تجسس میں مبتلا نہیں رہے گی۔ پھر وہ اسی روٹین کے مطابق ہفتے میں ایک بار علم دین کے پاس جانے لگیں۔ یوں دن مہینے سال گزرنے لگے۔ بتول کی گود میں پہلے ایک پوتا آیا۔ اس کا نام وقاص رکھا گیا۔ اس کے بعد ایک پوتی عینی پیدا ہوئی۔ ایک بار علم دین سخت بیمار ہوا۔ چھوٹے چھوٹے ڈاکٹروں کے علاج سے افاقہ نہ ہوا۔ فضل الرحمٰن نے کہا۔ ''میں اچھی خاصی دولت کما رہا ہوں، یہ صرف میری اولاد کے لیے نہیں، آپ کے اور ابا کے لیے بھی ہے۔ تم ابا کو یہاں کے سب سے مہنگے اسپتال میں لے جاؤ، وہاں ان کا علاج ہونا چاہیے۔''

بتول اپنے میاں کو ایک بہت ہی مہنگے اسپتال میں لے گئیں۔ وہاں اس کا علاج کرانے لگیں۔ انہی دنوں شگفتہ کی زچگی کا وقت آ چکا تھا۔ وہ تیسری بار ماں بننے والی تھی۔ وہ بھی اسی اسپتال میں آئی تو وہاں اپنی ساس کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ وہ اسپیشل وارڈ کے ایک اسپیشل کمرے میں ایک بوڑھے مریض کے ساتھ تھیں۔

وہ زچگی سے فارغ ہو چکی تھی۔ اسپتال سے ڈسچاج ہو چکی تھی۔ نوزائیدہ وکی کو بازوؤں میں اٹھائے، سینے سے لگائے اپنی ایک بیمار سہیلی سے ملنے آئی تھی۔ ایسے ہی وقت اس نے بتول کو ایک کمرے میں جاتے دیکھا۔ اس نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کیا تھا۔ وہ تجسس میں مبتلا ہو گئی۔ اس نے کھڑکی کے پاس آ کر دیکھا، پردہ ذرا سا ہٹا ہوا تھا۔ وہ ایک بوڑھے مریض کے ساتھ نظر آ رہی تھیں۔ اسے دوا پلا رہی تھیں۔ دوا پینے کے بعد اس بوڑھے مریض نے تھکے ہوئے انداز میں اپنا سر ان کے شانے پر رکھ دیا۔ بتول نے بڑے پیار سے اسے دونوں بانہوں میں سمیٹ لیا۔ بڑے جذبے سے اس کا سر سہلانے لگیں۔

شگفتہ دیدے پھاڑ کر یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ اسے بتایا گیا تھا کہ وہ ایک بیوہ ہے اور وہ بیوہ پینتالیس یا پچاس برس کی ضرور ہو گی۔ اس عمر میں وہ یہ گل کھلا رہی تھیں۔ ایک اجنبی کی تیمارداری ایسے کر رہی تھیں جیسے اپنے مجازی خدا کی خدمت کر رہی ہوں۔ وہ ایسی بے حیائی نہ دیکھ سکتی تھی، تیزی سے پلٹ کر جانے لگی۔

جی میں تو آیا تھا کہ وہیں اپنی ساس کو رنگے ہاتھوں پکڑے، اسے ذلیل کرے۔ وہاں اس کی بدچلنی کے کئی گواہ پیدا کرے۔ پھر سوچا۔ ''اس بڑھیا کی بدنامی کم ہو گی، ہماری بے عزتی زیادہ ہو گی۔ اس کا شوہر کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گا۔ وہ بھی اپنے میکے والوں کے سامنے شرمندہ ہو جائے گی۔

فضل الرحمٰن اسے اور نوزائدہ بچے کو لینے کے لیے اسپتال آیا ہوا تھا۔ ویٹنگ روم میں انتظار کر رہا تھا۔ اس نے شگفتہ کو دیکھتے ہی آگے بڑھ کر بچے کی طرف ہاتھ پھیلایا پھر کہا۔

''تھینک یو ڈارلنگ! تم مجھے دوسرا بیٹا دے رہی ہو۔''

وہ غصے سے بولی۔ ''میں ایک بیٹی اور دو بیٹوں کی ماں بن چکی ہوں۔ اگر ان بچوں نے مجھے کسی غیر مرد کے گلے لگتے دیکھ لیا تو کیا یہ مجھ جیسی بے حیا کو ماں کہیں گے؟''

وہ اسے تعجب سے دیکھتے ہوئے بولا ''کیا تمہارا دماغ چل گیا ہے؟ یہ کیسی الٹی سیدھی باتیں کر رہی ہو؟''

''میں الٹی نہیں، سیدھی بات کر رہی ہوں۔ میرے ساتھ آئیں، میں ایسا تماشا دکھاؤں

گی کہ آپ کے ہوش اُڑ جائیں گے۔''

اس نے پوچھا۔''تم مجھے کہاں لے جانا چاہتی ہو؟ کیا تماشا دکھانا چاہتی ہو؟''

وہ حقارت سے بولی۔''آپ کی اماں جان ایک اسپیشل وارڈ کے کمرے میں پہنچی ہوئی ہیں۔ایک بوڑھے مریض سے عشق فرمارہی ہیں۔''

فضل الرحمٰن کے ذہن میں ایک جھٹکا سا لگا۔وہ سمجھ گیا کہ شگفتہ نے اماں اور ابا کو دیکھ لیا ہے۔اس نے پہلے ہی شگفتہ کو منع کیا تھا کہ وہ اس اسپتال میں زچگی کے لیے نہ جائے۔شگفتہ نے اس کی بات ٹال دی تھی اور وہ سمجھ رہا تھا کہ بیوی اس کی بات مان کر کسی دوسرے اسپتال میں گئی ہے۔آج وہ زچگی کے لیے یہاں آئی اور اسے بھی زچگی کے بعد آنے کو کہا۔تب وہ پریشان ہو گیا۔پہلے تو اسے فون پر اطلاع ملی کہ بیٹا ہوا ہے۔زچہ و بچہ دونوں خیریت سے ہیں۔وہ شام کو اسے گھر لے جانے کے لیے آئے۔

اس نے گھر فون گیا، اپنی اماں کو منع کرنا چاہتا تھا کہ آج وہ اسپتال نہ جائیں۔پتا چلا، وہ گھر میں نہیں ہیں، کاروباری مصروفیت اس قدر تھی کہ وہ اسپتال جا کر ماں کو وہاں آنے سے روک نہ سکا۔شام کو اسپتال آیا تو یہ سوچتا ہی رہ گیا کہ اسے اماں اور ابا کی طرف جانا چاہئے کہ نہیں؟ باپ نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ جیتے جی اب کبھی نہیں ملیں گے۔پھر یہ اطمینان تھا، میٹرنٹی وارڈ اسپتال کے دوسرے شعبوں سے الگ ہے۔شگفتہ بچے کو لے کر سیدھی ویٹنگ روم میں آئے گی ادھر اسپیشل وارڈ کی طرف نہیں آئے گی لیکن وہ ایک بیمار سہیلی سے ملنے ادھر چلی گئی تھی۔

انسان سوچتا کچھ ہے، ہوتا کچھ اور ہے۔یوں بھی سچائی کو ایک طویل عرصے تک چھپا کر نہیں رکھا جا سکتا ہے۔سچ کبھی نہ کبھی سامنے آ ہی جاتا ہے۔اس نے پریشان ہو کر شگفتہ سے پوچھا۔''تم اسپیشل وارڈ کی طرف کیوں گئی تھیں؟''

''اپنی ایک بیمار سہیلی سے ملنے گئی تھی۔اس سے تو مل نہ سکی آپ کی اماں جان مل گئیں۔توبہ توبہ، اس بڑھاپے میں ایسی بے حیائی کے بارے میں تو میں سوچ بھی نہیں سکتی۔''

وہ تڑپ کر بولا۔''بکواس مت کرو۔میرے منہ پر میری ماں کو بے حیا کہہ رہی ہو؟''

''میں تو جانتی تھی، آپ کبھی یقین نہیں کریں گے۔سانچ کو آنچ کیا؟ آپ ابھی میرے ساتھ آئیں اور اپنی ماں کے کچھن دیکھیں۔''

اپنی اماں کے بارے میں ایسی باتیں سن کر اسے غصہ آ رہا تھا۔عقل سمجھا رہی تھی، غصہ کرے گا تو بات اور بگڑ جائے گی۔بیوی کو پیار سے سمجھانا ہو گا۔جو سچ اس سے چھپایا جا رہا

تھا۔ اسے اب بتانا ہی ہوگا۔ اس نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے کہا۔ ''شگفتہ ! گھر چلو۔''

وہ شانے پر سے اس کا ہاتھ ہٹا کر بولی۔ ''میں گھر نہیں جاؤں گی۔ آپ پہلے اپنی اماں کے پاس جائیں۔ اپنی آنکھوں سے تماشا دیکھیں۔ پھر یہاں آ کر فیصلہ سنائیں۔''

''کیسا فیصلہ؟''

''یہی کہ اس گھر میں اماں رہیں گی یا میں؟''

وہ سمجھانے کے انداز میں بولا۔ ''پلیز ! دماغ ٹھنڈا رکھو، ایسی باتیں اسپتال میں مناسب نہیں ہیں، ہم گھر چل کر باتیں کریں گے۔''

''ٹھیک ہے میں گھر چل رہی ہوں لیکن وہ آئیں گی تو میں بچوں کو لے کر میکے چلی جاؤں گی۔''

''میری جان ! میرا تمہارا زندگی بھر کا ساتھ ہے۔ میں تمہیں ساتھ چھوڑنے نہیں دوں گا، پلیز گھر چلو۔''

وہ اس کے ساتھ باہر آ کر کار کی اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ وہ کار اسٹارٹ کر کے کوٹھی کی طرف جانے لگا۔ پچھلی سیٹ پر ایک ملازمہ بیٹھی ہوئی تھی۔ شگفتہ اندر سے بھری ہوئی تھی لیکن اس سے کچھ بول نہیں سکتی تھی۔ اس نے فضل الرحمٰن سے کہا۔ ''آپ گاڑی روکیں، شبو کسی ٹیکسی میں آ جائے گی۔''

''وہ بولا۔ ''یہ بچے کو سنبھال رہی ہے۔ اسے اپنے ساتھ چلنے دو۔''

''میں آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔ آئی وانٹ ٹو بی الون ود یو۔''

اس نے انگریزی زبان میں سمجھایا۔ ''جو بھی ضروری بات ہے، گھر چل کر کرو، ابھی صبر کرو۔''

''یہ دیکھ کر کیسے صبر کروں کہ اتنی بڑی بات ہو رہی ہے اور آپ کے ماتھے پر بل نہیں آ رہے ہیں۔ آپ کو تو غیرت کے مارے مر جانا چاہیے یا مار ڈالنا چاہئے۔''

''پلیز ! ایسی باتیں نہ کرو۔ گھر کی باتیں گھر میں ہوا کرتی ہیں۔ کیا تم تھوڑی دیر صبر نہیں کر سکتیں؟''

اس نے ہونٹوں کو سختی سے بھینچ لیا، بے چینی سے یوں پہلو بدلنے لگی جیسے انگاروں پر بیٹھ گئی ہو۔ وہ ملازمہ کی موجودگی میں اس سے زیادہ بحث نہیں کر سکتی تھی۔ اپنے آپ پر صبر کرتی رہی اور جبر کرنے لگی۔

کوٹھی پہنچ کر وہ غصے سے پاؤں پٹختی ہوئی اپنے بیڈروم میں آ گئی۔ ملازمہ بچے کو اٹھائے اس کے پیچھے پیچھے تھی۔ وہ بچے کو اس سے لے کر بولی۔ ''تم جاؤ۔ جب تک نہ بلاؤں، ادھر نہ آنا۔''

وہ چلی گئی۔ وقاص اور عینی پانچ برس اور دو برس کے تھے۔ ایک گورنس کی نگرانی میں رہتے تھے۔ فضل الرحمٰن کمرے میں آیا۔ شگفتہ نے بچے کو بستر پر ڈال کر انٹرکام کے ذریعے گورنس سے کہا۔ ''بچوں کو ادھر نہ آنے دو، ہم ضروری باتیں کر رہے ہیں۔''

اس نے انٹرکام کو بند کیا۔ فضل الرحمٰن نے دروازے کو اندر سے بند کرتے ہوئے کہا۔ ''غصہ کرنے یا چیخنے چلانے سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ دماغ کو ٹھنڈا رکھو، میں ایسی بات کہنے والا ہوں جسے سن کر تمہیں اور زیادہ غصہ آ سکتا ہے۔ تمہارا غصہ ہم دونوں کو نقصان پہنچائے گا۔ ہمارا یہ گھر ٹوٹ جائے گا۔ ہم ایک دوسرے سے بچھڑ جائیں گے۔ کیا تم کسی حال میں بھی میرا ساتھ چھوڑ کر چلی جاؤ گی؟''

وہ سوچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھنے لگی پھر بولی۔ ''پہیلیاں کیوں بجھوا رہے ہو، جو کہنا ہے صاف صاف کہو۔''

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ''میری اماں کو بے غیرت نہ سمجھو۔ تم نے اسپتال میں جو کچھ دیکھا، اسے سمجھنے میں غلطی کر رہی ہو۔''

''میں نے اپنی ان دونوں آنکھوں سے دیکھا ہے۔ آنکھوں دیکھا سچ کبھی جھوٹ نہیں ہوتا ہے۔ آپ ان کی بے جا حمایت کر رہے ہیں۔''

''شگفتہ! ہم نے تم سے ایک بہت اہم بات چھپائی تھی، آج وہ کہنی پڑ رہی ہے۔ میری اماں بیوہ نہیں ہیں۔''

''کیا......!'' اس نے حیرانی سے پوچھا۔

''ہاں...... میرے ابا زندہ ہیں۔ تم نے اماں کو ابھی جس کے ساتھ دیکھا تھا، وہ میرے ابا ہیں۔''

وہ شدید حیرانی سے ایک قدم پیچھے گئی پھر مٹھیاں بھینچ کر بولی۔ ''نہیں، آپ جھوٹ کہہ رہے ہیں۔ آپ اسے ابا نہ کہیں ورنہ میں شرم سے مر جاؤں گی۔''

''یہ شرم کی بات نہیں ہے۔ وہ میری اماں کے مجازی خدا ہیں۔''

''نہیں، نہیں...... نہیں۔'' وہ چیخنے لگی۔ ''آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ آپ ماں کی برائی پر پردہ ڈالنے کے لیے ایک موچی کو اپنا باپ کیوں بنا رہے ہیں؟''

فضل الرحمٰن کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اس نے پوچھا۔ ''تم سے کس نے کہا کہ وہ موچی ہیں؟''

''مجھ سے کون کہے گا؟ میں اسے برسوں سے جانتی ہوں۔ اسکول جاتی تھی، کبھی جوتیاں ٹوٹ جاتی تھیں یا تلا گھس جاتا تھا تو میں اس سے جوتیاں مرمت کراتی تھی۔ وہ ہمارے گھر اور اسکول کے درمیان والی ایک سڑک کے کنارے بیٹھا رہتا تھا۔''

وہ چند سیکنڈ تک سانس لینا بھول گیا سو جتن سے چھپائی جانے والی سچائی یوں سامنے آئے گی، وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اب کسی طرح کی بات بنا کر حقیقت پر پردہ نہیں ڈالا جا سکتا تھا۔ وہ جھاگ کی طرح صوفے پر بیٹھ گیا۔

وہ کہہ رہی تھی۔ ''خدا کے لیے اسے اماں سے منسوب نہ کریں، کہہ دیں کہ یہ جھوٹ ہے۔ آپ خاموش کیوں ہیں؟''

اس کے پاس بولنے کے لیے کچھ نہیں رہا تھا۔ بولنا تو دور کی بات ہے، اس سے نظریں نہیں ملا پا رہا تھا۔ وہ اس کے پاس آ کر جھک کر اسے گھورتے ہوئے بولی۔ ''میں کچھ پوچھ رہی ہوں۔ آپ کی خاموشی کا مطلب کیا ہے؟ دیکھیں، میرا دل گھبرا رہا ہے۔ یہ سچ ہو گا تو میں مر جاؤں گی۔ اپنے بچوں کو زہر دے کر مار ڈالوں گی۔''

وہ سن رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ شگفتہ کو ایک موچی کی بہو بننے کے لیے کیسے قائل کرے۔ وہ سخت لہجے میں بولی۔ ''آپ کا جھکا ہوا سر اور خاموشی کہہ رہی ہے کہ آپ مجھے پچھلے سات برسوں سے دھوکا دیتے آ رہے ہیں۔ بولیں، یہ سچ ہے؟''

اس کی زبان نہیں کہہ پا رہی تھی، جھکا ہوا سر سچ بول رہا تھا۔ وہ پیچھے ہٹ کر پاؤں پٹخ کر بولی۔ ''منہ سے کیوں نہیں کہتے کہ آپ جھوٹے ہیں۔ مکار ہیں، آپ کسی بھی سیّد خاندان سے نہیں ہیں۔ آپ ایک موچی کے خاندان سے ہیں۔''

اس نے منہ پھیر لیا۔ سر کو تھام لیا پھر بولی۔ ''تم جھوٹ بول کر ہمارے معزز خاندان میں گھس آئے۔ مجھ جیسی عزت دار لڑکی کو بیوی بنا کر میری عزت سے کھیل رہے ہو۔ مجھ سے اولادیں پیدا کر رہے ہیں۔ تم کتنے مکار اور گرے ہوئے ہو۔ سیّد زادے بن کر ڈنکے کی چوٹ پر ایک شریف زادی کی آبرو لوٹتے رہے ہو اور سمجھتے ہو کبھی پکڑے نہیں جاؤ گے۔ میرا جی چاہ رہا ہے، اپنے کپڑے پھاڑ کر بال نوچتی ہوئی، چیختی ہوئی باہر نکل جاؤں۔ ساری دنیا کے سامنے چیخ چیخ کر کہوں کہ میں تمہارے ساتھ ہونے والے نکاح کو نہیں مانتی۔ نکاح جائز نہیں ہے۔ ہمارے بچے جائز نہیں ہیں۔ تم نے غلط شجرہ بتا کر مجھ سے نکاح پڑھوایا ہے۔''

وہ عاجزی سے بولا۔ ''میرے بچوں کو ناجائز نہ کہو۔ میں نے اپنے نام سے تمہیں اپنی منکوحہ بنایا ہے۔ جذباتی انداز میں غلط نہ کہو کہ میں تمہاری عزت لوٹ رہا ہوں۔ پچھلے سات برسوں سے تم میری محبت کے گن گا رہی ہو۔ یہ تسلیم کرتی آ رہی ہو کہ میری محبت، میری محنت اور میری کمائی صرف تمہارے لیے ہے۔ میں دنیا کے تمام محبت کرنے والے معزز شوہروں کی طرح تمہیں سب سے زیادہ اہمیت دیتا ہوں۔ کیا میرے ایک باپ کے موچی ہونے سے میری تمام محبت، خلوص اور نیک نیتی پر پانی پھر جائے گا۔ کیا میں اپنی تمام محبت، تمام دولت تم پر لٹا کر بھی دو کوڑی کا انسان کہلاؤں گا؟''

''ہاں، ہماری سوسائٹی میں جینے کے لیے خاندانی برتری سب سے اہم ہے۔ جب آپ کی حقیقت دنیا والوں کو معلوم ہوگی تو میرا سر جھک جائے گا۔ میرے خاندان والے کسی سے نظریں نہیں ملا سکیں گے۔''

''تم خاموش رہو گی تو تمہارے میکے والوں کو بھی میری حقیقت معلوم نہیں ہوگی۔''

''حقیقت کبھی نہیں چھپتی۔ کیا آپ کے چھپانے سے چھپ گئی ہے؟ پھر میں کیوں چھپاؤں؟ مجھ سے جھوٹ اور فریب برداشت نہیں ہو رہا۔ میں ایک سیّد زادے کو اپنا مجازی خدا مانتی آ رہی تھی۔ ایک موچی زادے کو یہ درجہ کیسے دوں؟ میں یہ زہر نہیں پی سکوں گی، میں میکے جا رہی ہوں۔''

وہ الماری کھول کر ایک اٹیچی نکال کر اپنا ضروری سامان رکھنے لگی۔ فضل الرحمٰن نے اس کے قریب آ کر کہا۔

''میں روکنا چاہوں گا، تم غصہ دکھاؤ گی، یہاں خواہ مخواہ چیخ و پکار ہوگی۔ جب مجھے تماشا بننا ہی ہے تو پھر گھر میں کیوں بنوں؟ جاؤ باہر، مجھے بھی تماشا بناؤ، خود بھی بنو۔ تمہارے دل میں صرف خاندانی شجرہ ہے اور میری محبت نہیں ہے تو تم مجھ سے علیحدگی اختیار کر لو گی۔ شاید طلاق بھی لینا چاہو گی۔ میرے پاس دولت ہے، طاقت ہے۔ میں اپنے بچوں کو تمہارے پاس نہیں رہنے دوں گا۔ تم تنہا ہو جاؤ گی۔ میکے میں سوتیلی ماں کے رحم و کرم پر رہو گی۔ یہ گھر چھوڑنے سے پہلے اچھی طرح سوچ لو۔ نہ گھر کی رہو گی، نہ گھاٹ کی۔ یہاں تم کروڑوں میں کھیل رہی ہو۔ وہاں تمہارا خاندانی شجرہ تو رہے گا لیکن اس شجرے والے تمہیں ٹھوکروں میں رکھیں گے۔''

وہ جھک کر اٹیچی میں سامان رکھ رہی تھی، آہستہ آہستہ وہیں بیڈ پر بیٹھ گئی تھی۔ دوپٹے میں منہ چھپا کر رونے لگی۔ ایک موچی کی بہو بننے والی بات سے زیادہ اب یہ حقیقت رُلا رہی تھی کہ اسی موچی کے بیٹے کے گھر میں اسے عزت مل رہی تھی۔ وہاں سے کنگال ہو کر میکے

جائے گی تو ہمیشہ وہاں تین وقت کی روٹیاں کوئی مفت میں نہیں کھلائے گا اور لڑے گا تو طعنے بھی دے گا۔ فضل الرحمٰن کی طرح نہ محبت کرے گا اور نہ ہی بے انتہا دولت دے گا۔ وہ اس گھر سے قدم نکالے گی تو تمام دولت اور شان و شوکت سے محروم ہو جائے گی۔

فضل الرحمٰن اسے دیکھ رہا تھا اور سمجھ رہا تھا کہ وہ دوپٹے کے پیچھے منہ چھپا کر اپنے موجودہ حالات پر غور کر رہی ہے۔ اس کی عقل اسے سمجھائے گی کہ دولت اور خوش نصیبی کو ٹھکرانا نہیں چاہیے۔ وہ اسے رونے اور سوچنے سمجھنے کے لیے تنہا چھوڑ کر کمرے سے باہر آ گیا۔ زینے سے اُتر کر ڈرائنگ روم میں جانے لگا۔ ڈائننگ روم میں گورنس وقاص اور عینی کو کھانا کھلا رہی تھی۔ وقاص نے کہا۔ ''ڈیڈ! ہم منے کو دیکھیں گے۔''

عینی نے کہا۔ ''میں منے کو گود میں لوں گی۔ اسے خوب پیار کروں گی۔''

اس نے دونوں بچوں کو چوم کر کہا۔ ''منا ابھی سو رہا ہے۔ تم بھی کھانے کے بعد سو جاؤ۔ صبح اسے دیکھنا اور خوب پیار کرتے رہنا۔ ٹھیک ہے، گڈ نائٹ۔''

بچوں نے بھی گڈ نائٹ کہا۔ وہ وہاں سے ٹی وی لاؤنج کی طرف جانا چاہتا تھا۔ اسی وقت بتول بی آ گئیں۔ انہوں نے مسکرا کر نوزائیدہ بچے کی مبارک دی پھر پوچھا۔ ''میرا پوتا کہاں ہے؟ ماں کے پاس بیڈ روم میں ہو گا۔ میں جا کر دیکھتی ہوں۔''

اس نے کہا۔ ''اماں، آپ اپنے کمرے میں چلیں، میں کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

دونوں کمرے میں آ گئے۔ بتول نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟''

''بات کیا ہو گی، آپ اور ابا میرے لیے مشکلیں پیدا کرتے رہتے ہیں۔''

''اب کون سی مشکل آ پڑی ہے؟''

''شگفتہ نے آپ کو ابا کے ساتھ دیکھ لیا ہے اور وہ ابا کو موچی کی حیثیت سے جانتی ہے۔ اسکول لائف سے اپنی جوتیاں ان سے مرمت کراتی رہی ہے۔''

وہ پریشان ہو کر بیٹے کا منہ تکنے لگیں پھر انہوں نے پوچھا۔ ''اب وہ کیا کہہ رہی ہے؟''

''آپ سمجھ سکتی ہیں۔ مجھ سے جھگڑا کر رہی تھی۔ مجھے کمتر اور خود کو برتر کہہ کر گھر چھوڑ کر جانا چاہتی تھی۔''

''نہیں بیٹے، اسے نہ جانے دینا۔ بچے دربدر ہو جائیں گے۔''

''میں نے اسے سمجھایا ہے۔ اسے کمرے میں تنہا چھوڑ کر آیا ہوں۔ اسے خود اپنا بھلا برا سمجھنا چاہیے۔ اگر وہ مجھ سے سمجھوتا نہیں کرے گی تو صرف میں دنیا والوں کی نظروں سے نہیں گروں گا، وہ بھی بلندی سے انتہائی پستی میں آ گرے گی۔ یہ بات میں نے اسے اچھی طرح

سمجھا دی ہے۔''

''دلہن کو کوئی غلط فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔ میں بھی اسے جا کر سمجھاتی ہوں۔''

''آپ ابھی اس کے سامنے نہ جائیں۔ اسے تنہا رہنے دیں۔ ہم اسے روکنا چاہیں گے، اس کی خوشامد کریں گے تو وہ سر چڑھ کر بولے گی۔ وہ ہمارے کہنے پر یہاں رہنے کا فیصلہ کرے گی تو گویا احسان کرے گی۔ ساری زندگی خود کو برتر اور مجھ کو کمتر کہہ کر طعنے دیتی رہے گی۔''

بتول بی نے کہا۔ ''ٹھیک کہتے ہو۔ وہ ہماری بات مان کر رہے گی تو مجھے بھی طعنے دیتی رہے گی۔''

وہ بے زاری سے بولا۔ ''یہ ساری مصیبت ابا نے کھڑی کی ہے۔ اگر وہ پہلے دن مان لیتے اور یہاں ہمارے ساتھ رہنے لگتے تو آپ کو بار بار ان کے پاس جانا نہ پڑتا۔ میں نے کہا تھا کہ بار بار جا کر ملنے سے کسی دن بھید کھل جائے گا۔''

''اس وقت تو تم گدھے کی طرح بول رہے ہو۔ ذرا عقل سے سوچو۔ تمہارا باپ یہاں آ کر رہتا اور میرے ساتھ شگفتہ کا رشتہ مانگنے جاتا تو کیا وہاں شگفتہ انہیں اسی وقت موچی کی حیثیت سے پہچان نہ لیتی؟''

وہ کوئی جواب نہ دے سکا۔ باپ تو ایک اشتہار کی طرح سڑک کے کنارے بیٹھا رہتا تھا۔ پتا نہیں اونچی سوسائٹی کے اور کتنے لوگ اسے چہرے سے پہچانتے ہوں گے۔ علم دین نے یہ اچھا ہی کیا تھا، اس کے ساتھ کوٹھی میں نہیں رہتا تھا ورنہ شگفتہ کی طرح اور نہ جانے کتنے اسے جاننے والے نکل آتے۔

بتول بی نے کہا۔ ''پوتے کو دیکھنے کے لیے دل مچل رہا ہے مگر کیسے جاؤں، دلہن ناراض ہے۔ کیا تم اسے یہاں نہیں لا سکتے؟ اسے سینے سے لگاؤں گی، خوب پیار کروں گی۔''

''ابھی بچے کو اس کے پاس سے اٹھا کر لانا مناسب نہیں ہے، آپ صبر کریں۔''

بتول بی دروازے کی طرف دیکھ کر کھڑی ہو گئیں۔ فضل الرحمٰن نے بھی ادھر دیکھا۔ شگفتہ بچے کو اٹھائے وہاں آئی تھی۔ بتول بی خوش ہو کر بچے کو لینے کے لیے آگے بڑھیں، وہ روکنے کے انداز میں ایک ہاتھ بڑھا کر بولی۔ ''پہلے میری بات سن لیں۔''

وہ رک گئیں۔ اس نے کہا۔ ''یہ میرا گھر ہے۔ میں نے یہاں بچے پیدا کئے ہیں۔ میں آپ کے بیٹے کی نسل کو آگے بڑھا رہی ہوں۔ اس گھر کے لیے اور آئندہ نسل کے لیے کیا اچھا ہے اور کیا برا ہے، اسے سمجھانا اور سمجھ کر عمل کرنا میرا فرض ہے۔ سب سے پہلی بات یہ کہ

میرے میکے والوں کو آپ کی اصلیت معلوم نہ ہو۔ ہمارے بچوں سے بھی یہ سچ چھپایا جائے گا۔"

فضل الرحمٰن نے خوش ہو کر کہا۔ "تم بڑی ذہانت سے یہ فیصلے کر رہی ہو۔"

"آپ کو اور اماں کو بھی یہ فیصلہ کرنا ہے کہ یہ ہمارے گھر میں رہیں گی۔ یا اپنے شوہر کے پاس جائیں گی؟ وہاں جائیں گی تو یہاں واپس نہیں آئیں گی۔"

"دلہن! یہ تو کبھی ہو نہیں سکتا کہ میں اپنے میاں کو چھوڑ دوں۔ کیا تم میرے بیٹے کو چھوڑ کر رہ سکتی ہو؟"

"مجھ میں اور آپ میں بہت فرق ہے۔ میں آپ کے بیٹے کی عزت اور برتری کی خاطر یہاں رہ کر احسان کروں گی۔"

فضل الرحمٰن نے جھڑک کر کہا۔ "بکواس مت کرو۔ تم یہاں محبت کرنے والی بیوی بن کر رہ سکتی ہو۔ دوبارہ احسان کا لفظ زبان پر نہ لانا۔ مجھے کمتر بنا کر اپنے دباؤ میں رکھنے کے خواب نہ دیکھنا۔ میں تمہاری یا کسی کی برتری برداشت نہیں کروں گا۔ بچہ اماں کو دو۔"

بتول بی پوتے کو اس سے لے کر چومنے لگیں۔ شگفتہ ناگواری سے انہیں دیکھنے لگی۔ پھر بولی۔ "میں آپ کی اصلیت دنیا والوں سے چھپانا چاہتی ہوں لیکن آپ ایسا نہیں چاہتے۔ آپ اماں کو بار بار اپنے ابا کے پاس جانے دیں گے تو کیا بات چھپی رہے گی؟ آپ دنیا والوں کو کیسے چپ کرائیں گے؟"

بیٹے نے سوالیہ نظروں سے ماں کو دیکھا۔ وہ بولیں۔ "مجھے کیا دیکھ رہے ہو؟ کیا تمہارے باپ کو چھوڑ دوں؟ کیا بڑھاپے میں ان کی خدمت نہ کروں؟"

"میں یہ نہیں کہتا۔ آپ ضرور ان کی خدمت کرتی رہیں لیکن آپ یوں ہر ہفتے ان کے پاس جائیں گی تو پھر کسی نہ کسی کی نظروں میں آ جائیں گی۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ وہ کسی دوسرے شہر چلے جائیں۔ آپ ان کے لیے وہاں ایک مکان خرید لیں۔ ہر ماہ ایک ہفتے کے لیے وہاں ایک چلی جایا کریں۔ اس طرح آپ ایک ماہ میں سات دن ان کے پاس رہ سکیں گی۔"

"تم اپنے باپ کے مزاج کو بھول رہے ہو۔ وہ اس جگہ کو کبھی نہیں چھوڑیں گے، جہاں پچاس برس گزار چکے ہیں۔ انہوں نے وہاں سے پہلا رزق حاصل کیا تھا۔ مرتے دم تک وہیں رہیں گے۔"

"یہ تو ابا کی خواہ مخواہ کی ضد ہے۔ وہ میری خاطر جانا چاہیں تو جا سکتے ہیں۔"

''تم کسی دوسرے شہر کیوں نہیں چلے جاتے؟ اسی لیے نہ کہ تم بھی اس شہر سے رزق حاصل کررہے ہو۔ وہ یہیں رہیں گے۔ تمہیں میرے بڑھاپے کا خیال نہیں ہے۔ مجھے ہر ماہ ایک شہر سے دوسرے شہر بھیجنا چاہتے ہو؟''

''پھر یہ مسئلہ کیسے حل ہوگا؟''

''میں ہر ہفتے ان سے ملنے جایا کروں گی۔ میری کوشش ہوگی کہ کسی کی نظروں میں نہ آؤں اور میں کیا کرسکتی ہوں۔ یہ خیال دل سے نکال دو کہ تمہاری طرح میں بھی طوطا چشم ہوکر ان سے آنکھیں پھیرلوں گی۔''

شگفتہ نے پوچھا۔ ''آپ کو اپنے بیٹے کی عزت کا ذرا بھی خیال نہیں ہے۔''

''خیال ہے۔ تب ہی تو ایک گناہگار کی طرح چھپ کر وہاں جاتی ہوں۔''

''تو پھر وہیں جاکر رہ جائیں، یہاں نہ آئیں۔''

''میں اپنے بیٹے اور پوتی، پوتوں کے ساتھ بھی رہوں گی۔ تم مجھ سے پیچھا چھڑانے والی بات سوچتی رہو۔ تمہارے یہ خواب کبھی پورے نہیں ہوں گے۔''

''میں بھلے کی کہہ رہی ہوں اور بری بن رہی ہوں۔ آج آپ کی وجہ سے مجھے اصلیت معلوم ہوگئی۔ آئندہ کبھی دوسروں کو معلوم ہوگی تو صرف آپ کا بیٹا ہی نہیں، آپ کے پوتے اور پوتی بھی جعلی سیّد اور موچی کی اولاد کہلائیں گے۔ جو آگے ہونے والا ہے اسے بھی سمجھ لیں تو بہتر ہوگا۔''

بتول بی نے بیٹے اور پوتی پوتے کے لیے اتنا کیا تھا کہ اپنے بوڑھے شوہر کو ہفتے میں چھ دنوں تک تنہا چھوڑ دیتی تھی۔ وہ علم دین کو اس سے زیادہ باپ بننے کی سزا نہیں دے سکتی تھیں۔ انہوں نے کہہ دیا۔ آئندہ جو ہوگا دیکھا جائے گا، وہ معمول کے مطابق چھ دن کے بعد چوبیس گھنٹے کے لیے جایا کریں گی۔

☆======☆======☆

فضل الرحمٰن کی شادی کو اٹھائیس برس گزر گئے۔ پھر کوئی ناگوار واقعہ پیش نہیں آیا۔ شگفتہ راز دان بن کر رہی تو اپنی اولاد کو بھی باپ دادا کی اصلیت معلوم نہ ہوسکی۔ اتنے برس گزر جانے کے بعد یہ یقین ہوگیا تھا کہ اب یہ راز کبھی نہیں کھلے گا۔

علم دین ان سے دور ہوگیا تھا۔ وہ بھی ایک انسان تھا۔ اس کے سینے میں محبت بھرا دل تھا۔ یہ دل اپنے لہو کے رشتوں کے لیے تڑپتا تھا۔ وہ بھی اپنے دکھ سکھ بانٹنا چاہتا تھا لیکن بانٹنے کے لیے بتول بی کے سوا کوئی نہ تھا۔ جب بیٹے کی شادی ہوئی تو اس نے بتول بی سے پوچھا۔

''بہو کیسی ہے؟ تُو نے بتایا تھا، بہت خوبصورت ہے۔ پر معلوم تو ہو کتنی خوبصورت ہے۔ ہمارے بیٹے کے ساتھ کیسی لگتی ہے؟ ان کی جوڑی اچھی لگتی ہو گی نا؟ بس ایک بار دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔''

چند ماہ بعد بتول بی نے اس سے کہا۔ ''کل ہم پکنک کے لیے کلری جھیل جا رہے ہیں۔ تم وہاں پہنچ جاؤ۔ دور ہی دور سے بہو کو جی بھر کے دیکھتے رہو۔''

وہ دوسرے دن وہاں گیا، اپنی بیوی اور بیٹے کے ساتھ ایک خوبصورت لڑکی ہنستی بولتی دکھائی دی۔ وہ ان سے دور رہا۔ چھپ کر شگفتہ کو دیکھ کر خوش ہوتا رہا۔ وہاں سے گھر واپس آیا تو دل میں یہ دکھ تھا کہ وہ اپنوں کے ساتھ ایسی ہنستی بولتی زندگی نہیں گزار سکے گا۔

ایک سنار سے اس کی بہت دوستی تھی۔ اس نے بہو کے لیے خوبصورت نئے ڈیزائن کے سینڈل تیار کیے۔ سنار کے ذریعے ان پر سونے کے پتر چڑھائے اور ان میں دو ننھے سے ہیرے ٹانک دیے۔ بتول بی نے سینڈل لے جا کر شگفتہ کو پیش کیے تو وہ حیرانی سے انہیں دیکھنے لگی، کہنے لگی، ایسے خوبصورت اور بیش قیمت سینڈل تو دنیا میں کسی کے پاس نہیں ہوں گے۔ آپ یہ کہاں سے لائی ہیں؟''

''میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میری سہیلی کے میاں جوتے تیار کرتے ہیں۔ انہوں نے تم کو بہو مان کر یہ تحفہ بھیجا ہے۔''

''میں اتنا قیمتی تحفہ نہیں لوں گی۔ اسے قبول کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ میں انہیں کم از کم چائے پر بلاؤں اور اپنی طرف سے بھی کوئی تحفہ پیش کروں۔''

''تم فکر نہ کرو۔ میں اپنی طرف سے انہیں کوئی تحفہ دے دوں گی اور وہ خود یہاں نہیں آئیں گے۔ اس عالی شان حویلی میں ہمارے برابر بیٹھ کر چائے نہیں پئیں گے، وہ اپنی اوقات جانتے ہیں۔''

شگفتہ نے وہ تحفہ رکھ لیا۔ اپنے میکے والوں کو اور اپنے گھر آنے والی امیر کبیر خواتین کو وہ سینڈلیں خوش ہو کر دکھانے لگی۔ وہ بڑے فخر سے کہتی تھی کہ سینڈلوں کی ایسی جوڑی کسی کے پاس نہیں ہو گی۔ یہ اس کے میاں پیرس سے لے کر آئے ہیں۔ اگر اسے حقیقت معلوم ہوتی تو وہ ایک موچی سسر پر کبھی فخر نہ کرتی۔

علم دین نے اس طرح دور سے بہو کو دیکھ کر اور اسے قیمتی تحفہ دے کر دل کو تسلی دے دی۔ اس نے نہیں پہچانا کہ وہ لڑکی اسکول سے کالج میں پڑھنے تک اس کے پاس کئی بار جوتیاں سلوانے آ چکی ہے۔ شاید دور سے دیکھنے کے باعث پہچان نہ سکا یا پھر یادداشت کمزور

ہو گئی تھی۔

وہ اسی طرح اپنی پوتی اور پوتوں کو بھی دور سے اسکول جاتے اور آتے دیکھتا رہتا تھا۔ جب بڑے پوتے وقاص نے شادی کی تو بتول نے بہو کی بہو آرزو کی تصویریں لا کر دکھائیں۔ وہ خوش ہو کر بولا۔ ''اسے تو میں اردو اور انگریزی رسالوں میں دیکھ چکا ہوں۔ ٹی وی کے ڈراموں میں بھی آتی ہے۔ ماشاء اللہ بہت خوبصورت ہے۔ میں اسے بھی دور سے دیکھوں گا اور اس کے لیے بھی سونے کی سینڈلیں تیار کروں گا۔''

آرزو کے لیے سینڈلیں تیار کرتے وقت خیال آیا کہ اپنی پوتی عینی بھی جوان ہو چکی ہے۔ ایسی غیر معمولی سینڈلیں پوتی کے پاس بھی ہونی چاہئیں۔ وہ بھی خوش ہو جائے گی۔ وہ بزرگ تھا، خاندان کا سب سے اہم فرد تھا۔ انہیں جوتوں سے ہی خوش رکھ سکتا تھا۔

سمندر کے ساحل پر ٹی وی ڈرامے کی ریکارڈنگ ہو رہی تھی۔ کیمرے اور ساؤنڈ مشین وغیرہ ریکارڈنگ کے لیے تیار تھے۔ ایک بڑی سی چھتری کے سائے میں آرزو بیٹھی اپنا میک اپ درست کر رہی تھی۔ ایک اسسٹنٹ نے آ کر اس سے کہا۔ ''میڈم! ایک بوڑھا آپ سے ملنا چاہتا ہے۔''

وقاص آرزو کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ ''ڈارلنگ! یہ تو جانتا ہوں کہ تمہارے بے شمار فین ہیں لیکن یہ آج معلوم ہوا کہ بوڑھے بھی تم پر مرتے ہیں۔''

وہ ہنسنے لگی، اسسٹنٹ سے بولی۔ ''اسے ٹال دو۔ میں بہت مصروف ہوں۔''

وقاص نے کہا۔ ''کیوں ایک بوڑھے کا دل توڑتی ہو۔ اسے بلا کر دو باتیں کر لو، دعائیں دے گا۔''

وہ بولی۔ ''ٹھیک ہے، اسے یہاں بھیج دو۔''

ابھی علم دین کی کمر جھکی نہیں تھی۔ وہ بڑھاپے میں بھی تن کر چلتا تھا لیکن اس وقت وہ عاجزی سے جھکتا ہوا ان کے سامنے آیا۔ اس کے ہاتھوں میں ایک ڈبا تھا جس پر رنگین کاغذ چڑھا ہوا تھا۔ اس نے سامنے آتے ہی انہیں سلام کیا۔ وقاص نے کہا۔ ''وعلیکم السلام، ویسے آپ بزرگ ہیں۔ سلام ہمیں کرنا چاہیے۔''

وہ بولا۔ ''کوئی فرق نہیں پڑتا۔ السلام علیکم کے معنی ہیں، تم پر سلامتی ہو، یہ دعا ہے۔ میں نے دعا دی ہے۔''

اس نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ''تشریف رکھیے۔''

''کوئی بات نہیں۔ بس میں ابھی چلا جاؤں گا۔ اپنی دلہن بیٹی کے لیے ایک تحفہ لایا

ہوں۔"

آرزو نے چونک کر اسے دیکھا پھر پوچھا"آپ نے مجھے دلہن کیوں کہا؟ کیا میں شادی شدہ لگتی ہوں۔"

"ہاں بیٹی! تمہارے چہرے پر سہاگنوں جیسی رونق ہے۔کیا میرا تحفہ قبول کرو گی؟"

وہ علم دین سے ڈبا لے کر وقاص کو دیتی ہوئی بولی۔"شوبز کی دنیا میں ٹاپ پر رہنے والی ہیروئن اپنی شادی کے معاملات چھپا کر رکھتی ہے لیکن یہ بابا صاحب تو چہرہ پڑھ لیتے ہیں۔"

وقاص نے ڈبے پر سے رنگین کاغذ اتارتے ہوئے پوچھا۔"کیا آپ آرزو کو شادی کا تحفہ دے رہے ہیں؟ ویسے اس میں کیا ہے؟"

"جوتے......" اس نے مختصر سا جواب دیا۔

دونوں نے چونک کر اسے دیکھا۔ پھر آرزو نے ناگواری سے کہا۔"آپ بوڑھے ہو گئے اور یہ نہیں جانتے کہ کسی کو تحفے میں جوتے کبھی نہیں دیے جاتے۔"

"بیٹی! تمہیں ناراض نہیں ہونا چاہیے۔ یہ تحفہ حسبِ حال ہے۔ میں موچی ہوں، جوتے گانٹھتا ہوں۔تم جس خاندان میں بیاہ کر آئی ہو، وہاں بھی جوتے ہی تیار کیے جاتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ اس خاندان کے لوگ موچی نہیں کہلاتے۔"

وقاص نے غصے سے کہا۔"آپ یہ کیا بکواس کر رہے ہیں۔ہم بھلا موچی کیوں کہلائیں گے؟ ہم تو مشینوں سے جوتے تیار کرتے ہیں۔ لے جاؤ اسے،ہمیں یہ تحفہ قبول نہیں ہے۔"

ڈبا کھل چکا تھا۔ آرزو نے سینڈلوں کو دیکھتے ہی لپک کر انہیں اٹھایا، حیرانی سے دیکھتے ہوئے بولی۔"اوگاڈ! یہ کتنی خوبصورت ہیں،سونے کی لگتی ہیں۔"

"جی ہاں۔ یہ سونے کی ہیں اور ان میں جو ہیرے جڑے ہوئے ہیں ، یہ بھی اصل ہیں۔"

آرزو نے بے یقینی سے کہا۔"نہیں۔ اگر یہ اصلی ہیرے ہیں تو پھر بہت قیمتی ہیں۔ تمہیں دیکھ کر یقین نہیں آتا کہ تم ہیرے خرید سکتے ہو اور کسی کو تحفے میں دے سکتے ہو۔"

وقاص نے کہا۔"آرزو! جسٹ اے منٹ! مجھے یاد آ رہا ہے۔ جب ممی اور ڈیڈی کی شادی ہوئی تھی، تب بھی ایسی ہیرے جڑی ہوئی سونے کی سینڈلیں کسی نے ممی کو تحفے میں دی تھیں۔"

پھر اس نے علم دین سے پوچھا۔"کیا وہ سینڈلیں بھی آپ ہی نے دی تھیں؟"

علم دین نے اثبات میں سر ہلایا۔ وقاص نے حیرانی سے پوچھا۔"آپ ہمارے

خاندان کی خواتین کو اتنی مہنگی سینڈلیں کیوں دیتے ہیں؟''

آرزو نے کہا۔''میں ان ہیروں کی قیمت کا اندازہ کرسکتی ہوں، یہ کم از کم پچاس ہزار روپے کے ہیں۔''

''بیٹی! تحفے کی قیمت نہیں لگائی جاتی۔ دینے والے کا دل اور اس کا خلوص دیکھا جاتا ہے اور یہ بھی پوچھا نہیں جاتا کہ ایک سستا یا مہنگا تحفہ کیوں دیا جارہا ہے؟''

''یہ تو آپ کو بتانا ہی ہوگا۔ آپ سے ہمارا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ کوئی نئی یا پرانی جان پہچان نہیں ہے۔ پھر یہ تحفہ کس حوالے سے دے رہے ہیں؟''

وہ وقاص سے بولا۔''تم سے اور تمہارے باپ سے میرا بہت پرانا رشتہ ہے۔ ابھی کہہ چکا ہوں، ہم دونوں ہی جوتے بناتے ہیں اور دوسروں کو جوتے پہناتے ہیں۔ یہ ہمارا پیشہ ہے، کیا پیشے کے حوالے سے ہمارا ایک رشتہ نہیں ہے؟''

''میں نہیں جانتا آپ موچی ہیں۔ موچی آپ کی طرح دولت مند نہیں ہوتے۔ آپ ہمیں بتائیں کہ اتنا مہنگا تحفہ کیوں دے رہے ہیں؟ جب تک نہیں بتائیں گے، ہم اسے قبول نہیں کریں گے۔''

''میرا کوئی نہیں ہے۔ میں دل کی گہرائیوں سے، بڑے جذبے سے یہ دلہن بیٹی کو دے رہا ہوں۔ ایسا کرو، آج اسے گھر لے جاؤ۔ اگر تمہارے ماں باپ کہیں گے کہ یہ تحفہ قبول نہیں کرنا چاہیے تو کل اسے یہاں واپس لے آنا۔ میں جارہا ہوں، میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔''

وہ جانے لگا، آرزو نے کہا۔''رک جائیں، ہمارے ساتھ چائے پی کر جائیں۔''

''ابھی نہیں۔ کل یہ تحفہ قبول کرلوگی تو ضرور چائے پیوں گا، اللہ حافظ۔''

وہ پلٹ کر وہاں سے چلا گیا۔ آرزو ان سینڈلوں کو پہن کر خوش ہورہی تھی۔ جب اس نے گھر آ کر ساس سسر کو وہ سینڈلیں دکھائیں تو عینی نے کہا۔''میرے پاس بھی ایسی ہی ہیں۔''

عینی نے اپنے کمرے سے ویسی ہی ہیرے جڑی ہوئی سونے کی سینڈلیں لا کر دکھائیں۔ بہو، بیٹی اور بیٹے سب ہی حیران تھے کہ وہ بزرگ کون ہیں؟ اور کیوں اتنی فراخ دلی سے تحفے دیتے ہیں؟

بتول بی نے کہا۔''میں نے بچپن سے ان کے گھر میں پرورش پائی ہے۔ اب وہ بزرگ تنہا رہ گئے ہیں۔ کبھی کبھی ہم لوگوں کو تحفے دے کر خوش ہوجاتے ہیں۔ چونکہ وہ بہت ہی نچلے

طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لیے انہیں کوٹھی میں بلایا نہیں جاتا ہے اور نہ ہی ہم ان کے گھر جانا مناسب سمجھتے ہیں۔''

وکی نے کہا۔''دادی جان! یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ انہوں نے بچپن سے آپ کی پرورش کی۔ اگر آپ وہاں سے بیاہ کر نہ آتیں تو نہ ڈیڈی پیدا ہوتے اور نہ ہی ہم دنیا میں آتے۔ وہ آپ پر، ڈیڈی پر اور ہم پر مسلسل احسانات کرتے آ رہے ہیں اور ہم ان کی قدر صرف اس لیے نہیں کر رہے ہیں کہ وہ بہت ہی نچلے طبقے میں رہتے ہیں۔ یہ تو سراسر ہماری خودغرضی ہے۔ میں تو ان سے ضرور ملوں گا اور انہیں یہاں لے کر آؤں گا۔''

فضل الرحمٰن نے ڈانٹ کر کہا۔''زیادہ نہ بولو۔ ہم بہت کچھ سوچتے سمجھتے ہیں۔ تب چھوٹے لوگوں سے فاصلہ رکھتے ہیں۔ تم ابھی نادان ہو۔ رفتہ رفتہ سمجھو گے کہ ایسے لوگوں سے دور رہ کر ہی اپنی برتری قائم رکھی جاتی ہے۔''

اس نے باپ سے بحث نہیں کی لیکن تنہائی میں بتول کے پیچھے پڑ گیا۔''دادی جان! آپ احسان فراموش کیوں ہیں؟''

وہ بولیں۔''تمہیں شرم نہیں آتی، اپنی دادی کو احسان فراموش کہہ رہے ہو؟''

''آپ ان بزرگ کا احسان بھلا رہی ہیں۔ آپ کو اور کیا کہا جائے؟''

''بیٹے! تمہارے باپ نے برسوں کی محنت سے عزت کمائی ہے۔ اعلیٰ مقام حاصل کیا ہے۔ تمہارا فرض ہے، اس اونچے مقام پر قائم رہو۔ بلندی پر رہنے والے نیچے نہ دیکھتے ہیں نہ جھکتے ہیں، ہمیں بھی یہی کرنا چاہیے۔''

''آپ مجھے بھی احسان فراموشی سکھا رہی ہیں۔ کیا احسان کے بدلے ہمیں ان کے لیے کچھ نہیں کرنا چاہیے؟''

''تم ان کی باتیں نہ کرو۔ میں کسی نہ کسی طرح ان کا احسان اتار دیتی ہوں۔''

''آپ کس طرح احسان اتارتی ہیں؟ ہفتہ میں ایک بار اپنی سہیلی سے ملنے جاتی ہیں۔ کیا میں آپ کے ساتھ جا کر ان بزرگ سے نہیں مل سکتا؟''

''تم تو ان کے پیچھے پڑ گئے ہو۔ کیوں خواہ مخواہ ان سے ملنے جاؤ گے؟''

''پتا نہیں کیوں، میرا دل چاہتا ہے کہ ایک بار انہیں دیکھوں، ان سے باتیں کروں۔''

بتول بڑے پیار سے پوتے کو دیکھنے لگیں۔ وہ بے اختیار اپنے دادا کی طرف کھنچا جا رہا تھا۔ ان کی پوتی عینی بھی کچھ ایسی ہی جذباتی تھی۔ وہ ماں باپ سے کچھ کہتی نہیں تھی۔ دادی جان سے لڑتی تھی۔ اس نے بھی یہی ضد کی کہ اگلے ہفتے وہ بھی دادی کے ساتھ ان کی سہیلی

کے گھر جائے گی اوران بزرگ سے ضرور ملے گی۔

وہ ہیروں سے جڑی ہوئی سونے کی سینڈلیں پہن کر کالج گئی۔ پھرایک گیٹ ٹو گیدر پارٹی میں بھی سب نے حیرانی سے للچا کراس کی سینڈلوں کو دیکھا تھا۔اسے تعریفی نظروں سے دیکھ کر پوچھتے رہے تھے کہ وہ کہاں سے خرید کر لائی ہے؟ سب ان کی قیمت کا اندازہ لگاتے رہے تھے اور وہ فخر محسوس کرتی رہی تھی۔ایک اجنبی بوڑھے نے ایسی غیر معمولی چیز دی تھی، جو اس کی سہیلیوں اور دوسری رئیس زادیوں کے پاس نہیں تھی اور سوسائٹی میں اسے ہر جگہ نمایاں کررہی تھی۔

اسے سب سے زیادہ خوشی اس وقت ہوئی، جب زائر اس کی طرف مائل ہوا۔ پچھلے دو دنوں سے وہ ثمینہ کے ساتھ لائبریری اور کینٹین میں بیٹھنے لگا تھا۔معلوم ہوتا تھا، ثمینہ کچھ زیادہ ہی اس کی ضرورتیں پوری کرنے لگی تھی۔ وہ بہت چالاک تھی۔ زائر کو عینی سے چھین لینے کے لیے اسے شاپنگ کراتی تھی، جیب خرچ کے لیے دو چار ہزار روپے دیتی رہتی تھی۔ وہ ضرورت مند تھا۔ کرائے کے ایک فلیٹ میں تنہا رہتا تھا کہتا تھا، کینیڈا میں اس کے باپ کا بہت بڑا بزنس ہے۔ وہ بہت ہی جھوٹا تھا۔ مگر عینی اور ثمینہ کو اچھا لگتا تھا۔ دونوں ہی اسے حاصل کرنے کے لیے اپنی اپنی طرف کھینچتی رہتی تھیں۔

زائر ایک روز کالج نہیں آیا۔ دوسرے دن آیا تو بہت پریشان تھا۔ عینی نے پوچھا۔

''اتنے پریشان کیوں ہو، کل کیوں نہیں آئے؟ میرا پڑھائی میں دل نہیں لگ رہا تھا۔''

وہ بولا۔''ڈیڈ نے اب تک کینیڈا سے رقم نہیں بھیجی ہے۔ مجھے فلیٹ کا کرایہ دینا ہے اور کچھ اہم ضرورتیں پوری کرنی ہے۔سوچتا ہوں۔ پاکستان چھوڑ کر ڈیڈ کے پاس چلا جاؤں۔''

عینی نے کہا۔''تم مجھے چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤ گے۔ بولو کتنی رقم کی ضرورت ہے؟''

''ثمینہ مجھے پندرہ ہزار دے رہی تھی۔ میں نے کہا، مجھے پچیس ہزار کی ضرورت ہے۔ وہ مجبور ہوگئی۔اس کے اکاؤنٹ میں زیادہ رقم نہیں تھی۔''

عینی نے حقارت سے کہا۔''وہ تو ہمیشہ کنگال رہتی ہے۔ نمائش ایسے کرتی ہے جیسے کروڑ پتی، ارب پتی باپ کی بیٹی ہو۔تم فکر نہ کرو، میں پچیس ہزار کا چیک دے رہی ہوں۔ اسے کل بنک ٹائم میں کیش کرا سکتے ہو۔''

ثمینہ بھی رئیس زادی تھی۔ اس کے لیے بھی پچیس ہزار کی رقم معمولی تھی۔ زائر جھوٹ بول کر دونوں سے اچھی خاصی رقمیں رصول کرتا رہتا تھا اور وہ رئیس زادیاں اپنی امارت اور شان وشوکت دکھانے کے لیے مہنگی سے مہنگی چیزیں خریدنے کی عادی تھیں۔ وہ زائر کی محبت

کو بھی مہنگے داموں خرید لینا چاہتی تھیں۔ محبت کو جب تک روٹی کپڑا نہ ملے، وہ وفادار بن کر نہیں رہتی۔ دنیا کی ہر چیز دولت سے حاصل کی جاتی ہے۔ محبوب یا شوہر کو بھی دولت سے خریدا جائے تو وہ بڑی تابعداری سے جی بیگم صاحبہ کہہ کر زندگی گزارتا رہتا ہے۔

ثمینہ کا باپ فشریز میں تھا۔ مچھلیاں اور جھینگے ایکسپورٹ کرتا تھا۔ لاکھوں کروڑوں کماتا تھا۔ ثمینہ نے زائر سے کہا تھا۔ ''میرے پاپا کے پاس جاب کرو۔ تمہاری مالی مشکلات دور ہو جائیں گی۔ تم پاپا کو متاثر کرتے رہو گے۔ تو میں کسی دن ان کے سامنے تم سے شادی کی بات کروں گی، وہ مان جائیں گے۔''

وہ جاب کرنے اور ثمینہ سے شادی کرنے کے لالچ میں اس کے ساتھ زیادہ رہنے لگا تھا۔ عینی کو دور سے دیکھ کر کترا جاتا تھا۔ اس روز وہ خود ہی اس کے قریب آ کر اس کی سینڈلوں کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''پورے کالج میں تمہاری ان سینڈلوں کا چرچا ہو رہا ہے۔ واقعی یہ بہت خوبصورت ہیں۔''

وہ فخر سے بولی۔ ''ثمینہ کو بھی اتنی مہنگی سینڈلیں نصیب نہیں ہوں گی۔ وہ تمہیں کیا دیتی ہے؟ کیوں اس کے پیچھے پھرتے رہتے ہو؟''

''اس کے فادر مجھے بہت بڑی جاب دینے والے ہیں۔''

''میں اس سے بڑی جاب دلاؤں گی۔ وہ تمہیں دس ہزار ماہانہ دلائے گی تو میں تمہیں پندرہ ہزار دلاؤں گی۔ وہ مجھ سے مقابلہ نہیں کر سکے گی۔''

''وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے۔''

''شادی ابھی دور کی بات ہے۔ تعلیم مکمل کرنے میں کم از کم چھ برس لگیں گے۔ تب تک وہ چڑیا کسی دوسرے چڑی مار کے پاس چلی جائے گی۔ تم منہ دیکھتے رہ جاؤ گے۔''

''تم درست کہتی ہو۔ وہ بڑی دل پھینک ہے کہیں بھی دل پھینکتی رہے گی۔ تم میرے لیے کیا کر سکتی ہو؟''

''تم جاب کرو گے تو تعلیم حاصل نہیں کر سکو گے اور پارٹ ٹائم جاب میں تمہیں کوئی پندرہ ہزار روپے ماہانہ نہیں دے گا۔ ہم اونچے خاندان کے لوگ ہیں، میری شادی کسی اونچے گھرانے میں ہو گی۔ اگر تم ثمینہ کے سامنے مجھ سے فلرٹ کرتے رہو گے تو میں کبھی کبھی تمہیں جیب خرچ دیتی رہوں گی۔ اس سے زیادہ تمہاری ویلیو نہیں ہے۔ میں تمہیں اچھی طرح سمجھ گئی ہوں۔''

''تم میری انسلٹ کر رہی ہو۔ میں جیب خرچ کا محتاج نہیں ہوں۔''

''ابھی محتاج نہیں ہو، وہ پورا کر رہی ہے۔ میں دیکھوں گی کہ وہ کب تک تمہاری پرورش کرتی رہے گی۔ کبھی اُدھر سے اِدھر آنا چاہو گے تو تمہیں ٹھینگا ملے گا۔''

وہ ثمینہ کے پاس آیا، وہ غصے سے بولی۔ ''تم بہت چھچھورے ہو۔ کیا سونے کی سینڈلیں کبھی نہیں دیکھیں۔ اس کے قدموں میں گرنے لگے تھے۔''

''مجھے غلط نہ سمجھو۔ میں یہ سننے گیا تھا کہ وہ تمہارے خلاف کیا بکواس کر رہی ہے؟ وہ تو بہت اِترا رہی ہے کہہ رہی تھی تم ساری زندگی اتنی مہنگی سینڈلیں نہیں خرید سکو گی۔ مجھے غصہ آرہا ہے۔ میرے پاس رقم ہوتی تو ابھی تمہارے لیے خرید لاتا۔''

''زیادہ باتیں نہ بناؤ۔ اپنے لیے ایک ٹی شرٹ نہیں خرید سکتے، میرے لیے پہاڑ خرید و گے۔ میں تمہیں اچھی طرح سمجھ گئی ہوں۔ یہ معلوم کرنے گئے تھے کہ مہنگی سینڈلیں پہننے والی تمہارا جیب خرچ بڑھائے گی یا نہیں؟''

''پلیز ثمینہ! یہ بات نہیں ہے۔ میں نے تو اس سے صاف کہہ دیا ہے، کبھی اس کی طرف دیکھوں گا بھی نہیں۔''

''تمہاری بڑی مہربانی ہوگی۔ تم میری طرف کبھی نہ دیکھا کرو۔''

وہ اس سے منہ پھیر کر چلی گئی۔ وہ دوڑتا ہوا عینی کی طرف گیا تو وہ جا چکی تھی۔ اس نے فون کے ذریعے کہا۔ ''عینی! تم کہاں ہو، میں تمہارے لیے ثمینہ کو چھوڑ کر آیا ہوں۔''

عینی نے جواب نہیں دیا' فون بند کر دیا۔ یہ یقینی خیال پیدا ہوا کہ سونے کی سینڈلیں لکی ہیں۔ زائر رسی توڑ کر ثمینہ کو چھوڑ کر اس کے قدموں میں آنا چاہتا تھا۔ وہ ثمینہ کو شکست دے رہی تھی۔ اس دن اس کے ایک پرائز بانڈ پر دس لاکھ روپے کا انعام نکلا تھا۔ وہ بتول کے پاس آ کر بولی۔ ''دادی جان! اب تو خواہ کچھ ہو جائے، میں ان بزرگ سے ضرور ملوں گی۔ وہ میرے لیے بہت لکی ہیں۔''

بتول بی کی الجھنیں بڑھ گئیں۔ پوتا تو ضد کر ہی رہا تھا، پوتی بھی کرنے لگی۔ الجھنوں اور پریشانیوں کے باوجود دل میں یہ مسرتیں بھر گئی تھیں کہ ان دونوں بچوں کو خون کی کشش اپنے دادا کی طرف کھینچ رہی ہے جبکہ وہ دادا کو ایک اجنبی بوڑھا سمجھ رہے تھے۔ انہوں نے اپنے بیٹے فضل الرحمٰن سے کہا۔ ''میں اگلے ہفتے تمہارے باپ سے ملنے کیسے جاؤں؟ وکی اور عینی بھی میرے ساتھ وہاں جانے کی ضد کر رہے ہیں۔ نہ میں نہیں دادا کا رشتہ بتا سکتی ہوں اور نہ ہی انہیں دادا کے پاس لے جا سکتی ہوں۔''

فضل الرحمٰن نے کہا۔ ''میں انہیں ڈانٹ کر آپ کے ساتھ جانے سے منع کر دوں گا۔''

وہ بولیں۔ ''خبردار! میرے بچے ایک قدرتی کشش سے وہاں جانا چاہتے ہیں۔ انہیں ہرگز نہ ڈانٹنا۔ کسی بھی طرح انہیں پیار سے سمجھاؤ کہ دل سے ان بزرگ کی عزت کرو لیکن کبھی ان سے ملنے نہ جاؤ، ایک فاصلہ رکھو۔''

شگفتہ نے کہا۔ ''یہ بچے اپنے باپ پر گئے ہیں۔ بہت ضدی ہیں۔ یہ آپ کے ساتھ وہاں ضرور جانا چاہیں گے۔ آپ کو تنہائی میں پریشان کرتے رہیں گے۔ وہ آپ کا تعاقب کرتے ہوئے وہاں پہنچ سکتے ہیں۔''

فضل الرحمٰن نے کہا۔ ''ایسی کوئی بات نہیں ہوگی۔ وہ جاسوس کے خاندان سے نہیں ہیں کہ اماں کا تعاقب کریں گے۔ میں انہیں سمجھا دوں گا۔''

اس نے اسی شام وکی اور عینی کو بلا کر سمجھایا ''زندگی گزارنے کے چند اہم اصول ہوتے ہیں۔ ان پر سختی سے عمل کر کے ہی ہم عزت اور شان و شوکت سے زندگی گزار سکتے ہیں۔ چھوٹے لوگ دولت مند بن کر کار اور کوٹھی خرید لیتے ہیں لیکن عزت نہیں کما سکتے۔ کیونکہ یہ بازار سے خریدی نہیں جا سکتی۔ صرف اعلیٰ خاندانی شجرہ ہی ہمیں نیک نام بناتا ہے۔ چند اصولوں میں سے یہ ایک اصول یاد رکھو کہ چھوٹے لوگوں سے کبھی نہ ملو۔ وہ ملنا بھی چاہیں تو ان کے سلام کا جواب دور ہی سے دے دیا کرو۔''

عینی نے کہا۔ ''ڈیڈی! ان بزرگ سے ایک بار ملنے میں کیا حرج ہے؟ ہماری دادی جان پر ان کے احسانات ہیں۔''

''ان کے احسانات کے باعث تمہاری دادی جان چوری چھپے جا کر ان سے ملتی رہتی ہیں۔ میل ملاپ کا یہ سلسلہ صرف تمہاری دادی جان تک رہنا چاہیے۔ میری یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی ہے تو پھر اس بات کو میرا حکم سمجھو۔ تم میں سے کوئی ان بزرگ سے کبھی نہیں ملے گا۔ اگر کبھی چھپ کر ملنا چاہو گے تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔''

باپ نے پہلی بار سختی سے حکم دیا تھا اس لیے انہوں نے بزرگوں سے بحث نہیں کی لیکن تنہائی میں ان دونوں کے اندر یہ بات پکنے لگی کہ ایک غریب آدمی سے دوری کیوں رکھی جا رہی ہے۔ عینی نے کہا۔ ''وکی! پتا نہیں ہم کتنے ہی غریبوں سے کبھی کبھی ملتے رہتے ہیں۔ ہم کتنے ہی امیر ہو جائیں، غریبوں سے کوئی نہ کوئی کام تو پڑتا ہی رہتا ہے۔''

وکی نے کہا۔ ''بے شک۔ ہمارے گھر میں کام کرنے والے ملازم بھی چھوٹے لوگ ہیں۔ ہماری گاڑیوں کی مرمت کرنے والا مکینک صاف کہتا ہے کہ اس کا کوئی خاندانی شجرہ نہیں ہے۔ انسان اپنے خاندان کے نام سے نہیں، اپنے کام سے پہچانا جاتا ہے۔ وہ ہمارے

گھر آتا ہے تو ڈیڈی اس سے ملتے ہیں۔ کیا ہم تھوڑی دیر کے لیے اپنے محسن بزرگ سے نہیں مل سکتے ؟''

عینی نے کہا۔''ضرور مل سکتے ہیں۔اس بار تو دادی جان جا چکی ہیں۔اگلے ہفتے جیسے ہی گھر سے نکلیں گی۔تم ان کا پیچھا کرو۔ جہاں وہ بزرگ رہتے ہیں، وہ جگہ دیکھ لو۔ پھر ہم چپ چاپ ان سے ملنے جائیں گے۔''

بتول بی نے ہفتے کی رات علم دین کے پاس آ کر کہا۔''یہ تم اچھا نہیں کر رہے ہو۔ پہلے بیٹے کی دلہن کو سونے سینڈلیں دیں۔ پھر پوتے کی دلہن کو بھی وہی تحفہ دیا لیکن پوتی کو یہی تحفہ نہیں دینا چاہیے تھا۔''

''میری پوتی تو میری جان ہے۔تم سینڈلوں کی بات کرتی ہو۔ میں تو اسے اپنی جان دے سکتا ہوں۔''

''تمہاری وہ جان میری جان کے پیچھے پڑ گئی ہے۔وہ اور وکی دونوں ہی تم سے ملنے کی ضد کر رہے ہیں۔''

علم دین نے حیرانی سے پوچھا۔''کیا انہیں معلوم ہو چکا ہے کہ میں ان کا دادا ہوں؟''

''انہیں معلوم نہیں ہے۔مگر کیا اللہ کی شان ہے۔خون کی کشش انہیں تمہاری طرف کھینچ رہی ہے۔''

وہ خوش ہو کر بتول کا ہاتھ تھام کر بولا۔''یہ سن کر خوشی سے رونے کو جی کر رہا ہے۔ میرے بیٹے نے ساتھ چھوڑ دیا مگر اس کے بچے اپنی بنیاد کی طرف آنا چاہتے ہیں۔''

''تمہیں زیادہ خوش نہیں ہونا چاہیے۔ ہمارے بیٹے نے دونوں بچوں کو سختی سے حکم دیا ہے کہ وہ کبھی ادھر نہیں آئیں گے۔''

''یہ فضل نے ٹھیک نہیں کیا۔بچوں کا دل ٹوٹ گیا ہوگا۔''

''بیٹا ڈرتا ہے، بچوں کے یہاں آنے جانے سے کبھی بات کھل سکتی ہے۔''

''جب تک میں زندہ ہوں، وہ ڈرتا رہے گا، میری موت کے بعد ڈر ختم ہو جائے گا۔''

''ہزار بار کہا ہے، مرنے کی بات نہ کیا کرو۔ پہلے میں مروں گی۔تم میرے بعد بھی زندہ رہو گے۔''

دروازے پر دستک سنائی دی۔علم دین نے پوچھا۔''کون ہے؟''

باہر سے آواز آئی۔''میں ایک گاہک ہوں۔''

وہ بولا۔''میں اتوار کے دن کام نہیں کرتا، کہیں اور چلے جاؤ۔''

''کام نہ کرو، بات تو کرلو۔ تمہارے دروازے پر کوئی آیا ہے، دروازہ تو کھولو۔''

وہ بتول سے بولتا ہوا اپنی جگہ سے اٹھا۔ ''میں آج کے دن تجھ سے ہی بولتا ہوں۔ کسی سے ملنا نہیں چاہتا۔ مگر کوئی نہ کوئی آ ہی جاتا ہے۔ کون ہو بھائی! ایک دن تو آرام کرنے دیا کرو۔''

اس نے دروازہ کھولا۔ باہر زائر کھڑا ہوا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ''کیا یہاں موچی گلی میں تم ہی دکان لگاتے ہو؟''

''ہاں، کیا بات ہے؟ اگر کوئی بات ہے تو کل وہیں موچی گلی کی نکڑ پر آ جاؤ۔ میں ابھی آرام کر رہا ہوں۔''

وہ دروازہ بند کرنا چاہتا تھا، زائر نے کہا۔ ''بڑے میاں! دروازہ بند نہ کرو۔ میں بڑی مشکلوں سے بھٹکتا ہوا تمہارے پاس آیا ہوں۔ وہ سونے کی سینڈلیں تم نے ہی بنائی تھیں نا؟''

بتول بی ان سینڈلوں کا ذکر سنتے ہی اپنی جگہ سے اٹھ کر دروازے پر آئیں، زائر سے بولیں۔ ''تم نے وہ سینڈلیں کہاں دیکھی ہیں؟''

''میرے کالج میں ایک دولت مند لڑکی پہن کر آئی تھی۔ میری ایک کزن ان سے بھی زیادہ قیمتی سینڈلیں بنوانا چاہتی ہے۔ میری کزن اس لڑکی کو دکھانا چاہتی ہے کہ وہ اس سے بھی زیادہ دولت مند ہے۔''

بتول نے زائر کو غصے سے دیکھا۔ وہ میاں بیوی سمجھ گئے تھے کہ کوئی دولت مند لڑکی ان کی پوتی کو نیچا دکھانا چاہتی ہے۔ علم دین نے پوچھا۔ ''جو لڑکی سونے کی سینڈلیں پہن کر کالج آئی تھی اس کا نام کیا ہے؟''

''اس کا نام نور عین ہے۔ سب اسے عینی کہتے ہیں۔''

''تمہاری کزن عینی کا مقابلہ نہیں کر سکے گی۔ میں کسی اور کو ایسی سینڈلیں بنا کر نہیں دوں گا۔''

''انکار نہ کرو۔ میری کزن تمہیں منہ مانگا معاوضہ دے گی۔''

''میں زیادہ باتیں نہیں کرتا۔ ایک بار انکار کیا ہے، ہزار بار انکار سمجھو۔ جاؤ یہاں سے۔''

اس نے دروازے کو بند کر دیا۔ زائر نے کہا۔ ''عجیب بوڑھا ہے۔ سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتا۔ اے بھائی! دروازہ تو کھولو۔ تمہیں ایک جوڑی سینڈلوں کے ہزاروں روپے ملیں گے۔ ان میں لگنے والا سونا اور قیمتی ہیرے میری کزن خود خرید کر دے گی۔ تمہیں منہ مانگا

معاوضہ میں دلاؤں گا۔''

اسے جواب نہیں ملا۔ اس نے دروازے کو پیٹ کر آوازیں دیں۔ علم دین نے دروازہ کھول کر ایک موٹا سا ڈنڈا دکھاتے ہوئے پوچھا۔''یہاں سے چپ چاپ گھر واپس جاؤ گے، یا اسپتال؟''

وہ علم دین کے تیور دیکھ کر پیچھے ہٹ گیا پھر وہاں سے واپس جاتے ہوئے بڑبڑانے لگا۔''بڈھا خر دماغ ہے۔ معاوضے کے طور پر ملنے والے ہزاروں روپے ٹھکرا رہا ہے۔ مان جاتا تو میں اس میں سے اپنا کمیشن نکال لیتا۔''

ثمینہ نے پھر اس سے دوستی کی تھی۔ اس سے کہا تھا، اگر وہ عینی کی سینڈلیں تیار کرنے والے موچی کا سراغ لگائے گا تو وہ عینی سے بھی زیادہ قیمتی سینڈلیں بنوا کر اسے منہ توڑ جواب دے گی۔ زائر بڑی بھاگ دوڑ کے بعد علم دین کے دروازے تک پہنچا تھا مگر ناکام واپس آیا تھا۔

مین روڈ کے کنارے ثمینہ اپنی کار میں بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اسے دیکھ کر بولی۔ ''موچی کو ساتھ نہیں لائے، کیا وہ گھر پر نہیں ہے؟''

وہ کار میں اس کے برابر والی سیٹ پر آ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔''وہ گھر میں ہے مگر بہت ہی خر دماغ ہے۔ اس نے تمہارے لیے سینڈلیں بنا کر دینے سے انکار کر دیا ہے۔''

''کیا تم نے اس سے نہیں کہا کہ منہ مانگا معاوضہ دو گے؟''

''میں نے کہا تھا۔ وہ بے وقوف ہے، عینی نے اسے منع کیا ہو گا۔''

''وہ کیسے منع کرے گی۔ وہ نہیں جانتی ہے کہ میں اسی موچی سے سینڈلیں بنوانا چاہتی ہوں۔''

''وہ صاف لفظوں میں کہہ رہا تھا کہ تم عینی کا مقابلہ نہیں کر سکو گی۔ وہ کسی کو ایسی سینڈلیں بنا کر نہیں دے گا۔''

''اس نے کہا اور تم واپس آ گئے۔ ایک موچی کو میرے کام کے لیے راضی نہ کر سکے۔ تم سے ایک معمولی کام نہیں ہوتا۔ تم دنیا میں زندہ رہ کر کرو گے کیا؟ میرا کیا بھلا کرو گے؟ گاڑی سے اترو۔''

''یہ...... یہ کیا کہہ رہی ہو۔ مجھے ایک اور موقع دو۔ میں اس کم بخت کو راضی کر لوں گا۔''

''یہاں باتیں بناؤ گے تو وہ راضی نہیں ہو گا۔ جاؤ، اس کے قدموں میں جا کر گر پڑو۔ پھر بھی راضی نہ کر سکے تو اپنی زندگی پر لعنت بھیج کر خودکشی کر لینا۔''

''پلیز ثمینہ! غصہ نہ کرو۔ ایسی سینڈلیں تیار کرنے والے کئی موچی مل جائیں گے۔ میں دوسرے سے بات کروں گا۔''

''جب بات کرلو تو کسی ایسے شوز میکر کو لے آنا۔ ناؤ گیٹ آؤٹ......''

وہ دروازہ کھول کر باہر آیا۔ پھر اسے بند کرتے ہوئے بولا۔ ''ٹیکسی کا کرایہ تو دے دو۔''

وہ کار اسٹارٹ کر کے تیزی سے ڈرائیو کرتی ہوئی چلی گئی۔ وہ جھنجلا کر دور جاتی ہوئی کار کو گھونسا دکھانے لگا۔ اسے گالیاں دینے لگا۔ ان لمحات میں اس کی کھوپڑی پھر عینی کی طرف گھوم رہی تھی۔ اتنی بڑی دنیا میں اس کے دو ہی سہارے تھے۔ ایک بیساکھی ہاتھ سے چھوٹ جاتی تو دوسری بیساکھی کو لپک کر تھام لیتا تھا۔

☆======☆======☆

عینی اور وکی دوسرے ہفتے کے انتظار میں تھے۔ اس ہفتے کی صبح وکی کی محبوبہ نے فون کیا۔ ''ہائے وکی! تم کہاں ہو؟ کیا ابھی آسکتے ہو؟''

''آسکتا ہوں۔ بائی داوے خیریت تو ہے؟''

''تم نہ آئے تو خیریت نہیں رہے گی۔ لہٰذا ایک گھنٹے بعد ٹھیک نو بجے کالج کے گیٹ پر آ جاؤ۔''

''جانِ من! کوئی سیریس معاملہ تو نہیں ہے؟''

''تم نہ آئے تو سیریس ہو جائے گا۔ اتنی باتیں کرنے سے بہتر ہے۔ میرے پاس آنے کے لیے ڈریس اَپ ہو جاؤ۔ میں تو ہو چکی ہوں۔ پندرہ منٹ میں گھر سے نکلوں گی۔ تم یاد رکھو، ٹھیک نو بجے کالج کے گیٹ پر......اوکے، سی یو......''

اس نے فون بند کر دیا۔ وکی مسکراتے ہوئے تصورِ جاناں میں کھو گیا۔ اس کا نام مومی تھا۔ وہ سیدھی سادی سی، پیاری پیاری سی دلنشیں لڑکی تھی۔ وکی اس لیے اس سے متاثر ہوا تھا کہ اس کے پاس چیختا ہوا حسن نہیں تھا۔ وہ دھیمی دھیمی سی لَو دیتی تھی اور بڑی خاموشی سے دل میں اُتر جاتی تھی۔

وہ پہلی ملاقات میں اس سے متاثر ہوا تھا۔ دوسری تیسری ملاقاتوں میں اسے دل سے چاہنے لگا۔ اس لڑکی کی صاف گوئی اچھی لگتی تھی۔ وکی نے ایک روز کہا۔ ''مومی آئی لو یو۔''

وہ بولی۔ ''میں فی الحال محبت تو نہیں کر سکتی مگر ہاں، تمہیں پسند کرتی ہوں۔''

''یہ بھی غنیمت ہے کہ مجھے پسند کرتی ہو، محبت کب کرو گی؟''

''جب تم زبانی محبت نہیں کرو گے۔ اپنے عمل سے میرے حال اور مستقبل کو

اور آسودہ بناؤ گے۔ جو لڑکیاں اپنے بہترین مستقبل کے لیے ایک اچھے کمانے کھانے والے جیون ساتھی کی تمنا کرتی ہیں۔ انہیں خودغرض اور لالچی سمجھا جاتا ہے۔ تم بھی مجھے لالچی سمجھ سکتے ہو۔''

''میں ایسا نہیں سمجھوں گا۔ ہمارے معاشرے میں عورت کی خوشحالی کا انحصار مرد کی کمائی پر ہوتا ہے۔ یہ لڑکی کا حق ہے کہ وہ کسی سے محبت کرنے اور شادی کرنے سے پہلے اپنے بہترین مستقبل کی ضمانت حاصل کرے۔''

اس کے ابو ایک سرکاری افسر تھے۔ پانچوں وقت کے نمازی تھے۔ خدا سے ڈرتے تھے اس لیے اندھا دھند اوپری آمدنی نہیں تھی۔ تنخواہ پر گزارہ کرتے تھے۔ مومی کے پاس چار جوڑے تھے، جنہیں وہ باری باری پہن کر کالج آتی تھی۔ وکی نے کہا۔ ''مومی! میں تمہارے لیے کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ تم انکار تو نہیں کرو گی؟''

''کس رشتے سے کچھ کرنا چاہتے ہو؟ محبت کا حوالہ نہ دینا۔ میں کہہ چکی ہوں۔ محبت اسی سے کروں گی جو میرا مجازی خدا ہوگا۔''

''محبت نہ سہی، دوستی تو ہے۔ ایک دوست دوسرے دوست کے لیے بہت کچھ کرتا ہے۔ میں بھی کچھ کرنا چاہتا ہوں''

''دوستی کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ اس حد میں رہ کر کیا کرنا چاہتے ہو؟''

''پہلے تو میں تمہیں شاپنگ کرانا چاہتا ہوں پھر تمہارے بینک اکاؤنٹ میں ایک آدھ لاکھ جمع کرنا چاہتا ہوں تاکہ تم اپنی پسند سے بھی شاپنگ کرو اور دل کھول کر اپنی تمام خواہشیں پوری کرتی رہو۔''

''میں تمہارے جذبے کی قدر کرتی ہوں۔ تم میرے لیے جو کرنا چاہو گے، میں انکار نہیں کروں گی لیکن پہلے میرے ابو سے ملو۔ میرے لیے جو کرنا چاہتے ہو، اس کے لیے ان سے اجازت حاصل کرلو۔''

''یہ کیا کہہ رہی ہو۔ کوئی باپ اپنی جوان بیٹی کے لیے ایسی اجازت نہیں دے گا۔''

''ایسے غیرت مند باپ پہلے شادی کا مشورہ دیتے ہیں۔ شادی کے بعد اجازت لینے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔ میری پسند اور ناپسند کے تمام حقوق تمہیں مل جائیں گے۔''

''تم بہت اچھی ہو۔ آج کے دور میں تمہاری جیسی لڑکیاں مشکل سے نظر آتی ہیں۔''

''آج کے دور میں میری جیسی بے شمار لڑکیاں ہیں، جو پہلی نظر میں محبت ہونے والی بات کی قائل نہیں ہوتیں۔ یہ سیدھی سی بات جانتی ہیں کہ محبت کرنے والا پہلے عملی طور پر بہتر

زندگی گزارنے کی ضمانت دیتا رہے۔ اپنے محبوب کو ہر طرح سے تحفظ فراہم کرتا رہے۔ تب ہی دونوں کے درمیان سچی اور دیرپا محبت قائم رہتی ہے۔''

دو محبت کرنے والوں کے ذہنوں کے کسی گوشے میں جو بات چھپی رہتی ہے، وہ ہے ایک دوسرے کو جسمانی طور پر حاصل کیا جائے۔ اس حصول کے لیے چند اہم اصول ہیں۔ مومی جیسی لڑکیاں ان اصولوں پر عمل کرتی ہیں جو عمل نہیں کرتیں، وہ دھوکا کھاتی ہیں اور ساری عمر پچھتاتی رہتی ہیں۔

وکی اپنی کار میں کالج کے گیٹ پر آیا تو مومی اس کی منتظر تھی۔ وہ اگلی سیٹ کا دروازہ کھول کر اس کے پاس بیٹھ گئی۔ وہ گاڑی کو آگے بڑھاتا ہوا بولا۔ ''تم کالج میں کبھی غیر حاضر نہیں رہتیں۔ آج کلاس اٹینڈ نہیں کر رہی ہو۔ معلوم ہوتا ہے، کوئی اہم بات ہے۔''

''امی اور ابو میری شادی کرنا چاہتے ہیں۔ تین گھروں سے رشتے آ چکے ہیں۔ دو گھر والے جہیز مانگ رہے ہیں۔ تیسری جگہ جہیز کا مطالبہ نہیں ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ ابو ساری عمر دیانت داری سے ملازمت کرتے آئے ہیں۔''

وکی کا دل ڈوب رہا تھا جیسے وہ ہاتھ سے چھوٹنے والی ہو۔ اس نے کہا۔ ''والدین نے تمہاری مرضی پوچھی ہوگی؟''

وہ ذرا دیر چپ رہی پھر بولی۔ ''ہاں۔ میں نے کہا ہے کہ میں تمہیں پسند کرتی ہوں اور ایک بہتر مستقبل کی طرف دیکھ رہی ہوں۔''

''تمہاری امی نے کیا کہا؟''

''انہوں نے ابو کو یہ بات بتائی۔ وہ کہتے ہیں، تمہارے بزرگ رشتہ مانگنے آئیں گے تب ہی بات آگے بڑھے گی۔''

وکی خاموشی سے ڈرائیور کرتا رہا اور سوچتا رہا، پھر اس نے کہا۔ ''میں پہلے ہی تم سے کہہ چکا ہوں۔ گریجویشن کے بعد ہی ممی اور ڈیڈی میری شادی کی بات سوچیں گے۔''

''یعنی پانچ یا چھ برس تک تعلیمی سلسلہ جاری رہے گا۔ کسی بھی بیٹی کے ماں باپ اتنی عمر تک تب ہی انتظار کر سکتے ہیں، جب لڑکے والوں سے ضمانت مل جائے۔ یعنی رشتہ طے ہو جائے، منگنی ہو جائے۔''

وہ ذرا چپ رہا پھر بولا۔ ''عینی مجھ سے بڑی ہے۔ پہلے اس کی شادی کی بات چلے گی، پھر میری باری آئے گی۔''

''بہن سے پہلے تمہاری شادی نہیں ہونی چاہیے۔ یہ درست ہے لیکن بہن سے پہلے

منگنی ہوسکتی ہے۔''

وہ سوچنے لگا۔ ڈرائیو کرنے کے دوران میں سیٹ پر پہلو بدلنے لگا۔ ایک جگہ سگنل کے خلاف آگے نکل گیا۔ مومی نے اسے توجہ سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔''کیا بات ہے، تم کچھ پریشان لگ رہے ہو؟''

اس نے آگے جا کر گاڑی کو سڑک کے کنارے روک دیا، وہ بولی۔''تم کچھ کہنا چاہتے ہو لیکن کہہ نہیں پا رہے ہو؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا، وہ بولی۔''کیا تمہارے والدین منگنی کے لیے راضی نہیں ہوں گے؟''

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔''میں ایک اہم بات تم سے چھپاتا آ رہا ہوں۔ وہ بات ایسی ہے کہ تم سے شادی کرنے کے لیے مجھے والدین سے بغاوت کرنی ہوگی اور میں کروں گا لیکن اس کے لیے مناسب وقت یہ ہوگا کہ میں تعلیم کے دوران میں اپنے ڈیڈی کا کاروبار سنبھالنے لگوں۔''

وہ ایک ذرا توقف سے بولا۔'' کاروبار میں اور جائیداد میں اپنا حصہ حاصل کرنے کے بعد میں تمہارے لیے ساری دنیا سے لڑ جاؤں گا۔''

وہ بولی۔''میں کبھی نہیں چاہوں گی کہ اپنے والدین کی مخالفت مول لے کر مجھ سے شادی کرو۔ میں تمہارا گھر بسانا چاہوں گی۔ اجاڑنا نہیں......ایک نئی زندگی کی بنیاد رکھتے وقت اپنے ہر عمل کو مثبت بنانا چاہیے۔''

''آئی لو یو مومی! تمہارے خیالات سن کر دل خوش ہو جاتا ہے۔ تمہاری جیسی لڑکیاں ایک آئیڈیل شریکِ حیات بن کر رہتی ہیں لیکن میرے والدین کے خیالات ایسے ہیں کہ وہ تمہیں بہو بنانا منظور نہیں کریں گے۔''

''انہوں نے مجھے دیکھا نہیں ہے۔ مجھے پرکھا نہیں ہے۔ پھر تم کیسے کہہ رہے ہو کہ وہ مجھے ناپسند کریں گے؟''

وہ پریشان ہو کر بولا۔''میں کیا بتاؤں؟ وہ خاندانی برتری کے قائل ہیں۔ بھائی جان نے ایک ماڈل سے شادی کی۔ اس کا حسب نسب نہیں دیکھا، اس بات کے لیے ڈیڈی اور بھائی جان کے درمیان کئی مہینوں تک جنگ جاری رہی۔ بعد میں ڈیڈی کو جھکنا پڑا کیونکہ سارا کاروبار بھائی جان سنبھال رہے تھے۔ وہ اپنا ایک مضبوط بازو نہیں کاٹ سکتے تھے۔ انہیں مجبوراً ایک ادنیٰ خاندان سے تعلق رکھنے والی ماڈل کو بہو تسلیم کرنا پڑا۔''

وہ بولی۔ ''ہمارا خاندان ادنیٰ نہیں ہے۔ تم سیّد ہو تو ہم انصاری ہیں اور ہمیں اپنے انصاری ہونے پر فخر ہے۔''

''مگر ڈیڈی فخر نہیں کریں گے۔ انہوں نے بڑی بہو کے مقابلے میں شکست تسلیم کر لی مگر ممی سے اور دادی جان سے یہ کہہ دیا کہ میری اور عینی کی شادی کسی سیّد گھرانے میں ہو گی۔ کسی دوسرے خاندان سے نہ داماد آئے گا، نہ بہو آئے گی۔''

مومی نے کہا۔ ''اپنے اپنے خاندان پر فخر کرنا چاہیے لیکن بحیثیت انسان اپنے مقابلے میں دوسرے کو کمتر نہیں سمجھنا چاہیے۔ برتری اور کمتری خاندانی شجرہ سے نہیں اپنے اچھے اور برے اعمال سے ملتی ہے۔''

''ڈیڈی ایسی باتیں کبھی نہیں مانیں گے۔ پتا نہیں کیوں وہ جنون کی حد تک خود کو برتر اور دوسروں کو کمتر سمجھتے ہیں۔ اسی لیے میں نے سوچا ہے کہ پہلے بھائی جان کی طرح کاروباری معاملات کو سمجھتا ہوں اور کچھ معاملات کو اپنے ہاتھوں میں رکھتا ہوں۔ اس کے بعد ہی وہ مجبور ہو کر تمہیں اپنی بہو تسلیم کریں گے۔''

وہ سر جھکا کر سوچنے لگی۔ وہ بھی خاموشی سے ڈرائیو کرتا ہوا سمندر کے ساحل پر آ گیا۔ مومی نے کہا۔ ''بزرگوں کے اعتراضات جائز ہوں تو ہمیں ان کے سامنے سر جھکانا چاہئے اور اگر اعتراضات غلط ہوں تو پہلے انہیں سمجھانا چاہئے۔ وہ نہ سمجھنا چاہیں تو پھر ہمیں اپنے حقوق کے لیے لڑنا چاہیے۔ کیا تم میری خاطر اپنے گھر والوں سے ایک طویل جنگ لڑ سکتے ہو۔''

''تم میرا ساتھ دو گی۔ میرے کامیاب ہونے تک میرا انتظار کرو گی، تو میرا حوصلہ بڑھے گا۔ میری محبت کو تم آخری دم تک آزماتی رہنا۔ میری زندگی میں تمہارے سوا کوئی دوسری لڑکی نہیں آئے گی۔''

اس نے وکی کو دیکھا پھر کہا۔ ''پتا نہیں کیوں میں تم پر بھروسا کرتی ہوں؟ میرا دل کہتا ہے کہ مجھے تمہاری جدوجہد میں شریک رہنا چاہیے۔ بزرگوں سے اس طرح پیش آؤ کہ ان کی شان میں کوئی گستاخی نہ ہو پھر میں تمہارا ساتھ دوں گی۔''

وہ ذرا چپ ہوئی۔ ونڈ اسکرین کے پار سمندر کی لہروں کو دیکھتی رہی پھر بولی۔ ''ایک مسئلہ ہے۔ میرے والدین کو اعتماد میں لینا ہو گا۔ انہیں یقین دلانا ہو گا کہ تم شادی کرو گے تو صرف مجھ سے، تمہارے انتظار میں میری عمر گزرتی رہے گی اور میں امی ابو پر بوجھ بنی رہوں گی۔ ہمارے خاندان میں میرے متعلق طرح طرح کی باتیں بنائی جائیں گی۔ تم ایسے تمام مسائل سے میرے والدین کو کس طرح نجات دلا سکتے ہو؟''

''مجھے ان سے ملنا ہوگا۔ مجھے کسی طرح ان کا اعتماد حاصل کرنا ہوگا۔''

''میں یہی چاہتی ہوں۔ میں نے امی اور ابو سے کہا ہے کہ آج شام سات بجے تمہیں اپنے گھر بلاؤں گی۔ تم گھر آ کر ان کے رُوبرو بیٹھ کر گفتگو کر سکو گے، یہ بہتر ہوگا کہ جلد از جلد ان سے ملاقات کرو اور یہ معاملات طے کرو۔''

وکی نے وعدہ کیا کہ وہ شام سات بجے اس کے گھر آئے گا۔ وہ دونوں بڑی دیر تک گھومتے پھرتے رہے۔ انہوں نے ایک ریسٹورنٹ میں لنچ کیا پھر شام کو ملنے کا وعدہ کر کے ایک دوسرے سے رخصت ہو گئے۔ وہ تقریباً پانچ بجے گھر آیا۔ غسل کر کے اچھا سا لباس پہن کر مومی کے گھر جانے کا ارادہ تھا۔ عینی نے اس کے بیڈروم میں آ کر اسے دیکھا پھر کہا۔ ''تم نے نہا دھو کر لباس تبدیل کیا ہے۔ پاک صاف ہو کر کہیں عبادت کرنے جا رہے ہو یا کسی لڑکی سے اپائنٹ منٹ ہے؟''

وہ بولا۔ ''ہاں، کچھ ایسی ہی بات ہے۔ ایک مہ جبیں سے ملاقات کا وعدہ ہے۔''

وہ بولی۔ ''کسی سے ملاقات کرنے جاؤ گے تو دادی جان کا تعاقب کیسے کرو گے؟''

وکی کو اچانک یاد آیا کہ آج ہفتہ ہے، آج رات کھانے کے بعد دادی جان اپنی سہیلی سے اور ان بزرگ سے ملنے جائیں گی۔ دونوں بہن بھائی نے یہ طے کیا تھا کہ آج ان کا تعاقب کیا جائے گا۔ وہ اپنا سر کھجاتے ہوئے بولا۔ ''اوہ گاڈ! میں تو بھول ہی گیا تھا۔''

''تم اتنی ضروری بات کیسے بھول گئے؟''

''مومی سے ملاقات بھی بہت ضروری تھی۔ میں آج پہلی بار اس کے والدین سے ملنے والا ہوں۔''

''میں نے کئی بار تمہیں ایک لڑکی کے ساتھ دیکھا ہے، کیا اسی کا نام مومی ہے؟''

''ہاں۔ وہ بہت اچھی ہے۔ میں اسے لائف پارٹنر بنانے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔''

وہ حیرانی سے بولی۔ ''وہ تو ایک معمولی صورت شکل کی لڑکی ہے۔ کوئی اس کی طرف متوجہ بھی نہیں ہوتا ہوگا۔ تم کیا دیکھ کر اس پر مر مٹے ہو؟''

''اس کی صورت بری نہیں ہے اور سیرت تو ایسی ہے کہ اس نے میرا دل جیت لیا ہے۔''

''تم نے اس کا حسب نسب معلوم کیا ہے۔ کیا ممی ڈیڈی اسے بہو بنانا منظور کریں گے؟''

''شادی مجھے کرنی ہے اور میں کروں گا۔ آگے جو ہوگا، دیکھا جائے گا۔''

”اپنے کام کی بات کرو۔ کیا دادی جان کے پیچھے نہیں جاؤ گے؟“

”جاؤں گا، فکر نہ کرو۔ وہ رات کے کھانے کے بعد تقریباً دس بجے یہاں سے نکلتی ہیں۔ میں نو بجے تک یہاں آ جاؤں گا۔“

اس نے یہی حساب لگایا تھا کہ سات بجے مومی کے گھر پہنچے گا۔ آٹھ بجے تک اس کے والدین سے گفتگو ہو گی۔ پھر وہ نو بجے تک گھر آ کر دادی جان کے پیچھے لگ جائے گا۔ وہ سات بجے وہاں پہنچا۔ مومی انتظار کر رہی تھی۔ اس نے اپنی امی اور ابو سے تعارف کرایا پھر چائے لینے کے لیے وہاں سے چلی گئی۔ اس کے ابو نے کہا۔ ”میرا پورا نام امیر الدین اکبر ہے۔ عام طور پر اکبر انصاری کہلاتا ہوں۔ کسٹمز آفیسر ہونے کے باوجود اس ایک چھوٹے سے پرانے مکان میں رہتا ہوں۔ یہ ہماری پہلی ملاقات ہے۔ اگر ہم ایک دوسرے سے سچ بولیں گے، اپنی خامیاں ایک دوسرے سے نہیں چھپائیں گے تو یہ شناسائی آئندہ دوستی اور رشتے میں بدل سکے گی۔“

وکی نے کہا۔ ”میں آپ کے سامنے بچہ ہوں۔ مجھ سے گفتگو کے دوران میں غلطی ہو تو میری غلطی کی نشاندہی کریں۔ میں اصلاح کرنے کی کوشش کروں گا۔“

مومی کی امی نے کہا۔ ”ہماری بیٹی نے تمہارے بارے میں بتایا ہے۔ ہم چاہتے ہیں تم خود اپنے بارے میں پوری تفصیل سے بتاؤ۔ ہم سے کوئی بات نہ چھپاؤ۔“

وہ اپنے اور اپنے گھر والوں کے متعلق تفصیل سے بتانے لگا۔ مومی چائے اور اسنیکس لے آئی۔ وہ سب کھاتے پیتے اور آپس میں بولتے رہے۔ اس کی امی نے تمام باتیں سننے کے بعد کہا۔ ”تمہارے ڈیڈی کو اپنے اعلیٰ خاندان پر فخر کرنے کا حق ہے لیکن وہ دوسرے خاندانوں کو کمتر سمجھیں گے تو کیسے معزز کہلائیں گے۔ قیامت کے دن کسی کی خاندانی برتری نہیں دیکھی جائے گی۔ صرف اچھے برے اعمال کا حساب کیا جائے گا۔“

اس کے ابو نے کہا۔ ”لوگوں کا یہ مزاج بن گیا ہے، وہ خود کو اونچا رکھنے کے لیے سامنے والے کو نیچے گراتے ہیں۔ خود کو بے داغ ثابت کرنے کے لیے دوسروں پر کیچڑ اچھالتے ہیں۔ ضروری نہیں ہے کہ اعلیٰ خاندان کے لوگ اعلیٰ ظرف بھی ہوں۔ اعلیٰ ظرفی، ایمانداری اور سچائی اللہ تعالیٰ کی دین ہے وہ جسے چاہتا ہے، اسے اعلیٰ خوبیوں سے نواز دیتا ہے۔“

”ہو سکے تو اپنے والدین کو سمجھاؤ، وہ کسی بھی شریف خاندان سے بہولا سکتے ہیں۔ ایسا کرنے سے وہ کمتر نہیں ہو جائیں گے۔ ہمیں خاندان کو نہیں، خوبیوں کو سمیٹنا اور جمع کرنا چاہیے۔“

بیگم اکبر نے کہا۔ ''مسئلہ تمہارا ہے۔ تم سوچو اور سمجھو کہ اپنے والدین کو کس طرح راضی کر سکتے ہو۔ ہم یہ بھی نہیں چاہیں گے کہ والدین سے گستاخی کرو۔''

''میں امی، ڈیڈی اور دادی جان سے کبھی گستاخی نہیں کرتا لیکن یہ میری ساری زندگی کا معاملہ ہے۔ میں انہیں ہر طرح راضی کرنے کی کوشش کروں گا۔ کیونکہ اس گھر میں رہ کر میں کسی اور سے شادی نہیں کروں گا۔ میرا مستقبل آپ کے گھر سے ہے اور اسی گھر سے رہے گا۔''

''بیٹے! اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تم اپنے اس فیصلے پر قائم رہو گے؟''

''یہ تو آنے والا وقت ہی بتا سکے گا۔ فی الحال آپ پانچ یا چھ برس تک مومی کی تعلیم جاری رکھیں گے۔ ابھی اس کی شادی کے متعلق نہیں سوچیں گے۔''

''یہ ضروری نہیں ہے۔ کسی اچھے خاندان کا اچھا کمانے کھانے والا لڑکا مل جائے تو بیٹیوں کے والدین دیر نہیں کرتے۔ یہ سوچ کر رشتہ کر دیتے ہیں کہ بیٹیاں سسرال جا کر باقی تعلیم مکمل کر لیں گی۔''

''اگر آپ مومی کی تعلیم کے دوران میں ایسا کوئی فیصلہ کریں گے تو میں اپنے بزرگوں کی مخالفتوں کے باوجود آپ کی صاحبزادی کو اپنی شریکِ حیات بنالوں گا۔ آپ دوسروں پر مجھے ترجیح دیں گے۔''

بیگم اور اکبر انصاری کو اس کی بات معقول لگی۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ مومی کا رشتہ کہیں کرنے سے پہلے وکی کو آخری فیصلہ کرنے کا موقع دیا جائے گا۔ فیصلہ مومی کے حق میں ہوگا تو اسے خوش آمدید کہا جائے گا۔

گفتگو کا سلسلہ طویل ہو گیا تھا۔ وہ اب گھر جانا چاہتا تھا لیکن ان بزرگوں نے اسے روک لیا۔ رات کا کھانا کھلانے کے بعد ہی اسے رخصت کیا۔ وہ بے حد خوش تھا۔ گھر پہنچا تو رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ عینی نے غصے سے پوچھا۔ ''کہاں رہ گئے تھے؟ کیا تم ان بزرگ سے ملنا نہیں چاہتے؟''

''غصہ نہ کرو۔ ہم ان سے ضرور ملیں گے۔ تم سے پکا وعدہ کرتا ہوں۔ اگلے ہفتے ضرور ان کا سراغ لگاؤں گا۔ پھر دوسرے ہی دن تمہیں وہاں لے جاؤں گا۔''

بہر حال وہ ہفتہ بھی گزر گیا اور وہ دونوں اپنے دادا تک نہ پہنچ سکے۔ بتول بی، فضل الرحمٰن اور شگفتہ کو یقین تھا کہ بچے حکم کے پابند رہیں گے اور آئندہ اس اجنبی بزرگ سے ملنے کا خیال دل سے نکال دیں گے۔

لوگ اپنے اپنے طور پر بڑی سے بڑی تدبیر سوچتے ہیں۔ مگر تقدیر بدل نہیں پاتے۔ خلافِ توقع کوئی ایسی بات ہو جاتی ہے کہ ساری تدبیریں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔ دو دنوں کے بعد عینی کی سالگرہ منائی گئی۔ بڑے بڑے امیر کبیر لوگوں کو مدعو کیا گیا۔ کوٹھی کے اندر اور باہر لان میں مہمانوں کا میلہ لگ گیا۔ سالگرہ جیسی تقریبات اس لیے بھی ہوتی ہیں کہ اونچے گھرانے والے نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کو دیکھیں، پسند کریں اور ان کا رشتہ طلب کریں۔

ایسے قد آور لوگوں کی موجودگی میں زائر جیسا بونا آ گیا۔ اگرچہ وہ بونا نہیں تھا لیکن ان کے درمیان سکڑا سمٹا سا لگ رہا تھا۔ چہرے سے اور اپنے انداز سے بھیک مانگنے والا لگ رہا تھا۔ عینی اسے دیکھتے ہی چونک گئی۔ وہ بن بلایا مہمان تھا۔ وہ تیزی سے چلتی ہوئی اس کے قریب آئی، پھر بولی، تم یہاں کیوں آئے ہو؟

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ''وہ...... وہ تم نے مجھے دعوت نہیں دی۔ دل نے کہا، اپنوں کو دعوت نہیں دی جاتی۔ دعوتی کارڈ تو غیروں کو دیے جاتے ہیں۔ پلیز، مائنڈ نہ کرنا۔ تمہاری سالگرہ ہے۔ منہ نہ بناؤ، مسکراتی رہو۔''

''تم بہت ہی ڈھیٹ ہو۔ ادھر میز کے پاس جاؤ اور کچھ کھا پی کر دفع ہو جاؤ۔ یہاں کسی لڑکی سے مکس اَپ ہونے کی کوشش کرو گے تو بے بھاؤ کے جوتے پڑیں گے اور خبردار! مجھے مخاطب نہ کرنا۔''

وہ منہ پھیر کر چلی گئی۔ زائر ایک میز کے پاس آ گیا۔ وہاں کھانے کی لذیذ ڈشیں رکھی ہوئی تھیں۔ وہ بھوکوں کی طرح کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ یوں جلدی جلدی کھانے لگا جیسے دیر کرے گا تو اس سے کھانا چھین لیا جائے گا۔

کھانے کے بعد اس نے سویٹ ڈش کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ پھر ایک طرف دیکھتے ہی رک گیا۔ اس کے قریب ہی بتول بی کھڑی ہوئی ایک خاتون سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھیں۔ وہ انہیں غور سے دیکھتے ہوئے سوچنے لگا۔ ''یہ خاتون تو موچی کے گھر میں تھیں اور اس موچی کے ساتھ یوں لگی کھڑی تھیں جیسے اس کی گھر والی ہوں لیکن یہاں تو یہ دولت مند خاتون دکھائی دے رہی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے، میری طرح مہنگا لباس پہن کر اس تقریب میں آئی ہیں۔''

اس وقت فضل الرحمٰن نے آ کر کہا۔ ''اماں! یہ آپ کی بہو بہت ہی بے پرواہ ہے۔ ہیرے کی انگوٹھی کہیں گم کر دی ہے۔ اب ڈھونڈتی پھر رہی ہے۔''

وہ بولیں۔ ''تمہارے باتھ روم کے نلکے میں پانی نہیں آ رہا تھا۔ دلہن میرے ہاتھ روم میں منہ ہاتھ دھونے آئی تھیں۔ وہیں انگوٹھی اتار کر چلی گئیں۔ میں نے اٹھا کر رکھی ہے۔ اچھا ہے، ذرا اسے پریشان ہونے دو۔ اس کی یہی سزا ہے۔''

فضل الرحمٰن ہنستا ہوا چلا گیا۔ بتول بی اس خاتون سے کہنے لگیں۔ ''میری بہو بہت ہی بے پرواہ ہے۔ ہیرے موتیوں سے جڑے ہوئے زیورات اِدھر اُدھر بھولتی رہتی ہے۔ میں ہی انہیں سمیٹ کر رکھتی ہوں۔''

زائران کی باتیں سن رہا تھا۔ حیرانی سے سوچ رہا تھا۔ ''یہ خاتون تو اس کوٹھی کی مالکن ہے۔ میں عینی کے ڈیڈی کو جانتا ہوں۔ وہ خاتون کو اماں کہہ رہے تھے۔ تعجب ہے، ایک کروڑ پتی بزنس مین کی والدہ ایک موچی کے گھر میں کیا کر رہی تھی؟''

بتول بی اس خاتون سے باتیں کرنے کے بعد دوسری خواتین کی طرف جانے لگیں۔ وہ دور ہی دور سے اس کا پیچھا کرنے لگا۔ اس نے علم دین کے کھلے ہوئے دروازے سے دور تک دیکھا تھا۔ اندر علم دین اور بتول بی کے سوا کوئی نہیں تھا۔ اتنی بڑی بیگم صاحبہ ایک موچی کے ساتھ بند دروازے کے پیچھے کیا کر رہی تھیں؟ وہاں کیوں گئی تھیں؟

اگر بیگم صاحبہ کی اس موچی سے رشتہ داری ہے یا وہ ہیروں سے جڑی ہوئی سونے کی دوسری سینڈلیں بنوانے گئی تھیں اور اس طرح ان کی جان پہچان ہے تو اس موچی کو بھی یہاں ہونا چاہیے۔ وہ دور دور تک یوں دیکھنے لگا جیسے اس موچی کی موجودگی بھی وہاں ضروری سمجھ رہا ہو۔ وہ کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ عینی نظر آ گئی۔ وہ سیدھی اس کے پاس آ کر بولی۔ ''تم ابھی تک یہیں مر رہے ہو؟ دیکھو، میں نہیں چاہتی کہ تم سے میری شناسائی ظاہر ہو۔ فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔''

''جاتا ہوں، ابھی جاتا ہوں۔ پہلے تم میری ایک الجھن دور کر دو۔''

وہ بے زاری سے بولی۔ ''اب تم ٹیکسی کا کرایہ مانگو گے۔ میں اس تقریب میں پرس لے کر نہیں گھوم رہی ہوں۔ تم جاؤ یہاں سے۔''

''میں تم سے ایک پیسا بھی نہیں مانگوں گا۔ میری الجھن تو سن لو۔''

وہ ناگواری سے بولی۔ ''کیا مصیبت ہے؟ جلدی سناؤ۔''

وہ بولا۔ ''ابھی تمہارے ڈیڈی ایک خاتون کو اماں کہہ رہے تھے۔''

''وہ اپنی اماں کو اماں نہیں کہیں گے تو کیا تمہاری اماں کو اماں کہیں گے؟''

''پلیز، میری بات کو سمجھو، وہ ایک ایسی خاتون کو اماں کہہ رہے تھے، جو ایک موچی کے

گھر جاتی ہیں۔''

عینی نے چونک کر اسے دیکھا۔''کون سے موچی کے گھر جاتی ہیں؟ تم کس خاتون کی بات کر رہے ہو؟''

''بھئی وہ یقیناً تمہارے ڈیڈی کی اماں یعنی کہ تمہاری دادی اماں ہوں گی۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ ان کی بہو بے پرواہ ہے۔ ہیرے موتی سے جڑے ہوئے زیوارات اِدھر اُدھر بھولتی رہتی ہیں۔ سارے رشتے میری سمجھ میں آ رہے تھے۔ وہ تمہاری ممی کو بہو کہہ رہی تھیں۔''

وہ اس کی باتیں کچھ سن رہی تھی، کچھ نہیں سن رہی تھی۔ یہ سوچ کر دماغ میں سنسناہٹ ہو رہی تھی کہ اس کم بخت نے اس کی دادی جان کو ایک موچی کے گھر میں دیکھ لیا ہے۔ جب کہ وہ چھپ کر جاتی ہیں۔

اس نے زائر کی آستین کو یوں پکڑا جیسے اسے نوچ ڈالے گی۔ پھر دبے دبے سخت لہجے میں بولی۔''اب یہ بات کسی کے سامنے زبان پر نہ لانا۔ مجھے دور ہی سے بتاؤ کہ تم نے کس خاتون کو موچی کے گھر میں دیکھا ہے؟''

وہ مہمانوں کے ہجوم میں بتول بی کو تلاش کرنے لگا۔ عینی اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔ وہ سمجھ تو گئی تھی کہ زائر نے اس کی دادی جان کو ہی دیکھا ہوگا پھر بھی وہ تصدیق کرنا چاہتی تھی۔ پھر ایک جگہ تصدیق ہو گئی۔ بتول خواتین کے درمیان ہنس ہنس کر بول رہی تھی۔ زائر ان کی ہی نشاندہی کر رہا تھا۔ عینی نے اس سے کہا۔''میرے ساتھ آؤ۔''

وہ مہمانوں سے کترا کر جانے لگی۔ ایک جگہ وکی اپنے دوستوں کے درمیان قہقہے لگا رہا تھا۔ اس نے آواز دی۔''وکی! ذرا ادھر آؤ، پلیز جسٹ فوراے منٹ۔''

وکی دوستوں سے معذرت کرتے ہوئے اس کے پاس آیا، وہ بولی۔''یہ زائر ہے میرا کلاس فیلو......''

وکی نے اس سے مصافحہ کیا، عینی نے کہا۔''اسے منہ لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم سے تعارف کرانے کا مقصد یہ ہے کہ اس نے دادی جان کو موچی کے گھر میں دیکھا ہے۔''

وکی نے چونک کر زائر کو دیکھا پھر عینی سے پوچھا۔''یعنی یہ ہمیں ان بزرگ کے گھر تک پہنچا سکتا ہے؟''

وہ بولا۔''ہاں، ابھی پہنچا سکتا ہوں۔ وہ موچی گلی کے اندر ایک مکان میں رہتے ہیں۔''

''ابھی یہاں مہمانوں کو چھوڑ کر جانا مناسب نہیں ہے۔ ایسا کرو، کل صبح مجھ سے ملاقات کرو۔''

عینی نے فوراً کہا۔ ''کل نہیں ابھی اسی وقت...... زائر! تم یہاں رکو، ہم ابھی آتے ہیں۔''

وہ وکی کا ہاتھ پکڑ کر وہاں سے دور آئی پھر دھیمی آواز میں بولی۔ ''تم زائر کو نہیں جانتے، یہ لالچی ہے۔ اسے زیادہ منہ نہیں لگانا ہے۔ تم ابھی اس کے ساتھ وہاں جاؤ گے تو یہاں تمہاری کمی کسی کو نہیں کھٹکے گی۔ میری سالگرہ ہے۔ سب مجھے ہی وِش کر رہے ہیں۔''

''عینی! میں اپنے دوستوں سے کیا کہوں گا؟''

''کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہارے دوست یہاں انجوائے کر رہے ہیں۔ تم ابھی جاؤ اور صرف وہ مکان دیکھ کر چلے آؤ۔ یہ دوست تمہیں مس نہیں کریں گے۔''

''تم تو پیچھے پڑ جاتی ہو۔ ٹھیک ہے ابھی جا رہا ہوں۔''

''اور سنو...... اس سے اکیلے میں اگلواؤ کہ یہ موچی کے گھر کیوں گیا تھا؟ اس گھر میں کتنے فیملی ممبر ہیں۔ کیا کل کسی وقت ان بزرگ سے ملاقات ہو سکے گی؟''

''میں پوری ڈیٹیل معلوم کرلوں گا۔ مجھے زیادہ نہ سمجھاؤ اور یہ لالچی ہے تو اسے دو چار سو روپے دے دوں گا۔''

وہ جانا چاہتا تھا، عینی نے کہا۔ ''اور سنو......''

وہ جھنجھلا بولا۔ ''توبہ ہے! اب کچھ کہنے کو رہ گیا ہے؟''

''جھنجھلاتے کیوں ہو؟ میں چاہتی ہوں، ان بزرگ کے لیے یہاں سے کھانے پینے کی چیزیں لے جاؤ۔ انہیں معلوم ہوگا کہ میری سالگرہ ہے تو وہ مجھے دعائیں دیں گے۔''

اس نے کھانے کا تمام سامان پیک کرایا۔ پھر زائر کے ساتھ اپنی کار میں بیٹھ کر وہاں سے جانے لگا۔ کچھ دور جانے کے بعد اس نے پوچھا۔ ''تم اس بزرگ کا مکان کیسے جانتے ہو؟''

''آپ کس بزرگ کی بات پوچھ رہے ہیں؟''

''میں ان کی بات کر رہا ہوں، جہاں ہم جا رہے ہیں۔''

''اچھا تو آپ انہیں موچی کہیں نا؟''

''ہاں، پیشے کے اعتبار سے موچی کہنا چاہیے لیکن ایسا کہنا اچھا نہیں لگتا۔ وہ بزرگ ہیں، انہیں بزرگ کہنا چاہیے۔ بائی دا وے تم انہیں کیسے جانتے ہو؟''

''ہمارے کالج کی ایک لڑکی ثمینہ سونے کے سینڈلیں بنوانا چاہتی تھی۔ اس سلسلے میں ان کے دروازے پر گیا تھا لیکن بزرگ نے کسی دوسری لڑکی کے لیے ایسی سینڈلیں بنانے سے

انکار کر دیا۔ آج یہ سمجھ میں آ رہا ہے کہ ان بزرگ سے آپ لوگوں کی رشتہ داری ہے۔ یا پھر بہت ہی قریبی تعلقات ہیں۔''

اس نے پوچھا۔ ''ان بزرگ کے ساتھ اور کتنے فیملی ممبرز ہیں؟''

''کوئی نہیں ہے۔ صرف آپ کی دادی جان کو ان کے ساتھ دیکھا تھا۔ وہ دونوں مکان کے اندر تھے اور دروازہ بھی اندر سے بند تھا۔ دیکھیں، آپ برا نہ مانیں۔ کوئی بھی دیکھنے والا یہ ضرور سوچے گا کہ انہوں نے کس رشتے سے دروازہ بند رکھا تھا؟''

وکی نے ایک جھٹکے سے گاڑی روکی۔ گرج کر بولا۔ ''کیا بکواس کر رہے ہو؟ جھوٹ بول رہے ہو۔ دروازہ اندر سے بند نہیں ہوگا۔ اگر ہوگا تو میری دادی جان کی سہیلی وہاں ہوں گی۔''

''آپ کو غصہ آ رہا ہے۔ ابھی خود جا کر دیکھ لیں، وہاں کوئی سہیلی، کوئی انسان کا بچہ نہیں ہے۔ محلے والوں سے بھی پوچھ لیں۔ وہ بزرگ وہاں تنہا رہتے ہیں۔''

وکی نے اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ پھر گاڑی آگے بڑھا دی۔ اس کے دماغ میں آندھی سی چلنے لگی تھی۔ دادی جان ہر ہفتہ کسی سہیلی کے پاس رہنے جاتی تھیں۔ پھر دوسرے دن شام کو واپس آتی تھیں۔ اگر وہاں سہیلی نہیں ہے۔ کوئی اور فرد نہیں ہے۔ تو کیا وہ ان بزرگ کے ساتھ چوبیس گھنٹے گزار کر آیا کرتی ہیں؟

ایسا سوچتے ہوئے بھی اسے شرم آ رہی تھی۔ وہ تیزی سے ڈرائیو کرتے ہوئے موچی گلی میں داخل ہوا۔ زائر نے کہا۔ ''اندر گلیاں تنگ ہیں۔ یہ کار نہیں جا سکے گی۔ آپ یہاں اسے لاک کر دیں۔''

وہ دونوں کار سے باہر آئے۔ زائر نے کھانے کا سامان اٹھالیا۔ وکی نے کار کو لاک کیا۔ پھر تنگ گلیوں سے گزرتا ہوا علم دین کے دروازے پر آ گیا۔ زائر نے دستک دی۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ ہر طرف گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اس نے دوسری بار دستک دی۔ علم دین نے اندر سے پوچھا۔ ''کون ہے بھائی؟ اتنی رات کو کیوں آئے ہو؟''

وکی نے کہا۔ ''آج عینی کی سالگرہ ہے۔ اس کے گھر سے کھانا آیا ہے۔''

علم دین بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ عینی کا نام سن کر ہڑبڑا کر اٹھ گیا۔ بستر سے اتر کر تیزی سے صحن میں آیا۔ بڑبڑاتے ہوئے دروازے کی طرف جانے لگا۔ ''عینی! یہ اتنی رات کو میری پوتی کا نام کون لے رہا ہے؟''

اس نے دروازہ کھول کر دو جوان لڑکوں کو دیکھا۔ اب سے کوئی چھ برس پہلے وکی کو

اسکول جاتے دیکھا کرتا تھا۔ اب تو وہ اونچا پورا جوان ہو گیا تھا۔ اسے پہچان نہ سکا۔ وکی اسے توجہ سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ''کون ہو تم لوگ؟ کسی نے ابھی عینی کا نام لیا تھا؟''

وکی نے کہا۔ ''میں نے...... میں عینی کا بھائی ہوں۔''

پوتے کو سامنے دیکھ کر دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اس نے باہر آ کر اس کے دونوں شانوں پر ہاتھ رکھے۔ خوشی سے لرزتے ہوئے پوچھا۔ ''تم...... تم سیّد وقار احمد ہو؟ وکی ہو، بتول کے پوتے ہو؟''

وہ اسے جگہ جگہ سے چھونے پکڑنے لگا۔ یقین کرنے لگا کہ پہلی بار اس کا پوتا اس سے ملنے آیا ہے۔ پھر وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔ ''بیٹے! اندر آؤ، آؤ...... آ جاؤ۔''

وکی نے اندر آ کر زائر سے کہا۔ ''یہ سامان یہاں رکھو اور تم جاؤ۔''

اس نے پانچ سو کا ایک نوٹ نکال کر اسے دیا۔ وہ خوش ہو کر جانے لگا۔ علم دین نے اسے پہچانتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو وہی ہے۔ ایک دن یہاں آیا تھا۔ کسی لڑکی کے لیے سونے کی سینڈلیں بنوانا چاہتا تھا۔''

وکی نے کہا۔ ''اسے جانے دیں۔ آپ میری بات کا جواب دیں۔ کیا آپ یہاں بالکل تنہا رہتے ہیں؟''

زائر باہر جا کر رک گیا تھا۔ وکی نے ڈانٹ کر کہا۔ ''جاؤ یہاں سے......''

وہ پلٹ کر تیزی سے چلا گیا۔ اس نے پھر پوچھا۔ ''کیا آپ تنہا رہتے ہیں؟''

''ہاں، بالکل تنہا ہوں۔ تمہیں یہاں بتول نے بھیجا ہے نا؟''

''نہیں۔ دادی جان نہیں جانتی ہیں کہ میں نے کس طرح اس مکان کا پتا معلوم کیا ہے۔ میں چاہتا ہوں، آپ مجھ سے کوئی سوال نہ کریں۔ میرے سوالوں کے جواب دیں۔ کیا دادی جان ہر ہفتے یہاں آتی ہیں؟''

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں یہ سوال دادی جان سے کرنا چاہیے تھا۔''

''آپ جواب دے سکتے ہیں۔ اس لیے آپ سے پوچھ رہا ہوں۔ آپ انکار نہ کریں کیونکہ وہ یہاں دیکھی گئی ہیں۔''

وہ سر ہلا کر بولا۔ ''ہاں، وہ یہاں آتی ہیں۔''

''ان کی وہ سہیلی کہاں ہے، جس کے بزرگوں نے بچپن میں دادی جان کی پرورش کی تھی۔''

وہ بولا۔ ''یا خدا! میں کیا کروں، کوئی غلط جواب دوں گا تو کتنی ہی غلط فہمیاں پیدا ہوں

گی۔ بیٹے! تمہاری دادی کی اس سہیلی کو تمہارا باپ بھی جانتا ہے اور تمہاری ماں بھی۔ ان سب نے اسے دنیا کی نظروں سے چھپا دیا ہے اور وہ سہیلی میں ہوں. وہ سب جانتے ہیں کہ تمہاری دادی جان ہر ہفتے چوبیس گھنٹوں کے لیے یہاں آتی ہیں۔''

وکی حیرانی اور پریشانی سے علم دین کو دیکھنے لگا، وہ بولا۔''جب تم یہاں تک پہنچ ہی گئے ہو تو تمہیں بھی سچ معلوم ہونا چاہیے۔ تمہارے باپ نے دنیا والوں سے اور تم سب سے یہ جھوٹ کہا ہے کہ اس کا باپ مر چکا ہے۔ وہ زندہ ہے، میں تمہارے باپ کا باپ ہوں، تمہارا دادا ہوں۔''

ایسا کہتے کہتے بوڑھی آنکھیں بھیک گئیں۔ وکی حیرانی اور بے یقینی سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس بوڑھے کو دیکھ رہا تھا۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ علم دین نے کہا۔''یہ اتنی کڑوی سچائی ہے کہ تم آسانی سے یقین نہیں کرو گے۔ تمہارا باپ اس جھوٹ کو پچھلے اٹھائیس برسوں سے نباہتا آ رہا ہے۔''

وہ بولا۔''کیا یہ یقین کرنے کی بات ہے؟ کوئی بھی شخص اپنی ولدیت سے انکار نہیں کرتا۔ پھر میرے ڈیڈی کیوں انکار کریں گے؟''

''صرف اس لیے کہ وہ ایک موچی کی اولاد کہلانا نہیں چاہتا۔ اونچی سوسائٹی میں سر بلند رہنا چاہتا ہے۔ اس لیے خود کو سیّد زادہ کہتا ہے۔ اس کا باپ تو کیا، اس کے دادا، پردادا بھی سیّد نہیں تھے۔ میری غلطی ہے کہ میں نے جھوٹ بولنے اور دھوکا دینے سے انکار کیا۔ میں سیّد زادہ کہلا کر اپنی ولدیت کو جھٹلانا نہیں چاہتا تھا۔ میرا نام علم دین ہے۔ وہ مجھے سیّد علیم الدین بنانا چاہتا تھا۔ میں کیوں بن جاتا؟ اپنی بنیاد کو، اپنی اصلیت کو کیسے بھول جاتا؟ اس لیے میں نے تمہارے باپ کے ساتھ رہنے سے انکار کر دیا۔''

وہ سر جھکا کر ایک طرف گیا پھر پلٹ کر بولا۔''بتول پریشان ہوگئی تھی، میرا ساتھ دے یا بیٹے کا ساتھ رہے؟ میں نے اسے دل سے اجازت دے دی کہ وہ بیٹے کے ساتھ رہے۔ میں نے زندگی کی سردیاں گرمیاں دیکھی ہیں۔ تنہا رہ سکتا تھا اور تنہا رہ رہا ہوں۔''

وکی پیچھے ہٹتا ہوا دروازہ تک پہنچ گیا پھر بولا۔''آپ کی باتیں سچ لگ رہی ہیں لیکن یہ سچائی اتنی زہریلی ہے کہ حلق سے نہیں اُتر رہی ہے۔ میں جا رہا ہوں۔ پہلے یہ معلوم کروں گا کہ سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا ہے؟ اگر یہی سچ ہے تو میں ضرور واپس آؤں گا۔''

وہ پلٹ کر واپس دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔ علم دین دہلیز پر آ کر دیکھنے لگا۔ وکی رات کی نیم تاریکی میں تیزی سے چلتا ہوا گلی کے ایک موڑ پر نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

جب وہ گھر پہنچا تو آدھی رات گزر چکی تھی۔ تمام مہمان جا چکے تھے۔ ملازم لان میں بچھی ہوئی میزوں اور کرسیوں کو اٹھا رہے تھے۔ وہ کوٹھی کے اندر آیا تو عینی سے سامنا ہوا۔ اس نے پوچھا۔ ''کیا ہوا؟ ان کا مکان دیکھ لیا۔ ان سے ملاقات ہوئی؟''

''ہاں...... میرے ساتھ آؤ۔ ابھی بتاتا ہوں۔''

وہ ایک طرف جانے لگا۔ وہ اس کے پیچھے چلتی ہوئی بولی۔ ''کہاں جا رہے ہو؟ یہاں بیٹھ کر باتیں کیوں نہیں کرتے؟''

اس نے جواب نہیں دیا، اپنے بڑے بھائی وقاص کے بیڈ روم کے پاس آ کر دروازے پر دستک دی۔ اندر سے آواز آئی۔ ''کون ہے؟''

''بھائی جان! میں ہوں وکی' پلیز! دروازہ کھولیں۔ آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

وقاص نے ذرا سا دروازہ کھول کر پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟ کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''آپ باہر آئیں۔ میں ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر کچھ کہنا چاہتا ہوں۔''

''اوہ وکی! باتیں صبح بھی ہو سکتی ہیں۔ آج کی تقریب نے بری طرح تھکا دیا ہے۔ صبح تمہاری بھابی کو ڈرامے کی ریکارڈنگ کے لیے جانا ہے؟ پلیز! ہمیں سونے دو۔''

''ریکارڈنگ کے لیے بھابی کو جانا ہے۔ آپ انہیں سونے دیں۔ میں ایک ایسی بات کہنے والا ہوں جسے سن کر آپ کی نیند اُڑ جائے گی۔ فار گاڈ سیک، آپ باہر آئیں۔''

اس نے کچھ سوچا پھر سر گھما کر کہا۔ ''ڈارلنگ! تم سو جاؤ، میں ابھی آ جاؤں گا۔''

اس نے باہر آ کر دروازے کو بند کیا پھر کہا۔ ''ایسی کیا بات ہے جسے سن کر میری نیند اُڑ جائے گی؟''

وہ عینی اور وقاص کے درمیان چلتے ہوئے بولا۔ ''آپ جانتے ہیں دادی جان ہر ہفتے کہاں جاتی ہیں؟''

وہ بے زاری سے بولا۔ ''کیا تم نے یہ پوچھنے کے لیے مجھے بلایا ہے؟ وہ کہیں بھی جاتی ہوں، میں کیا کروں؟ جو کہنا ہے صاف اور سیدھی طرح کہو۔''

وہ تینوں ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ وکی بھائی کا ہاتھ پکڑ کر اسے صوفے پر بٹھاتے ہوئے بولا۔ ''ہماری دادی جان ہمارے دادا جان کے پاس جایا کرتی ہیں۔''

عینی نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ وقاص نے پوچھا۔ ''یہ کیا بکواس ہے؟ وہ کس دادا جان کے پاس جاتی ہیں؟ جبکہ دادا جان ہماری پیدائش سے پہلے فوت ہو چکے

ہیں۔''

''وہ فوت نہیں ہوئے ہیں، زندہ ہیں۔ میں ابھی ان سے مل کر آ رہا ہوں۔''

وقاص نے بے یقینی سے اسے دیکھا پھر پوچھا۔''تم ہوش وحواس میں تو ہونا؟''

عینی نے کہا۔''تم تو ان بزرگ سے ملنے گئے تھے جنہوں نے مجھے اور بھابی کو سونے کی سینڈلیں بنا کر دی ہیں۔''

''میں ان ہی کی باتیں کر رہا ہوں۔ ابھی ان سے باتیں کر کے آ رہا ہوں۔ وہی ہمارے دادا جان ہیں۔''

وقاص نے غصے سے کہا۔''وکی! میں تمہارا منہ توڑ دوں گا۔ تم ایک موچی کو دادا جان بنا رہے ہو۔''

''میری بات سچ ہوگی تو آپ کس کس کا منہ توڑیں گے؟ ممی، ڈیڈی اور دادی جان، یہ تینوں بزرگ ہم سے جھوٹ بولتے آ رہے ہیں۔ وہ زندہ ہیں اور انہیں مردہ بناتے آ رہے ہیں۔''

وقاص غصے سے گرجتے ہوئے صوفے سے اٹھ کر بولا۔''تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ تم اپنے بزرگوں کو جھوٹا اور فریبی کہہ رہے ہو۔ چپ چاپ جا کر سو جاؤ ورنہ تمہاری پٹائی کر دوں گا۔''

''میں سر جھکا کر مار کھاتا رہوں گا لیکن یہی کہتا رہوں گا کہ دادی جان ہر ہفتے کسی سہیلی کے پاس نہیں جاتیں۔ ان کی کوئی سہیلی نہیں ہے۔ آپ ابھی دادی جان کو بلائیں، ڈیڈی اور ممی کو بھی بلائیں۔ یہ سوال ان سے کریں کہ جب ان کی کوئی سہیلی نہیں ہے تو وہ ہفتے میں چوبیس گھنٹے کے لیے کہاں جاتی ہیں؟''

فضل الرحمٰن نے اوپری منزل سے زینے پر آ کر پوچھا۔''یہ تم دونوں اتنی اونچی آواز میں کیا بول رہے ہو؟ کیا جھگڑا کر رہے ہو؟ کیا تمہارا بچپن لوٹ آیا ہے؟''

وقاص نے زینے کی طرف سر اٹھا کر کہا۔''ڈیڈ! اس کا دماغ چل گیا ہے۔ یہ کہہ رہا ہے، آپ، ممی اور دادی جان سب جھوٹے ہیں۔ ہم سے جھوٹ بول رہے ہیں۔ دادا جان مرے نہیں ہیں بلکہ زندہ ہیں۔''

وہ زینے کے ایک ایک پائیدان پر پاؤں رکھتا ہوا اُتر رہا تھا۔ آخری فقرہ سنتے ہی پاؤں کہیں سے کہیں پڑ گیا۔ وہ یکبارگی گرا پھر سنبھل نہ سکا۔ ایک ایک پائیدان سے لڑھکتا ہوا نیچے کی طرف آنے لگا۔ دونوں بیٹے چیختے ہوئے اسے پکارتے ہوئے دوڑے۔ دو دو پائیدانوں

پر اچھلتے ہوئے باپ کے پاس پہنچے۔ پھر اسے نیچے تک لڑھکنے سے پہلے ہی تھام لیا۔ عینی دوڑتی ہوئی دادی جان کو پکارتی ہوئی ان کے کمرے کی طرف بھاگی۔ یہ شور سن کے شگفتہ ادھر آئی۔ دونوں بیٹے باپ کو سنبھالتے ہوئے، سہارا دیتے ہوئے نیچے ڈرائنگ روم میں جا رہے تھے۔

شگفتہ پریشان ہو کر زینے سے اُترتے ہوئے بولی۔ ''کیا ہو گیا؟ تمہارے ڈیڈی کیسے گر پڑے؟ یہاں تو ایسا شور مچایا جا رہا ہے جیسے قیامت آ گئی ہو۔''

انہوں نے باپ کو صوفے پر اوندھا لٹا دیا تھا۔ اس کی کمر کا ہاتھوں اور پیروں کا مساج کرنے لگے۔ بتول بی عینی کے ساتھ تیزی سے چلتی ہوئی وہاں پہنچیں۔ اپنے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولیں۔ ''کیا ہوا میرے بچے کو؟ یہ کیسے گر پڑا؟ دلہن! تم اسے نیند میں چلنے کیوں دیتی ہو؟''

شگفتہ نے کہا۔ ''یہ نیند میں نہیں تھے۔ شور سن کر کمرے سے نکلے تھے۔ کیوں وقاص! کیا ہو رہا تھا یہاں؟ کیوں اونچی آواز میں بول رہے تھے؟''

وقاص نے وکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ مجھے غصہ دلا رہا تھا۔ آپ تمام بزرگوں کو جھوٹا اور فریبی کہہ رہا تھا۔''

''کیا؟'' شگفتہ نے گھور کر وکی کو دیکھا پھر پوچھا۔ ''تم کیا بکواس کر رہے تھے؟''

وہ پیچھے ہٹ کر بولا۔ ''بکواس نہیں کر رہا تھا۔ جو سچ ہے وہی کہہ رہا تھا۔ دادی جان کی کوئی سہیلی وہیلی نہیں ہے۔ یہ کسی سہیلی کے پاس نہیں جاتی ہیں۔ میں بھائی جان کے سامنے پوچھ رہا ہوں، بتائیں دادی جان! آپ کہاں جایا کرتی ہیں؟''

بتول بی ہکا بکا سی رہ گئیں۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتیں تھیں کہ ان کی گود میں کھیلنے والا پوتا اس طرح اچانک وار کرے گا۔ وہ ایک دم لڑکھڑاتے ہوئے پیچھے ایک صوفے پر بیٹھ گئیں۔ شگفتہ پریشان ہو کر وکی اور وقاص کو دیکھنے لگی۔ فضل الرحمٰن کو زیادہ چوٹیں نہیں آئی تھیں لیکن وہ یوں پڑا ہوا تھا جیسے تکلیف سے نڈھال ہو رہا ہو۔ آنکھیں نہیں کھول رہا تھا۔ چھوٹا بیٹا کہیں سے سچائی پکڑ لایا تھا۔ وہ انتظار کر رہا تھا کہ کوئی ٹھوس ثبوت وہ پیش نہیں کر سکے گا تو اسے جھٹلا دیا جائے گا۔ ابھی وہ سمجھنا چاہتا تھا کہ وکی اتنی دور کی کوڑی کہاں سے لایا ہے؟

وقاص سوالیہ نظروں سے اپنی دادی جان کو دیکھ رہا تھا، ان کے جواب کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ کبھی اپنے بیٹے کو اور کبھی اپنی بہو کو دیکھ رہی تھیں۔ شگفتہ نے کہا۔ ''وکی! تم ایسی بکواس کیوں کر رہے ہو؟ ان کی سہیلی ہے یا نہیں ہے یہ کہاں جاتی ہیں اور کہاں رہ کر آتی ہیں؟ یہ اپنا اچھا

برا خود سمجھتی ہیں۔ تمہیں ان بزرگوں پر تنقید نہیں کرنا چاہئے۔''

وہ بولا۔''بچے جو بات نہیں سمجھتے ہیں، اسے سمجھانا بڑوں کا فرض ہے ورنہ بچے اچھائی کو بھی برائی سمجھنے لگتے ہیں۔''

وقاص نے کہا۔''وکی ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ہمیں معلوم تو ہونا چاہئے کہ دادی جان ہر ہفتے کہاں رہ کر آتی ہیں؟''

بتول بی کو کچھ کہنے کے لیے سہارے کی ضرورت تھی۔ وہ سہارے کے لیے بہو اور بیٹے کو دیکھ رہی تھیں۔ وکی ان کے پاس آ کر قالین پر گھٹنے ٹیک کران کے زانو پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''دادی جان! میں ان بزرگ سے مل کر آیا ہوں۔ وہ بہت اچھے لگ رہے تھے۔ اپنے اپنے سے لگ رہے تھے۔ آپ اتنا بتا دیں، میرا دل ان کی طرف کیوں کھنچا جا رہا تھا؟''

وہ اتنی محبت سے بول رہا تھا کہ وہ ایک دم سے ابل پڑیں۔ آنسو سیلاب کی طرح نکل پڑے۔ انہوں نے جھک کر پوتے کو سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔ پھوٹ کر رونے لگیں۔ بیٹے کو آواز دیتے ہوئے بولیں۔''فضل دین! تم کب تک ماں کو ذلتیں اٹھانے پر مجبور کرتے رہو گے؟ پہلی بار دلہن نے مجھ پر شبہ کیا۔ میں چھپ کر اپنے مجازی خدا سے ملتی رہی اور اس نے مجھے بدچلن سمجھ لیا۔ آج میری پوتی اور پوتوں کو سچ نہیں بتاؤ گے تو یہ بھی مجھے اس بڑھاپے میں بے حیا اور بدچلن سمجھیں گے۔ اٹھو! انہیں بتا دو کہ وہ میرے مجازی خدا ہیں۔ ان بچوں کے دادا جان ہیں۔''

وقاص، عینی اور وکی کے اندر جیسے دھماکے ہونے لگے۔ وہ تینوں حیرانی سے اور سوالیہ نظروں سے اپنے باپ کو دیکھ رہے تھے۔ اب آنکھیں بند کرنے اور منہ چھپانے کا وقت گزر چکا تھا۔ فضل الرحمٰن نے آنکھیں کھولیں، آہستہ آہستہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

اسے سر جھکانا چاہئے تھا لیکن وہ تن کر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے پہلے وکی کو گھور کر دیکھا پھر عینی پر نظر ڈالی۔ اس کے بعد وقاص سے بولا۔''تم میرے بڑے بیٹے ہو۔ ذہین ہو اور اتنے قابل ہو کہ میرا تمام کاروبار بخوبی سنبھال رہے ہو۔ کاروبار میں جب تک نیک نامی نہ ہو تب تک یہ ترقی کی طرف گامزن نہیں رہتا۔ کاروبار میں نیک نامی کو برقرار رکھنے کے لیے معاشرے میں بھی نام کمانا اور اونچے سے اونچا درجہ حاصل کرنا لازمی ہوتا ہے۔ اگر آج دنیا کو یہ معلوم ہو جائے کہ میرے ابا اور تمہارے دادا جان سڑک کے کنارے بیٹھ کر پرانے جوتوں کی مرمت کرتے رہے ہیں تو اس سوسائٹی کے سب ہی لوگ کسی لحاظ اور مروت کے بغیر ہمیں موچی کی اولاد کہیں گے۔''

اس نے تینوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم سب سیّد خاندان کی بلندی سے پرانے جوتوں کی پستی میں گرنا چاہو گے؟''

وہ تینوں چپ رہے۔ بتول بی انتظار کرنے لگیں کہ بچے کیا فیصلہ سنانے والے ہیں؟ فضل الرحمٰن نے کہا۔ ''عزت کمانے میں برسوں لگ جاتے ہیں۔ کبھی کبھی ساری زندگی گزر جاتی ہے اور آدمی کو عزت نہیں ملتی ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ عزت سیدھے راستے سے حاصل نہیں ہوتی، مگر چور دروازے سے مل جاتی ہے۔''

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ تینوں بچوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے بولا۔ ''تمہاری سمجھ میں آ چکا ہے کہ ہم چور دروازے سے عزت کما رہے ہیں۔ ہم سب شیشے کے گھر میں ہیں۔ تم میں سے کوئی بھی پتھر مار کر اس گھر کو کرچی کرچی کر سکتا ہے۔''

وقاص نے کہا۔ ''ڈیڈ! آپ نے جو بھی کیا ہے، ہماری بہتری کے لیے کیا ہے، ہم آج جس مقام پر ہیں، وہاں سے نیچے نہیں آنا چاہیں گے۔ آپ کے جھوٹ کو نسل در نسل سچ بنائے رکھنے کی کوشش کرتے رہیں گے لیکن......''

وہ بولتے بولتے چپ ہوا، سب اسے دیکھنے لگے۔ اس نے کہا۔ ''لیکن یہ سن کر کہ دادا جان زندہ سلامت ہیں، ان کے لیے دل تڑپ رہا ہے۔ آپ سے شکایت ہے کہ آپ نے انہیں اپنے اور پھر ہم سے دور کیوں رکھا؟''

''بیٹے! میں نے دور نہیں کیا ہے۔ تمہاری دادی جان گواہ ہیں۔ انہوں نے خود ہی ہمارے ساتھ رہنے سے انکار کیا تھا اور اب تک اپنے انکار پر قائم ہیں۔''

''انکار کی کوئی وجہ تو ہو گی؟''

''وہ اپنی بنیاد کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ میں نے خاندانی سیّد بننے کے لیے باپ کا نام بدل دیا۔ علم دین کے بجائے اپنی ولدیت میں سیّد علیم الدین لکھا۔ وہ اپنے باپ کو سیّد نہیں کہنا چاہتے تھے اور نہ ہی سیّد زادہ کہلانا چاہتے تھے۔ ان کے نقطہ نظر کے مطابق باپ کا نام بدلنے کا مطلب یہ ہے کہ باپ بدل گیا۔ اس طرح ماں کو گالی پڑتی ہے۔''

وکی نے کہا۔ ''یہ سن کر فخر ہو رہا ہے کہ دادا جان غیرت مند ہیں۔ ان کا نقطہ نظر درست ہے۔ ہم دوسری عورتوں کو ماں کہہ سکتے ہیں لیکن کبھی دوسرے کو باپ نہیں بنا سکتے۔ باپ ایک ہی ہوتا ہے۔ نام بدلنے سے یوں لگتا ہے جیسے ہم باپ کو سائن بورڈ بنا رہے ہوں۔''

فضل الرحمٰن نے گرج کر کہا۔ ''میں تمہارا منہ توڑ دوں گا۔ جذباتی ہو کر نہ بولو۔ میں نے تمہارے دادا جان کے نام کو سائن بورڈ کی طرح تبدیل نہیں کیا۔ ان کا نام اور ان کا وجود اپنی

جگہ اٹل ہے۔ صرف عظمت اور برتری حاصل کرنے کے لیے حکمتِ عملی سے کام لیا ہے۔ یہ حکمتِ عملی تمہاری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے تو کیا تم سیّد زادے کہلانے سے انکار کرو گے؟ دنیا والوں سے کیا کہو گے کہ تم کون ہو؟''

وقاص نے کہا۔''وکی! ڈیڈی کی اس نیک نیتی اور محبت کو سمجھو، جو ہماری بہتری کے لیے ہے۔ ہم اپنی پیدائش کے دن سے خاندانی سیّد کہلا رہے ہیں۔ ہماری آئندہ نسلیں بھی یہی کہلائیں گی۔ اس سلسلے کو جاری رہنے دو۔ ہمارے جذبات دادا جان کے لیے ہیں۔ ہم کل ہی ان سے جا کر ملیں گے کہ وہ ہماری خاطر اپنی ضد سے باز آ جائیں۔ ہمارے ڈیڈی کے ایک جھوٹ کو معاف کر دیں اور ہم سب کو گلے لگا لیں۔''

عینی نے کہا۔''بھائی جان! آپ بھی جذباتی باتیں کر رہے ہیں۔ میرے سوال کا جواب دیں، دادا جان اپنی ضد سے باز آ جائیں گے تو کیا ہم انہیں یہاں لا سکیں گے؟ جنہیں مرحوم کہہ چکے ہیں، انہیں پھر سے زندہ کر سکیں گے؟ لوگوں سے کیا کہیں گے کہ وہ کہاں سے زندہ ہو کر آ گئے ہیں؟''

سب ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ مرحوم کو زندہ نہیں کیا جا سکتا تھا لہٰذا ان کے ساتھ زندگی بھی نہیں گزاری جا سکتی تھی۔ جو خون کا رشتہ تھا اور ان تمام خونی رشتوں کی بنیاد تھا، اسے برسوں پہلے دور پھینک دیا گیا تھا۔ گھر کی صفائی کے بعد جو کچرا باہر پھینک دیا جاتا ہے، اسے پھر دوبارہ گھر میں نہیں لایا جاتا ہے۔

عینی نے کہا۔''کوئی بات بنائی جا سکتی ہے مثلاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ہمارے دور کے رشتے دار ہیں۔ اب ان کا کوئی قریبی عزیز نہیں رہا ہے اس لیے ہمارے پاس آ کر رہنے لگے ہیں۔ اس طرح ہم اپنے دادا کے ساتھ رہا کریں گے۔''

بتول بی، اپنی پوتی کو بڑی محبت سے دیکھنے لگیں۔ صرف پوتی نہیں دونوں پوتے بھی اپنے دادا جان کی قربت چاہتے تھے۔

فضل الرحمٰن نے کہا۔''یہ سب جذباتی باتیں ہیں۔ وہ یہاں رہیں گے تو تم سب انہیں دادا جان کہہ کر مخاطب کرو گے۔ اس کوٹھی کے اندر اور باہر چھ ملازم ہیں۔ وہ تمہارے رشتوں کو اور والہانہ محبتوں کو سمجھتے رہیں گے۔''

شگفتہ نے کہا۔''میرے میکے والے بھی آتے جاتے رہتے ہیں۔ جب میں اسکول لائف سے انہیں سڑک کے کنارے جوتے گانٹھتے دیکھتی آ رہی ہوں۔ میرے عزیزوں اور رشتے داروں میں سے بھی نہ جانے کتنے افراد انہیں ایک موچی کی حیثیت سے دیکھ چکے

ہوں۔''

وکی نے کہا۔ ''پلیز ممی! آپ موچی کا لفظ استعمال نہ کریں۔ مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ موچیوں کی کوئی یونین نہیں ہوتی ہے، کوئی متحدہ برادری نہیں ہوتی ہے۔ کوئی خاندانی موچی نہیں ہوتا۔ حالات سے مجبور ہو کر ہی یہ پیشہ اختیار کرتا ہے۔ اسے خاندانی مسئلہ نہیں بنانا چاہیے۔''

''یہ باتیں تم کتنے لوگوں کو سمجھا سکو گے؟ کتنے لوگوں کو موچی کہنے سے روک سکو گے؟ مارنے والے کا ہاتھ پکڑا جا سکتا ہے مگر بولنے والے کی زبان نہیں۔''

وقاص نے کہا۔ ''ہمارے رشتے اور ہماری محبت کا تقاضا ہے کہ وہ ہم سے قریب رہیں۔ اس کا ایک اور راستہ ہے۔ ہم دادا جان کے لیے دوسرے شہر میں ایک کوٹھی خریدیں گے، ان کی خدمت کے لیے ملازم رکھیں گے۔ کبھی دادی جان، کبھی ڈیڈی اور ممی اور کبھی ہم سب ان کے پاس جاتے رہیں گے۔ انہیں بھرپور کمپنی دیتے رہیں گے۔ اس طرح ہم بڑی محبت سے اپنے فرائض ادا کرتے رہیں گے۔''

وکی نے کہا۔ ''یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ آپ کو اور ڈیڈی کو کاروباری معاملات سے کبھی اتنی فرصت نہیں ملتی ہے کہ دو گھڑی ہمارے پاس بیٹھ کر باتیں کر سکیں، ہمارے پرابلمز معلوم کر سکیں، ہماری ضرورتیں ڈیڈی کی دولت سے پوری ہوتی ہیں لیکن اس دولت سے ہم ڈیڈی کی توجہ، محبت اور قربت حاصل نہیں کر پاتے۔ پھر آپ دونوں دوسرے شہر جا کر دادا جان کے ساتھ کچھ وقت کیسے گزاریں گے؟ کیا صرف میرے اور عینی کے وہاں جانے سے دادا جان کو تمام رشتوں کی محبتیں مل جائیں گی؟''

فضل الرحمٰن نے کہا۔ ''تمہاری دادی جان بھی وہاں جا کر رہا کریں گی۔''

''آپ کیوں نہیں جائیں گے؟ ممی کیوں نہیں جائیں گی؟ اور بھائی جان کی تو بات ہی سب سے الگ ہے۔ انہیں کاروبار سے ذرا سی بھی فرصت ملتی ہے تو یہ ٹی وی ڈراموں کی ریکارڈنگ میں بھابی جان کے ساتھ لگے رہتے ہیں۔''

''مجھے طعنے نہ دو، بات کو سمجھا کرو۔ میں اور ڈیڈی پورے کاروباری حلقے میں اچھی طرح جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ ہم کسی بھی شہر میں دادا جان سے ملنے جائیں گے تو وہاں ہمارے درجنوں شناسا ہیں۔ ہم ان سے چھپ کر داد جان سے نہیں مل پائیں گے۔''

وکی نے کہا۔ ''ہم نے اپنے بزرگ کو ایک گناہ گار ایک مجرم بنا دیا ہے۔ ان سے کبھی کھلے دل سے اور کھلی آزادی سے نہیں مل سکیں گے۔ میں، عینی اور دادی جان ان سے چھپ

کر ملنے جایا کریں گے، یہ اندیشہ رہے گا کہ کوئی دیکھ لے گا تو ہم بھی گناہ گار اور مجرم کہلائیں گے۔"

عینی نے کہا۔"مجھے تو یوں لگ رہا ہے جیسے دادا جان کے لیے نہ اس گھر میں کوئی جگہ ہے اور نہ کسی کے دل میں ان کے لیے کوئی جذبہ ہے۔ ان سے صرف زبانی محبتوں کا دعویٰ کیا جا رہا ہے۔ بے خوف ہو کر انہیں گلے لگانے کی بات نہیں کی جا رہی ہے۔"

وکی نے کہا۔"ڈیڈی! آپ صاف صاف بتا دیں، دادا جان کو اس گھر میں نہیں لایا جا سکتا، کسی دوسرے شہر میں بھی ان سے ملاقاتیں نہیں کی جا سکتیں اور اس شہر میں تو بے شمار جاننے والے ہیں، ہم ہمیشہ چھپ کر ان سے نہیں مل پائیں گے تو پھر دادا جان کا کیا بنے گا؟ کیا ہم انہیں ایک بے کار عضو کی طرح کاٹ کر پھینک دیں؟"

فضل الرحمٰن نے کہا۔"عزت، شہرت اور نیک نامی حاصل کرنے کے لیے بڑی بڑی قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ میں پچھلے اٹھائیس برسوں سے یہ قربانی دے رہا ہوں۔ جس باپ نے مجھے پیدا کیا ہے، اس کی محبت کو اور اس سے ملنے کی تڑپ کو دل میں دبائے رکھتا ہوں۔ میری طرح تمہیں بھی یہ قربانی دینی چاہئے۔ ہمارے تمہارے اطمینان کے لئے یہ کافی ہے کہ اماں ان سے ملتی رہتی ہیں اور ان کی خدمت کرتی رہتی ہیں اور دکھ بیماری میں انہیں کبھی تنہا نہیں چھوڑتیں۔"

"ڈیڈ! آپ بات گھما کر کہہ رہے ہیں۔ آپ نے کوئی قربانی نہیں دی ہے بلکہ چور دروازے سے نیک نامی حاصل کرنے کے لیے باپ کے رشتے کو جھٹلایا ہے۔"

عینی نے کہا۔"قربانی تو دادا جان دے رہے ہیں۔ ہماری عزت، شہرت اور نیک نامی کی خاطر برسوں سے تنہائی کا عذاب سہہ رہے ہیں۔ پلیز! کوئی ایسا راستہ نکالیں کہ دادا جان کو ہم سب کی قربتیں حاصل ہوتی رہیں۔"

وکی نے عینی سے کہا۔"تم فضول سی بات کر رہی ہو۔ ابھی سن رہی ہو، سمجھ رہی ہو کہ یہ دادا جان کو ہم سے دور ہی رکھنا چاہتے ہیں اور تم قربت حاصل کرنے کا راستہ نکالنے کو کہہ رہی ہو۔ راستہ ایک ہی ہے، ہم بھی دادی جان کی طرح چھپ کر ان سے ملتے رہیں گے، چاہے کچھ ہو جائے۔"

فضل الرحمٰن نے ڈانٹ کر کہا۔"تم نہیں جاؤ گے۔ عینی بھی نہیں جائے گی۔ کیا اتنی سی بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ملاقات کا سلسلہ جاری رہے گا تو کبھی نہ کبھی تم دوسروں کی نظروں میں آ جاؤ گے۔ میں تمہارا باپ ہوں، میری احتیاطی تدابیر پر عمل کرو۔ میں نے اٹھائیس

برسوں میں ان کی صورت بھی نہیں دیکھی۔ یہ وجہ ہے کہ ہماری عزت اور نیک نامی آج تک قائم ہے۔''

''ڈیڈ! میں آپ کی ایک تدبیر پر ضرور عمل کروں گا۔ آپ نے لہو کے رشتے کو توڑ دیا، باپ کو چھوڑ دیا۔ میں بھی باپ کو یعنی آپ کو چھوڑ دوں گا۔ ابھی اور اسی لمحے میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔''

وہ جانا چاہتا تھا، وقاص نے راستہ روک کر کہا۔ ''تم پاگل ہو گئے ہو۔ ڈیڈی نے ہماری عزت اور سرفرازی کے لیے مجبور ہو کر دادا جان کو چھوڑا تھا۔ تمہیں ڈیڈی کا احسان مند ہونا چاہئے اور تم ہو کہ انہیں چھوڑ کر جانا چاہتے ہو؟''

''بھائی جان! آپ مجھے محبت سے نہیں روک رہے ہیں۔ یہ اندیشہ ہے کہ میں یہاں سے نکل کر دادا جان کے پاس جاؤں گا اور آپ لوگوں کی بدنامی کا اشتہار بن جاؤں گا۔ دنیا پوچھے گی کہ ایک شہزادے کی طرح زندگی گزارنے والا اپنے باپ کو چھوڑ کر جوتے گانٹھنے والے کے ساتھ کیوں رہنے لگا ہے؟''

''ہاں، میں اسی لیے روک رہا ہوں۔ تم دادا جان کی محبت میں اندھے ہو کر ہم سب کے لیے پرابلم بننا چاہتے ہو۔''

شگفتہ نے اس کا ہاتھ تھام کر پوچھا۔ ''تم باپ کو چھوڑنا چاہتے ہو۔ کیا مجھے بھی چھوڑ دو گے؟ میں نے تمہیں پیدا کیا ہے۔ اپنا دودھ پلایا ہے۔''

وہ بولا۔ ''ممی! آپ کو ڈیڈی کی روایات کے مطابق عمل کرنا چاہئے۔ یہ باپ کو چھوڑ کر ماں کو یہاں لے آئے ہیں۔ آپ بھی یہی کریں۔ دادی جان کی طرح شوہر کو چھوڑ کر میرے ساتھ چلیں۔ یہ ہمارا خاندانی عمل ہے۔ اس پر عمل کریں۔''

وہ جھنجھلا کر بولی۔ ''بکواس مت کرو۔ میں ایسی بے وفا اور بے مروت نہیں ہوں کہ شوہر کو مسائل میں الجھا کر انہیں تنہا چھوڑ کر چلی جاؤں۔''

بتول بی نے تڑخ کر کہا۔ ''دلہن! منہ سنبھال کر بولو۔ مجھے بے وفا اور بے مروت کہہ رہی ہو۔ میں انہیں چھوڑ کر نہ آتی۔ بیٹے کے ساتھ جھوٹ نہ بولتی کہ ہم اونچے خاندان والے ہیں تو تم یہاں بہو بن کر نہ آتیں۔ کسی دوسرے خاندان میں جا کر بچے پیدا کرتی رہتیں۔ آج میرا پوتا کھری کھری باتیں کر رہا ہے تو سب کو مرچیں لگ رہی ہیں۔''

شگفتہ نے فضل الرحمٰن سے کہا۔ ''آپ اماں کی باتیں سن رہے ہیں؟ ذرا ان سے پوچھیں، کیا یہ چاہتی ہیں کہ میں ان کی طرح آپ کو چھوڑ کر بیٹے کے ساتھ چلی جاؤں؟ اور

کیوں جاؤں، میرا دماغ خراب ہوا ہے کہ نالائق بیٹے کے ساتھ ایک موچی کے گھر میں جا کر رہوں گی۔"

وکی نے گرج کر کہا۔ "ممی! یو پلیز شٹ اپ۔ میرے دادا جان کو موچی کہنے سے پہلے ڈیڈی کو موچی کی اولاد کہیں اور اگر ایسا کہتے وقت زبان جلتی ہے تو پھر یہ انگارے جیسا لفظ پھر کبھی زبان پر نہ لائیں۔"

عینی نے کہا۔ "زبان سے کہنا ضروری نہیں ہے۔ اس حقیقت کو دل ہی دل میں تسلیم کرتے رہنا چاہئے کہ یہ لفظ ہم سب کے لہو سے چپک گیا ہے اور نسل در نسل چپکا رہے گا۔ ہمیں یہ لفظ صرف اس لیے توہین آمیز لگ رہا ہے کہ ہم سب سیّد زادوں کی بلندی پر آ گئے ہیں۔ ورنہ یہ تو محض ایک پیشہ ہے۔"

فضل الرحمٰن نے عینی اور وکی کو دیکھا پھر کہا۔ "میں دیکھ رہا ہوں کہ تم دونوں اپنے باپ سے زیادہ بوڑھے اور سمجھ دار ہو گئے ہو۔ وکی کی طرح تم بھی سر چڑھ کر بول رہی ہو۔ تم دونوں کی احمقانہ بغاوت ہمارے لیے مسائل پیدا کرے گی۔ میری ایک بات مان لو۔ گھر چھوڑنے کی جلدی نہ کرو۔ ذرا صبر و تحمل سے یہاں رہو اور ٹھنڈے دماغ سے سوچو کہ برسوں کی کمائی ہوئی عزت اور سر بلندی کو کس طرح قائم رکھو گے۔ ہم اس مسئلے پر کل باتیں کریں گے۔ رات کے دو بج چکے ہیں۔ اپنے اپنے کمرے میں جا کر سو جاؤ۔"

یہ کہہ کر وہ جواب سنے بغیر پلٹ کر اپنے بیڈ روم کی طرف جانے لگا۔ یہ بہت اہم مسئلہ تھا۔ ایک ہی رات میں اسے حل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لہٰذا وہ سب خاموشی سے اپنے اپنے کمروں کی طرف چلے گئے۔

دوسری صبح بتول نے عینی اور وکی کو سمجھایا کہ وہ دادا جان سے ملنے کی جلدی نہ کریں۔ پہلے باپ اور بڑے بھائی کے ساتھ اس مسئلے کو حل کریں۔ انہوں نے ذرا صبر کیا لیکن فضل الرحمٰن اور وقاص کاروباری معاملات میں مصروف رہے۔ پھر پتا چلا کہ فضل الرحمٰن شام کی فلائٹ سے لاہور اور اسلام آباد گیا ہے۔ شاید دو دنوں کے بعد آئے گا۔ آرزو کی صبح کی شوٹنگ کینسل ہو گئی تھی۔ وقاص اس کے ساتھ رات کی شوٹنگ میں چلا گیا۔ ان میں سے کسی نے عینی اور وکی کے جذبات کا خیال نہیں کیا اور نہ ہی علم دین کے مسئلے کو اہمیت دی۔ وہ دونوں ہی باغیانہ انداز میں دادا جان کے دروازے پر پہنچ گئے۔

علم دین نے دروازہ کھولا۔ وکی کو دیکھ کر عینی کو پہچان گیا کہ وہی اس کی پوتی ہے۔ وہ مکان کے اندر آ کر اس کے سینے پر سر رکھ کر رونے لگی۔ علم دین محبتوں اور مسرتوں سے نہال

ہو گیا۔ اس نے پوچھا۔ ''صرف تم دونوں آئے ہو، میرا بڑا پوتا نہیں آیا؟''

انہوں نے اپنے موجودہ حالات بتائے پھر وکی نے کہا۔ ''ڈیڈی اور بھائی جان آپ کی قربت کے خیال سے بھی ڈرتے ہیں۔ وہ آپ سے دور بھاگتے رہیں گے۔ آپ وہاں ہمارے بزرگ کی حیثیت سے نہیں رہ پائیں گے اس لیے ہم دونوں آپ کے ساتھ رہا کریں گے۔ یوں سمجھیں، ہم نے وہ گھر چھوڑ دیا ہے۔''

وہ حیرانی سے بولا۔ ''تم...... تم دونوں میرے ساتھ رہو گے؟ اپنے ماں باپ کو چھوڑ دو گے؟''

عینی نے کہا۔ ''ڈیڈی نے بھی آپ کو چھوڑ دیا ہے۔ ہم بھی ان کے ساتھ یہی کریں گے۔''

''میرے بچو! میں یہ دیکھ کر خوشی سے مر رہا ہوں کہ میرا خون میری طرف کھنچا آ رہا ہے لیکن یہ مناسب نہیں لگ رہا ہے کہ میں اپنی خوشیوں کی خاطر تمہیں ماں باپ سے چھین لوں۔''

''آپ نہیں چھین رہے ہیں۔ ہم خود آئے ہیں اور ہم جیسا کہیں گے، آپ آئندہ ویسا ہی کریں گے۔ آپ ہماری ہر بات مانیں گے نا؟''

''تم دونوں کے لیے جان دے دوں گا۔ نہ ماننے والی بات بھی مان لوں گا۔''

''حیدر آباد میں ہماری ایک کوٹھی ہے۔ آپ ہمارے ساتھ وہاں چل کر رہیں گے۔ یہ جگہ چھوڑ دیں۔''

''وہ ...... میرے بچو!......'' وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ''میں پچھلے پچاس برسوں سے یہاں......''

عینی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''آگے نہ بولیں۔ ہم سب سن چکے ہیں۔ آپ آدھی صدی گزارنے کے بعد یہ جگہ چھوڑنا نہیں چاہتے۔ کیا یہ جگہ آپ کی پوتی سے بڑھ کر ہے؟''

''نہیں میری جان! تم سے بڑھ کر کوئی ہو نہیں سکتا۔ ٹھیک ہے، میں انکار نہیں کروں گا۔''

وہ دونوں خوش ہو کر دادا سے لپٹ گئے۔ منصوبے بنانے لگے۔ وکی نے کہا، وہ کل صبح حیدر آباد جائے گا۔ وہاں خالی کوٹھی کو رہائش کے قابل بنائے گا۔ پھر پرسوں علم دین اپنی پوتی کے ساتھ وہاں آ جائے گا۔ اس بوڑھے محبت کے مارے کو اچانک اتنی خوشیاں مل رہی تھیں کہ سنبھالی نہیں جا رہی تھیں۔ اسے دمے کا مرض تھا۔ وہ گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ عینی نے

پریشان ہو کر پوچھا۔ ”دادا جان! آپ بیمار ہیں؟“

”ہاں بیٹی! سانس کی تکلیف ہے۔“ وہ ایک ایک لفظ رک رک کر گہری سانسیں لے کر بول رہا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھنا چاہتا تھا، وکی نے کہا۔ ”آپ بیٹھے رہیں، بلکہ لیٹ جائیں۔“

اس نے ایک ہاتھ سے سامنے دوا کی طرف اشارہ کیا۔ عینی دوڑ کر دوا اور پانی لے آئی۔ اسے دوا کھلانے لگی۔ وکی سے بولی۔ ”ہم انہیں ابھی اسپتال لے جائیں گے۔“

علم دین نے ہاتھ کے اشارے سے ذرا انتظار کرنے کو کہا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی سانسیں بحال ہونے لگیں۔ وہ بولا۔ ”میرے بچو! یہ بڑھاپا ہے۔ میرے ساتھ بیماریاں لگی رہتی ہیں۔ تمہاری دادی جان تو میری بیماریوں کو جھیلنے کی عادی ہو گئی ہیں، تم بھی ہو جاؤ گے۔“

وہ دونوں اس رات اس مکان میں رہنا چاہتے تھے لیکن علم دین نے کہا۔ ”میں تمہاری تمام باتیں مان رہا ہوں، میری یہ ایک بات مان لو۔ اس بوسیدہ مکان میں اور اس پسماندہ علاقے میں نہ رہو۔ ہم پرسوں سے حیدر آباد میں ساتھ رہیں گے۔“

اس نے دونوں کو سمجھا بجھا کر واپس بھیج دیا۔ وہ تنہا بیماریوں سے لڑنے کا عادی تھا۔ تمام رات کبھی تکلیف میں جاگتا، کبھی سوتا رہا۔ پوتی اور پوتے کے آنے سے زندگی خوبصورت لگنے لگی تھی۔ اب وہ جینا چاہتا تھا۔ دوسری صبح علاج کے لیے ڈاکٹر کے پاس چلا گیا۔ واپس آیا تو بتول دروازے پر کھڑی ہوئی تھی۔ وہ بولا۔ ”آج ہفتہ نہیں ہے، بے وقت کیسے آ گئیں؟“

”عینی اور وکی نے بتایا کہ کل رات تم پر پھر دورہ پڑا تھا۔ یہ سن کر کیسے نہ آتی؟“

وہ دروازہ کھول کر اندر آئی۔ بتول نے کہا۔ ”وکی حیدر آباد گیا ہے۔ یہ پوتی اور پوتے تمہارے دیوانے ہو رہے ہیں۔“

”کیوں نہ ہوں گے۔ میرا لہو رنگ لا رہا ہے۔“

”ہاں، یہ خوشی کی بات ہے۔ ہماری اولاد ہماری طرف کھنچی آ رہی ہے۔ مگر میں تم سے کچھ کہنے آئی ہوں۔ انہیں سمجھاؤ۔ وہ گھر چھوڑنا مناسب نہیں ہے۔ وہاں ماں باپ کے سائے میں انہیں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنی ہے۔ جو عزت بنائی جا چکی ہے۔ اسی کے مطابق انہیں زندگی گزارنی چاہیے۔“

”تم مجھے یہ سمجھانے آئی ہو تو واپس چلی جاؤ۔ میرا بیٹا مجھے چھوڑ کر گیا تو میں نے اسے جانے سے نہیں روکا۔ اب میری پوتی اور پوتا یہاں آ رہے ہیں تو میں انہیں سینے سے لگا کر

رکھوں گا۔ایک مدت کے بعد مجھے اولاد کی خوشیاں مل رہی ہیں اور تم ان خوشیوں سے مجھے محروم کرنا چاہتی ہو؟''

''میں تمہاری خوشیاں چاہتی ہوں لیکن بچوں کو باپ کے پاس رہنا چاہئے۔''

''تمہارے بیٹے کو بھی میرے پاس رہنا چاہئے تھا۔اب بھی رہ سکتا ہے۔جاؤ اسے یہاں لے آؤ۔''

''تم خواہ مخواہ بحث کر رہے ہو۔اتنا شادو آباد رہنے والا گھر بری طرح تباہ ہو جائے گا۔''

''ایسا میں نہیں کر رہا ہوں۔ یہ قدرتی طور پر ہو رہا ہے۔تمہارے بیٹے نے سچ کو چھپانے کے سارے جتن کر لیے۔ ہمیشہ اس خوش فہمی میں رہا کہ جھوٹ کبھی ظاہر نہیں ہوگا لیکن قدرتی حالات کیسے پلٹا کھاتے ہیں، یہ اب اسے معلوم ہوگا۔''

''میرے بیٹے کی بنی بنائی عزت خاک میں مل گئی تو تمہیں خوشی ہوگی؟''

''خوشی نہیں ہوگی، دکھ بھی نہیں ہوگا۔ بندوں کو یہ سبق تو حاصل ہونا چاہئے کہ جھوٹ کو لاکھ پردوں میں چھپاؤ، وہ برس دو برس بلکہ پچاس برسوں کے بعد بھی ظاہر ہو جاتا ہے۔''

بتول مایوس ہو کر کوٹھی میں واپس آ گئی۔ وہاں وکی نے حیدر آباد سے عینی کو فون پر بتایا کہ کرائے داروں نے کوٹھی کے درو دیوار کو نقصان پہنچایا تھا۔ تین چار دنوں میں ان کی مرمت ہوگی۔ وہاں نئے فرنیچر لائے جائیں گے۔ پھر اپنے دادا جان کو وہاں لے جایا جائے گا۔

فضل الرحمٰن اسلام آباد سے واپس آیا۔ وقاص نے اسے بتایا کہ عینی اور وکی حیدر آباد میں دادا جان کے ساتھ رہنے کے انتظامات کر رہے ہیں۔اس نے کہا۔''اپنی دادی کو بلاؤ۔وہ عینی اور وکی کو ایسی حرکتوں سے باز رکھیں گی۔''

وقاص نے کہا۔''دادا جان کی طبیعت بہت خراب ہے۔ دادی جان ان کی تیمارداری کے لیے گئی ہیں۔''

فضل الرحمٰن نے جھنجلا کر کہا۔''ابا مر کیوں نہیں جاتے۔ اتنے برسوں کے بعد بھی مصیبت بنے ہوئے ہیں۔''

وقاص نے سوچتے ہوئے کہا۔''ڈیڈ! وہ ستر یا اسّی برس کے ضرور ہوں گے۔''

''ہاں اسّی کی دہائی میں ہیں۔ بڑی لمبی عمر جی رہے ہیں اور میری نیندیں اُڑا رہے ہیں۔''

''دادی جان کہہ رہی تھیں، ان کے منہ میں دانت نہیں ہیں۔ کمر جھک گئی۔ گھر کا کوئی کام کرتے وقت ہاتھ کانپتے ہیں۔''

''پھر بھی زندہ ہیں۔ یہ وکی کہاں ہے، اسے بلاؤ۔''

اسی وقت وکی نے آ کر کہا۔ ''میں دروازے پر تھا۔ آپ کی بددعائیں سن رہا تھا۔ میں حیران ہوں، کیا بیٹے ایسے ہوتے ہیں، باپ کے مرنے کی دعا میں مانگتے رہتے ہیں۔''

''شٹ اَپ۔ زیادہ نہ بولو۔ تم کس کی اجازت سے انہیں حیدر آباد والی کوٹھی میں لے جا رہے ہو؟ وہ کوٹھی میری ہے۔''

''ساری دولت اور جائیداد آپ کی ہے۔ آپ اجازت نہیں دیں گے تو میں اسی شہر میں ان کے ساتھ وہاں موچی گلی میں رہوں گا اور کسی سے چھپ کر نہیں، اعلانیہ ان کے ساتھ زندگی گزاروں گا۔''

وہ جھنجھلا کر بولا۔ ''تم کیوں مجھ سے دشمنی کر رہے ہو؟''

''آپ کیوں دادا جان سے دشمنی کر رہے ہیں۔ آپ سمجھتے تھے۔ باپ سے نافرمانی کریں گے، ان کے جیتے جی نہیں مردہ کہیں گے۔ ان کی لاش پر کھڑے ہو کر سوسائٹی میں اونچے ہو جائیں گے۔ کیا آپ جیسا سوچیں گے، ویسا ہی اس دنیا میں ہوتا رہے گا؟ کیا جھوٹ اور فریب کی سزا اسی دنیا میں نہیں ملتی ہے؟''

فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ ٹیلی فون وکی کے قریب تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھایا، پھر ہیلو کہا۔ دوسری طرف سے بتول کے رونے اور سسکیاں لینے کی آوازیں سنائی دیں۔ انہوں نے پوچھا۔ ''تمہارے ڈیڈی کہاں ہیں؟ انہیں فون پر بلاؤ۔''

وہ پریشان ہو کر بولا۔ ''دادی جان! آپ کیوں رو رہی ہیں؟ خیریت تو ہے؟''

وہ بولیں۔ ''ہائے بیٹا! اس بڑھاپے میں سہاگ اجڑ گیا ہے۔ تمہارے دادا جان اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں۔''

وکی کے حلق سے ایک چیخ نکلی۔ ''نہیں۔ نہیں دادی جان! آپ جھوٹ بول رہی ہیں۔ میرے دادا جان زندہ ہیں۔ میرے دادا جان کو کچھ نہیں ہوگا۔ وہ زندہ ہیں، میں ابھی آ رہا ہوں۔''

فضل الرحمٰن اور وقاص یہ باتیں سن کر ایک دوسرے کو یوں دیکھ رہے تھے، جیسے پہاڑ سر سے اُتر گیا ہو۔ پھر فضل الرحمٰن نے فون کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ''لاؤ، ریسیور مجھے دو۔ یہ اماں کیا کہہ رہی ہیں۔''

وہ ریسیور کو کریڈل پر پٹخ کر بولا۔ ''دادا جان نہیں رہے۔ وہ ہمیں چھوڑ کر جا سکتے ہیں۔ آپ کی زبان کالی ہے ڈیڈ! آپ نے بددعا کی، وہ قبول ہو گئی۔ اب آپ جشن منائیں۔''

''فضول باتیں نہ کرو۔ غصے میں اچھی بری باتیں زبان سے نکل ہی جاتی ہیں۔ اس کا

مطلب یہ نہیں ہے کہ میں ان کی موت چاہتا تھا۔''

وقاص نے اس کے پاس آ کر اس کے شانے پر محبت سے ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''دادا جان کی موت تمہیں صدمہ پہنچا رہی ہے۔ ہمیں بھی صدمہ پہنچ رہا ہے۔ پلیز ڈیڈی کو غلط نہ سمجھو۔''

فضل الرحمٰن نے اس کے دوسرے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''ایک دن سب کو مرنا ہے۔ آج ابا گئے ہیں کل میں جاؤں گا۔ پھر میں ابا کی موت کیوں چاہوں گا۔ میں نے جو کچھ کہا وہ دل سے نہیں کہا۔ مجھے غلط نہ سمجھو۔''

وکی نے سر جھکا کر کہا۔ ''سوری، میں نے جو کہا اسے بھول جائیں۔ ہمیں فوراً وہاں جانا چاہیے۔ ان کی تدفین کے انتظامات کرنے ہیں۔ دادی جان وہاں تنہا ہیں۔ رو رو کر ہلکان ہو رہی ہوں گی۔''

فضل الرحمٰن اور وقاص نے ہچکچاتے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھا، وکی نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟''

اس نے کہا۔ ''بیٹے! میری بات کا برا نہ ماننا بلکہ میری بات کو سمجھنا۔ تمہارے دادا سے میری کوئی عداوت نہیں ہے۔ میں تم سب کی بہتری کے لیے ہی کہہ رہا ہوں۔ ہمیں وہاں نہیں جانا چاہیے۔ تمہیں بھی نہیں جانا چاہیے۔ میں ابھی فون کرتا ہوں۔ ان کی تدفین کے تمام انتظامات ہو جائیں گے۔''

وہ اپنے شانے سے باپ کے ہاتھ کو جھٹکتے ہوئے بولا۔ ''آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ کیا آپ وہاں نہیں جائیں گے؟ آخری بار دادا جان کا منہ نہیں دیکھیں گے؟ ان کے جنازے کو کاندھا نہیں دیں گے؟ ان کی قبر پر مٹی نہیں ڈالیں گے؟ پھول نہیں چڑھائیں گے؟ فاتحہ نہیں پڑھیں گے؟ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ کیا آپ ایک بیٹے کی زبان سے باپ کے لیے ایسا کہہ رہے ہیں؟''

وہ چیختا ہوا اِدھر سے اُدھر جا رہا تھا اور غصے سے بولتا جا رہا تھا۔ وہ دونوں پریشان ہو کر اسے دیکھ رہے تھے، اسے چپ رہنے کو کہہ رہے تھے۔ وہ دونوں مٹھیاں بھینچ کر بولا۔ ''وہاں ہمیں فوراً جانا ہے۔ آپ میرے ساتھ چل رہے ہیں یا نہیں؟''

باپ نے کہا۔ ''تم خواہ مخواہ جذباتی ہو کر حلق پھاڑ رہے ہو۔ تم پاگل ہو گئے ہو۔ سمجھ داری کی باتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گی۔ جاؤ یہاں سے دفع ہو جاؤ۔''

وہ غصے سے پاؤں پٹختا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ وقاص نے کہا۔ ''ڈیڈ! یہ وکی تو پرابلم بن گیا ہے۔ یہ ان کی تدفین کے لیے جا رہا ہے۔ اس محلے سے قبرستان تک دنیا والوں کی نظروں میں آئے گا۔ کتنے ہی لوگوں کو معلوم ہوگا کہ یہ دادا جان کا پوتا اور آپ کا بیٹا ہے۔''

''تمہارے دادا جان کا جنازہ اٹھانے والے پسماندہ علاقے کے لوگ ہوں گے۔ ہماری سوسائٹی کا جان پہچان والا کوئی نہیں ہوگا۔بس آج کا دن گزر جانے دو۔آج کے بعد نہ تمہارے دادا جان رہیں گے اور نہ اُدھر کوئی جائے گا۔''

وقاص نے ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔''میں نے دادا جان کو نہیں دیکھا۔وہ جو بھی تھے، جیسے بھی تھے۔آپ کے والد اور میرے دادا تھے۔ان کی موت کا افسوس ہو رہا ہے۔''

فضل الرحمٰن نے بیٹھتے ہوئے کہا۔''وہ بہت ضدی تھے۔ان کا کیا بگڑ جاتا اگر وہ میری بات مان لیتے اور سید زادے کہلانے لگتے۔یہاں ہمارے ساتھ عزت اور شان وشوکت سے زندگی گزارتے۔آج ان کا جنازہ اٹھانے کے لیے شہر کے بڑے بڑے رئیس یہاں آتے۔ پریس رپورٹرز، فوٹوگرافران کی تصویریں اتارتے مگر افسوس......وہ مٹی کے کیڑے بن کر رہ گئے اور آج مٹی میں ہی جا رہے ہیں۔''

وہ دونوں سر جھکائے باپ اور دادا کے بارے میں بولتے رہے اور اطمینان حاصل کرتے رہے کہ آئندہ عینی اور وکی تو کیا، بتول بی نہ اُدھر جائیں گے اور نہ کبھی اندیشے جنم لیں گے۔ان کی زندگی سے بدنامی کا وہ باب ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکا تھا۔

فون کی گھنٹی بجنے لگی۔فضل الرحمٰن نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا پھر پوچھا۔''ہیلو، کون......؟''

بتول بی کی آواز سنائی دی۔''فضل! یہ میں کیا سن رہی ہوں؟ وکی کہہ رہا ہے، تم باپ کے جنازے کو کاندھا دینے نہیں آ رہے ہو؟''

''اماں! آہستہ بولیں، آپ یقیناً پی سی او سے بول رہی ہیں۔آس پاس کے لوگ سن رہے ہوں گے۔''

وہ غصے سے بولیں۔''سنتے ہیں تو سننے دو۔تم یہاں آ رہے ہو یا نہیں؟''

''اماں! آپ ابا کی زندگی میں میرا ساتھ دیتی رہیں۔آپ نے میری عزت اور بلند مرتبے کا خیال رکھا ہے، خدا کے لیے آج بھی خیال رکھ لیں۔میرے وہاں آنے سے بدنامی بھی ساتھ چلی آئے گی۔''

''میں کچھ سننا نہیں چاہتی۔وہ تمہارے باپ تھے۔وہ نہ ہوتے تو آج تمہارا وجود بھی اس دنیا میں نہ ہوتا۔تم کیسے بیٹے ہو، کیا آخری بار بھی باپ کا منہ دیکھنے کے لیے دل نہیں تڑپ رہا ہے؟''

''میں بہت تڑپ رہا ہوں مگر عقل سے کام لے رہا ہوں۔آپ میری بات مانیں۔

جب گھر سے میت اٹھ جائے تو آپ مکان کو مقفل کر کے یہاں آ جائیں۔''

''میں نہیں آؤں گی۔ اگر تم یہاں نہ آئے تو تم پر لعنت بھیج دوں گی۔ تم آج باپ کا منہ نہیں دیکھو گے تو میں مرتے دم تک تمہارا منہ نہیں دیکھوں گی۔ آ جاؤ، میں سمجھا رہی ہوں، خون سفید نہ کرو۔ دودھ کا پانی نہ کرو، آ جاؤ۔''

''آپ فون پر بحث نہ کریں۔ یہاں آ کر مجھ سے باتیں کریں۔ میں آپ کو منا لوں گا۔''

''میں اپنے خاوند کی آخری سانس تک تمہاری بات مانتی آئی ہوں۔ آج میری مانو۔ اگر ایک گھنٹے تک نہیں آؤ گے اور میت یہاں سے اٹھ جائے گی تو ماں اور بیٹے کے رشتے کا بھی جنازہ اٹھ جائے گا۔ بس ایک بار...... آ جاؤ۔''

بتول بی نے فون بند کر دیا۔ وہ ریسیور رکھ کر بیٹے سے بولا۔ ''کیا مصیبت ہے۔ اب اماں پرابلم بن رہی ہیں۔''

شگفتہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا ہو گیا؟ اماں کیوں پرابلم بن رہی ہیں؟''

وقاص نے ماں کو بتایا کہ دادا جان کا انتقال ہو چکا ہے۔ اب ان کی تدفین کے سلسلے میں مسائل پیدا کیے جا رہے ہیں۔ شگفتہ نے ان باپ بیٹے کو دیکھا۔ اپنے باپ دادا کی موت پر وہ آنسو نہیں بہا رہے تھے۔ ان کی خشک آنکھوں میں بے مروتی تھی۔ وہ بولی۔ ''یہ بڑے میاں تو مرنے کے بعد بھی مسائل پیدا کر رہے ہیں اور یہ اماں کو کیا ہوا ہے؟ چپ چاپ کفن دفن کر کے نہیں آ سکتیں؟''

''تمہارا چھوٹا بیٹا بھی ہمیں غصہ دکھا کر گیا ہے۔ عینی بھی وہیں ہو گی۔ یہ تو جیسے محاذ آرائی ہو رہی ہے۔ یہاں ہم تینوں ہیں۔ وہاں بھی تین ہیں۔ اماں، عینی اور وکی۔ اگر وہ تینوں واپس نہ آئے تو یہ محاذ آرائی ہمیں مہنگی پڑے گی۔''

انہیں یہ اندیشہ تھا کہ وہ تینوں علم دین کے مکان اور محلے میں رہیں گے تو ان کے متعلق طرح طرح کی باتیں ہوں گی کہ وہ ایک مہنگے علاقے سے مہنگی کوٹھی اور کاریں چھوڑ کر آئے ہیں۔ عینی اور وکی کے بارے میں معلوم ہو گا کہ وہ ایک دولت مند اور عزت دار باپ کو چھوڑ کر ایک موچی دادا کے مکان میں رہنے لگے ہیں۔ اس طرح رشتے اور پیشے ظاہر ہوتے رہیں گے۔

دوسرے دن یہ اندیشے ختم ہو گئے۔ شہر میں ان کی ایک اور کوٹھی تھی۔ وہ تینوں وہاں مستقل رہائش کے لیے چلے گئے۔ فضل الرحمٰن نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ علم دین کے محلے اور اس کے شناساؤں سے دور ہو گئے تھے۔ اس نے شگفتہ اور وقاص سے کہا۔ ''وہ تینوں

ہم سے ناراض ہیں لیکن انہوں نے چھوٹے لوگوں کے علاقے سے دور جا کر ہماری فکر اور پریشانیاں ختم کردی ہیں۔ جب ان کی ناراضی کم ہوگی تو وہ پھر ہم سے آملیں گے۔''

بتول، عینی اور وکی کو روزانہ اخراجات کی فکر نہیں تھی۔ ان تینوں کے بینک اکاؤنٹ میں لاکھوں روپے تھے۔ پھر وقاص نے فون کے ذریعے وکی سے کہہ دیا تھا کہ وہ اور عینی کاروبار میں اپنے شیئرز کے مطابق ہر ماہ اچھی خاصی رقم ہیڈ آفس سے لے سکتے ہیں۔ اس نے بتول سے فون پر پوچھا۔'' دادی جان! آپ کب تک ناراض رہیں گی؟''

انہوں نے جواب دیا۔'' یہ ناراضی مرتے دم تک رہے گی۔ تم باپ بیٹے کا خون اتنا سفید ہوگیا کہ میرے خاوند کو آخری بار دیکھنے اور اس کے جنازے کو کاندھا دینے نہیں آئے۔ تم دونوں باپ بیٹے میرے لیے مرچکے ہو۔''

چھ ماہ بعد فضل الرحمٰن بیمار ہوگیا۔ وہ ایک عرصے سے شوگر کا مریض تھا۔ بے احتیاطی اور بدپرہیزی کے باعث یہ مرض تشویش ناک ہوگیا۔ ڈاکٹر شوگر کو کنٹرول کرنے اور کم کرنے کی کوشش کرتے رہے لیکن مرض بڑھتا گیا، جوں جوں دوا کی۔ اس نے خواب میں اپنے باپ علم دین کو دیکھا۔ وہ سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔'' آؤ بیٹے! تم چاہے جتنی بھی اونچی مسند پر بیٹھ جاؤ۔ وہاں سے قبر کی پستی میں تو گرنا ہی پڑتا ہے، آجاؤ......''

اس کی آنکھ کھلی تو اس نے پریشان ہو کر وقاص سے کہا۔'' اماں کو بلاؤ۔ میرا دل گھبرا رہا ہے۔''

وقاص نے کہا۔'' آپ ایک ہفتہ تک اسپتال میں رہ کر آئے ہیں۔ وہاں نہ دادی جان آئیں اور نہ ہی آپ کی اولاد نے آکر آپ کی خیریت پوچھی۔ ان میں سے کوئی یہاں نہیں آئے گا۔''

'' بیٹے! یوں لگتا ہے جیسے میرا آخری وقت آ گیا ہے۔ ان سے کہو، فون پر ہی مجھ سے دو باتیں کرلیں۔''

فون پر رابطہ ہوا تو وہ رونے لگیں۔ اس نے کہا۔'' اماں! پچھلی باتیں بھول جاؤ۔ مجھے معاف کردو۔''

'' بیٹے! میں معاف نہ کروں، تب بھی تم اعلیٰ خاندان کے چشم و چراغ کہلاؤ گے۔ جب تمہاری زندگی میں باپ کی اہمیت نہ رہی تو ماں کے معاف نہ کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔''

'' اماں! میں نے ابا کو خواب میں دیکھا ہے۔ وہ مجھے اپنے پاس بلا رہے تھے۔''

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں، کہنے لگیں۔'' تم بہت بیمار ہو، مجھے تمہارے پاس رہنا

چاہیئے۔ مگر تمہاری خودغرضی اور بے مروتی نے میرا دل توڑ دیا ہے۔ میرے دور ہونے سے تمہارا کچھ نہیں بگڑ رہا ہے۔ میرا بگڑ رہا ہے۔ میں اندر ہی اندر مرتی رہتی ہوں۔ میری ممتا تمہارے لیے تڑپتی رہتی ہے۔ میں خود ہی تم سے دور رہ کر سزا پا رہی ہوں۔ تمہارا دم نکل جائے گا، تب بھی آخری بار تمہاری صورت دیکھنے نہیں آؤں گی۔''

انہوں نے روتے روتے فون بند کر دیا۔ ایک گھنٹے بعد وکی باپ سے ملنے آیا۔ شگفتہ اور وقاص نے خوش ہو کر اسے خوش آمدید کہا۔ باپ بستر پر پڑا ہوا تھا۔ اس نے باپ سے کہا۔ ''میں خیریت پوچھنے اور ہمدردی کرنے نہیں آیا ہوں۔ آپ اپنے بیمار باپ کی تیمارداری کے لیے نہیں گئے۔ میں بھی آپ جیسے بیمار باپ کو پہچاننے سے انکار کر رہا ہوں۔''

شگفتہ نے کہا۔ ''بیٹے! ایسے وقت باپ سے ایسی باتیں نہ کرو۔''

''میں باپ سے بات کرنے نہیں آیا ہوں۔ بھائی سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔''

اس نے وقاص سے کہا۔ ''بھائی جان! دادا جان کے آخری وقت بیٹا ان کے پاس نہیں تھا۔ آپ کو بھی اپنے باپ کے پاس نہیں رہنا چاہیئے۔''

وقاص نے کہا۔ ''کیا یہی بکواس کرنے آئے ہو۔ تم نے ڈیڈی کا ساتھ چھوڑ دیا تو کیا میں بھی چھوڑ دوں گا؟''

''میں یہ سمجھانے آیا ہوں کہ ڈیڈی نے ایک اعلیٰ خاندان کا شیش محل بنا رکھا ہے۔ میں باہر سے ایک پتھر ماروں گا تو یہ شیشے کا گھر چکنا چُور ہو جائے گا۔ ابھی میں آپ کو سہولت سے کہہ رہا ہوں۔ جب تک ڈیڈی بیمار ہیں، آپ اس گھر میں نہیں رہیں گے اور نہ ہی ان کی صورت دیکھنے آئیں گے۔''

''کیا تم کوئی بدمعاشی دکھانے آئے ہو؟ کیا تم چاہتے ہو، میں تمہیں جوتے مار کر یہاں سے نکالوں؟''

''میں یہاں سے جوتے کھا کر ایک پریس کانفرنس بلاؤں گا۔ دادی جان، عینی اور میرے علاوہ موچی گلی کے وہ تمام افراد اس پریس کانفرنس میں موجود ہوں گے۔ جو ایک طویل عرصے سے دادی جان اور دادا جان کو میاں بیوی کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ ان سب کا بیان ہو گا کہ سیّد فضل الرحمٰن کہلانے والے کا اصل نام فضل دین ہے اور یہ فضل دین ایک موچی علم دین کا بیٹا ہے۔''

شگفتہ اور وقاص نے پریشان ہو کر فضل الرحمٰن کو دیکھا۔ وہ پہلے ہی بیمار تھا۔ بیٹے کی باتیں سن کر برسوں کا بیمار لگنے لگا۔ اس نے نقاہت سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''وکی!

میرے بیٹے! میری دکھ بیماری کا خیال کرو، ایسی باتیں نہ کرو۔"

"دادا جان کی موت کے بعد آپ کو یہ مکمل اطمینان حاصل ہو گیا تھا کہ اب آپ کا جھوٹ اور فریب کبھی نہیں کھلے گا۔ آپ...... اپنے باپ کو ایک کچرے کی طرح دور پھینک کر آخری وقت بھی ان کے پاس نہیں گئے اور جب وہ مر گئے تو اس پیدا کرنے والے کے جنازے کو کاندھا بھی نہیں دیا۔ آپ کو یقین تھا کہ ایسے تہذیبی اور اخلاقی جرم کی سزا آپ کو کبھی نہیں ملے گی۔ آج آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ بہت سی بداعمالیوں کی سزا اسی دنیا میں مل جاتی ہے۔"

وقاص نے کہا۔ "وکی! جو ہو گیا ہے، اس پر مٹی ڈالو۔ تم دیکھ رہے ہو کہ ڈیڈی کو کتنی تکلیف پہنچ رہی ہے۔ یہ اچھی طرح سمجھ لو کہ تمہاری پریس کانفرنس کو جھٹلانے کے لیے میں دوسری پریس کانفرنس بلا سکتا ہوں۔ تمہارے جواب میں تردیدی بیانات شائع کر سکتا ہوں۔ بہتر ہے ایسی کوئی حرکت نہ کرو۔"

"یہ تو میں کروں گا، میرے اور عینی کے پاس برتھ سرٹیفکیٹ کے علاوہ اسکول اور کالج کے سرٹیفکیٹس ہیں۔ ان میں ہماری ولدیت سیّد فضل الرحمٰن لکھوائی گئی ہے۔ دادی جان گواہی دیں گی کہ ہمارے باپ کا نام فضل دین ہے۔ موچی گلی کے کتنے ہی بوڑھے اور جوان ہماری حمایت میں گواہی دیں گے۔"

فضل الرحمٰن گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ بستر پر تڑپنے لگا۔ شگفتہ اور وقاص لپک کر اس کے پاس گئے۔ اسے سنبھالنے لگے۔ اسے تسلیاں دینے لگے کہ وکی اخبارات کے ذریعے انہیں بلندی سے پستی میں نہیں گرائے گا۔ شگفتہ نے پلٹ کر وکی کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "میں ماں ہو کر تم سے التجا کر رہی ہوں۔ تم کہو تو میں تمہارے قدموں میں گر پڑوں گی۔ ابھی اپنے باپ سے کہہ دو کہ تم ہماری عزت کو خاک میں نہیں ملاؤ گے۔"

"میں ایک ہی شرط پر ان کی عزت کو بحال رکھوں گا۔"

ان تینوں نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ بولا۔ "بھائی جان، ابھی اس گھر سے چلے جائیں۔ انہوں نے بھابی کے لیے نئی کوٹھی خریدی ہے، وہاں جا کر رہ سکتے ہیں۔ جب ڈیڈی صحت یاب ہو جائیں تو یہ یہاں آ سکتے ہیں۔ اس خاندان کے کسی بیٹے کو اپنے بیمار باپ کے پاس نہیں رہنا چاہئے۔"

وقاص نے کہا۔ "تم خواہ مخواہ اپنی ضد منوانا چاہتے ہو؟"

"آپ ایک گھنٹے کے اندر یہاں سے نہیں جائیں گے تو کل کے اخبارات آپ کے ہوش اُڑا دیں گے۔"

فضل الرحمٰن نے شکست خوردہ ہو کر وقاص سے کہا۔" بیٹے! اس سر پھرے کی بات مان لو۔ میری تیمارداری کے لیے تمہاری ممی یہاں رہیں گی، تم فکر نہ کرو۔"

وکی نے کہا۔" آگے چل کر فکر کے لمحات آئیں گے۔ اگر آپ اسی بیماری میں چل بسے تو بھائی جان آخری بار آپ کی صورت دیکھنے نہیں آئیں گے۔ نہ ہی جنازے کو کاندھا دیں گے اور نہ ہی قبرستان جا کر آپ کی قبر پر فاتحہ پڑھیں گے۔"

شگفتہ نے چیخ کر کہا۔" تم بکواس کر رہے ہو۔ پاگل ہو گئے ہو۔ میں مرتے وقت تمہیں دودھ نہیں بخشوں گی۔ چلے جاؤ یہاں سے۔ دور ہو جاؤ میری نظروں سے۔"

" ابھی میری بات پوری نہیں ہوئی۔ آپ ڈیڈی کی موت کی اطلاع اپنے میکے والوں کو بھی نہیں دیں گی۔ کوئی رشتے داران کے جنازے کو کاندھا نہیں دے گا۔"

" کیوں پاگلوں جیسی باتیں کر رہے ہو۔ ہمارے تمام رشتے دار پوچھیں گے کہ ہم نے انہیں اطلاع کیوں نہیں دی؟"

" آپ کہہ سکتی ہیں کہ یہ ڈیڈی کی آخری خواہش تھی کہ انہیں قبر میں پہنچانے تک کسی رشتے دار کو اطلاع نہ دی جائے۔"

" یہ ابھی زندہ ہیں اور تم ایسی باتیں کرنے پر مجبور کر رہے ہو، جیسے یہ مر چکے ہوں۔ تم اتنے سنگدل کیوں ہو گئے ہو۔"

" میں نے دادا جان کو ایک لاوارث کی طرح قبر میں جاتے دیکھا ہے۔ یہ سیّد زادے بھی اسی طرح جائیں گے۔"

وہ پلٹ کر دروازے تک گیا پھر بولا۔" بھائی جان! میں کوٹھی کے باہر دیکھتا رہوں گا۔ اگر آپ ایک گھنٹے کے اندر یہاں سے نہ گئے تو میرا ردعمل آپ کے سامنے آئے گا۔"

وہ دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔ شگفتہ نے کہا۔" یہ لڑکا تو مصیبت بن گیا ہے۔ کیا اسے کسی طرح قابو میں نہیں کیا جا سکتا؟"

فضل الرحمٰن نے کہا۔" تم فکر نہ کرو۔ میں جلد ہی ٹھیک ہو جاؤں گا۔ پھر سے چلنے پھرنے لگوں گا۔ اماں کو سمجھاؤں گا تو وہ اسے سمجھائیں گی۔ اسے انتقامی کارروائیوں سے باز رکھیں گی۔"

وہ اعتماد کے مطابق دو دنوں کے بعد ہی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ گھر کے اندر چلنے پھرنے لگا۔ بتول بی سے کئی بار ملنا چاہا۔ انہوں نے آنے سے انکار کر دیا۔ فون پر زیادہ باتیں نہیں کیں۔ یہ صاف کہہ دیا۔" تم بھی لاوارثوں کی طرح اپنی قبر میں پہنچو گے۔ اگر وقاص آخری وقت

تمہارا ساتھ دینا چاہے گا تو میں اخبارات میں تمہارے خلاف بیانات شائع کراؤں گی۔''

فضل الرحمٰن کسی حد تک صحت یاب ہوا تھا لیکن بیماریاں ڈرانے لگی تھیں کہ کسی دن بھی بسترِ علالت بسترِ مرگ بن سکتا ہے۔ آج نہیں تو کل، ایک برس نہ سہی، دس بیس برس بعد مرنا تو ہے۔ اس وقت تک بتول بی دنیا میں رہیں، نہ رہیں۔ عینی اور وکی انتقامی کارروائیوں کے لیے زندہ رہیں گے۔ اسے کسی دن بھی ایک لاوارث کی طرح اپنی قبر میں جانا ہوگا۔

وہ جلد ہی مر جاتا تو اچھا ہوتا۔ زندہ رہ کر اس خیال سے لحہ لحہ مرنے لگا کہ اس سیّد زادے کا آخری وقت بہت ہی عبرت ناک ہوگا۔ بیوی کے سوا کوئی اس کے پاس نہیں ہوگا۔ علم دین کے جنازے کو تو محلے والوں نے کاندھا دیا تھا۔ اس کے جنازے کو قبرستان پہنچانے کے لیے ایدھی ٹرسٹ والوں سے رابطہ کرنا ہوگا۔ یہ باتیں اس کے دماغ میں پھوڑے کی طرح پک رہی تھیں۔ اس نے باپ کے ساتھ جو سلوک کیا تھا، اس کی سزا جیتے جی مل رہی تھی۔

کوئی نہیں جانتا، پہلے کس کو مرنا ہے۔ بتول بی، عینی اور وکی کو پہلے موت آ سکتی تھی۔ پھر کوئی انتقامی کارروائی کرنے والا نہ ہوتا۔ اسے تمام اندیشوں سے اور ذہنی کرب سے نجات مل جاتی۔

ایسے خوش کرنے والے خیالات سے بڑا اطمینان حاصل ہوتا تھا۔ وہ اسی طرح اطمینان حاصل کرتے کرتے ایک دن مر گیا۔ آخری وقت کوئی بیٹا قریب نہیں تھا۔ کسی نے اس کے جنازے کو کاندھا نہیں دیا۔ ایدھی ٹرسٹ سے ایک میت گاڑی آ کر اسے لے گئی۔ اس کی قبر کہاں بنائی گئی، یہ بھی کسی سگے نے معلوم نہیں کیا۔

ہوئے مر کے ہم جو رسوا، ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا

سب ہی اونچی اُڑان چاہتے ہیں۔ اُڑنا آتا ہو تو یہ اچھی بات ہے۔ نہ آتا ہو تو پھر کوا ہنس کی چال چلتا ہے۔ اعلیٰ خاندان سے ہونا اور بات ہے۔ اعلیٰ ظرف ہونا اور بات ہے۔ فضل الرحمٰن کی کم ظرفی نے اسے ڈبو دیا۔

☆======☆======☆